ادب اور ٹراما: مابعد نائن الیون اردو ناول کا تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے پی ایچ-ڈی (اردو)

مقالہ نگار:

سید محسن علی بخاری

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

فروری 2022

ادب اور ٹراما: مابعد نائن الیون اردو ناول کا تجزیاتی مطالعہ

مقالہ نگار

سید محسن علی بخاری

یہ مقالہ

پی ایچ-ڈی (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لنگویجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لنگویجز اسلام آباد

فروری 2022

مقالے کا دفاع اور منظوری فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مذکورہ مقالہ پڑھنے کے بعد مقالے کے دفاع کو جانچا ہے۔ زیرِ دستخطی مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: ادب اور ٹراما: مابعد نائن الیون اردو ناول کا تجزیاتی مطالعہ

پیش کار: سید محسن علی بخاری

رجسٹریشن نمبر: NUML-F19-30258

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ زبان و ادب اردو

ڈاکٹر رخشندہ مراد (اسسٹنٹ پروفیسر) _____
نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی _____
ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

میجر جنرل (ر) شاہد محمود کیانی (ہلالِ امتیاز ملٹری) _____
ریکٹر

تاریخ _____

اقرار نامہ

میں سید محسن علی بخاری حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے پی ایچ ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر رخشندہ مراد کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونی ورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

_____

سید محسن علی بخاری

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لنگویجز اسلام آباد

فروری 2022

فہرست ابواب

عنوان		صفحہ نمبر
مقالہ اور دفاع کی منظوری کا فارم		i
اقرار نامہ		ii
فہرست ابواب		iii
پیش لفظ		iv
Abstract		v
اظہارِ تشکر		vi
باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث		
الف	بنیادی مباحث	1
i.	موضوع کا تعارف	1
ii.	بیانِ مسلہ	2
iii.	مقاصدِ تحقیق	3
iv.	تحقیقی سوالات	3
v.	نظری دائرہ کار	4
vi.	تحقیقی طریقہ کار	6
vii.	مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	7
viii.	تحدید	8
ix.	پس منظری مطالعہ	9
x.	تحقیق کی اہمیت	10
ب۔ تمہید:		12

ج۔ٹراما کیا ہے؟ معنی اور مفہوم: 16

د۔ٹرومے کی نوعیت، کیفیت اور اسباب 21

ہ۔ٹراما کے اسباب 22

i. قدرتی آفات 23

ii. باہمی تشدد یا جنگیں 24

iii. نقل وحمل کے حادثات 26

iv. آگ 25

v. جنسی تشدد 27

vi. دہشت گردی 27

و۔ٹراما کی اقسام 29

i براہِ راست ٹراما 29

ii بلواسطہ ٹراما 30

iii شدید صدمہ (ایکیوٹ ٹراما) 31

iv دائمی صدمہ (کرونک ٹراما) 33

v کرونک ٹرومے کی علامات 35

vi پیچیدہ ٹراما (کمپلیکس ٹراما) 36

vii پیچیدہ صدمے کی علامات 38

ز۔افسانوی ادب (ناول) اور ٹراما 39

- حوالہ جات 42

باب دوم: معاصر اردو ناول اور نائن الیون کے اثرات 45

الف۔تمہید: 45

ب۔ناین الیون کے واقعات اور ادبی رد عمل 46

ج۔نائن الیون کے اردو ناول پر موضوعاتی اثرات 52

i. گلوبلائزیشن اور اردو ناول کا بیانیہ 63

ii. اسلاموفوبیا فکر کا ابلاغ اور اردو ناول 73

iii. دہشت گردی، مذہبی انتہا پسندی اور شدت پسندی 89

د۔ معاصر اردو ناول پر فنی اثرات کا جائزہ 84

i. کریٹی ناول 84

ii. اینٹی ناول 85

iii. مخلوط زبانی اسلوب 86

iv. تشکیلی اسلوب 86

v. علامات کے تجربے 87

vi. ناول کی تیکنیک اور ہئیت 91

vii. تراکیب اور زخیرہ الفاظ 95

viii. مکالمہ نگاری 99

ix. منظر نگاری 100

x. جذبات نگاری 100

xi. اسلوب بیان 101

○ حوالہ جات 103

باب سوم: وارٹراما، مابعد نائن الیون اردو ناول کا تجزیہ 107

الف۔ تمہید 107

ب۔ ادب اور ٹراما تھیوری 111

ج۔ ٹراما تھیوری کے ممکنہ وظائف 116

i. تنقیدی امکانات اور ٹراما تھیوری 116

ii. ادبی زبان پر ہونے والے اثرات کا جائزہ 116

iii. ٹراما کی پیش کش یا ابلاغ کی تفہیم 117

iv.	تاریخی اور ثقافتی موضوعات	118
v.	اخلاقی دائرہ کار	118
vi.	ٹروما سے نجات کا راستا	119
vii.	ادبی متن کی تفہیم کا نیا زاویہ	119
viii.	ادبی بیانیہ اور نمائندگی	119
و۔ ادب میں ٹراما تھیوری کی ابتدا یا روایت کا آغاز		120
i	ابتدائی مباحث	120
ii	ہولوکاسٹ ادبی متن	121
iii	ویت نام کی جنگ	121
iv	مابعد نو آبادیاتی ادب	121
v	تانیثی نظریات کے ساتھ جڑت:	122
vi	دیگر نظریات اور ٹراما تھیوری	122
ز۔ انسانی زندگی اور جنگوں کے اثرات:		124
و۔	جنگ کے نتائج یا اثرات:	128
i	نفسیاتی اثرات:	128
ii	جسمانی اثرات یا نقصانات	129
iii	نقل مکانی اور ہجرت	130
iv	معاشی ابتری	131
v	صحت، تعلیم اور سماجی مسائل	131
vi	اخلاقی اور ماحولیاتی تباہی	132
ح۔ وار ٹراما اور اس کے اثرات، پوسٹ ٹرومیٹک سٹرس ڈس ارڈر		132
i.	پوسٹ ٹرامیٹک سٹریس ڈس ارڈر	133
ii.	شدید ذہنی دباؤ	133
iii.	نفسیاتی اور اخلاقی دباؤ	134

ط۔مابعد نائن الیون مختصر عالمی ادبی منظر نامہ (بہ حوالہ ناول) 135

i عالمی پس منظر 135

ii مابعد نائن الیون حالات 138

ز۔ نائن الیون کے عالمی ادب پر اثرات 139

ح۔ مابعد نائن الیون اردو ناولوں کے کرداروں کا اجمالی جائزہ 149

○ حوالہ جات 165

باب چہارم: ٹراما کی دیگر جہات اور مابعد نائن الیون اردو ناول 168

اَ تمہید: 168

ب نفسیاتی اور جذباتی ٹراما 168

ج اجتماعی ٹراما 171

د کیتھی کروتھ کی ڈبل ٹراما تھیوری 172

ہ ڈومینک لاکیپرا کا نظریہ 173

و کائی ایریکسن کا درجہ دو ٹروما کا نظریہ 174

ز مابعد نائن الیون اردو ناولوں میں ٹراما کے آثار 175

○ حوالہ جات 217

باب پنجم: مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات 220

اَ مجموعی جائزہ 220

ب نتائج 233

ج سفارشات: 236

○ کتابیات 238

پیش لفظ

ناول اپنی تکنیک اور وسعت کے اعتبار سے اپنے اندر حالات و واقعات, زبان و بیان اور کہانی وغیرہ کو وسیع انداز میں پیش کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ دیگر اصنافِ ادب کی نسبت ناول میں تمام سماجی، مذہبی، معاشرتی اور سیاسی حالات کو کفایت کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے۔ اردو ناول کی بھی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس نے فی زمانہ اپنے دور کے تمام تر حالات و واقعات اور مروج طریقہ بیان کو نہ صرف اختیار کیا ہے بل کہ محفوظ بھی کیا ہے۔ اردو ناول رواں صدی میں نئے عالم گیر معاشرے کی ایک موثر آواز کے طور پر سامنے آیا ہے۔ پہلے دور کے ناول اور ناول نگار کے سامنے نہ موضوعات کا اس قدر تنوع تھا نہ عالم گیریت کی موجودہ صورتِ حال، لہذا قدیم ناول کی نسبت آج کے ناول اور ناول نگار کے پاس نہ صرف موضوعاتی تنوع موجود ہے بل کہ ایک متنوع اور ہمہ گیر دنیا بھی موجود ہے۔ جدید دور کی معروف فکریں، گلوبلائزیشن، ماڈرن ازم، پوسٹ کلونیل ازم، پوسٹ نائن الیون، اسلاموفوبیا ، ٹیررازم وغیرہ ناول کے مزاج، معیار، فکر، اسلوب اور تکنیک وغیرہ پر بہت شدت سے اثر انداز ہو رہی ہیں۔ دنیا تیزی سے سکڑ کر ایک وحدت اختیار کر چکی ہے، لہذا مصنفین کا زاویہ نظر یا نقطہ نظر بھی اسی کروٹ لیتی ہوئی دنیا کے ساتھ تبدیل ہو کر نئے نئے عناصر اور فکریات کے ساتھ ہم آہنگ ہو رہا ہے۔ مابعد نائن الیون کی دنیا پہلی دنیا کے مقابلے میں بہت پیچیدہ تیز اور ہمہ گیر ہے، اقوام عالم ایک دوسرے کے بہت قریب آچکی ہیں، ٹیکنالوجی کے انقلاب نے پرانی اقدار کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور ساری دنیا سمٹ کر ایک کِلک کی دوری تک رہ چکی ہے۔ آئے روز کی عالمی کش مکش ہو یا معاشی نظاموں کی سرد جنگ، تجارتی مقاصد کے لیے اقوام کی رفاقت ہو یا رقابت، یہ سب سرگرمیاں اس سرعت پذیر دنیا کا خصوصی حوالہ بن چکی ہیں۔ اردو ناول نے اکیسویں صدی کے اس سرعت پذیر منطقے میں نہ صرف اپنا وجود، روایت اور معیار پر قرار رکھا ہے بل کہ اس سارے کے سارے منظر نامے کو مقامی سطح سے لے کر عالمی سطح تک اپنے وجود کا حصہ بنایا جو مابعد نائن الیون ظہور میں آیا۔

ناول نگاروں نے موجودہ دور کے اس پیچیدہ تکویمی نظام کو نہ صرف سمجھا ہے بل کہ اسے اپنی افسانوی تخلیقات میں پیش بھی کیا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اکیسویں صدی کی سب سے جاندار آواز نائن الیون اور اس کی وجہ سے پیدا شدہ حالات و واقعات ہی ہیں۔ اردو ناول نگاروں نے نائن الیون اور اس کے سبب پیدا شدہ تمام سیاسی، سماجی، معاشی ، معاشرتی اور عالمی صورتِ حال کو نہ صرف اپنے موضوع کا حصہ بنایا ہے بل کہ پورے

اہتمام کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس تحقیقی مقالے میں نائن الیون کے بعد اردو ناولوں پر اثر انداز ہونے والے تمام موضوعات اور دیگر عوامل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ موضوعاتی جائزے کے ساتھ ساتھ نائن الیون کی جنگی صورت حال اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ شدید نفسیاتی اور جذباتی الجھنوں اور صدموں (ٹراما) کو بھی کرداروں کی نسبت سے پرکھا گیا ہے۔

باب اول میں موضوع سے متعلق بنیادی مباحث کا ذکر کرنے کے بعد ٹراما تھیوری اور ٹراما کی اقسام کا احاطہ کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں عالمی منظر نامے پر نائن الیون کے اثرات کے ساتھ ساتھ اردو ناول پر نائن الیون کے فکری اور فنی اثرات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں وار ٹراما اور اس کے اثرات کا جائزہ لیتے ٹراما تھیوری کے ادب میں اطلاقی وظائف کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر منتخب اردو ناولوں کے مرکزی کرداروں کی وضاحت کی گئی ہے۔ باب چہارم میں ٹراما تھیوری کے بیان شدہ ماڈلوں یا اقسام کو پیش نظر رکھتے ہوئے منتخب ناولوں میں موجود ٹرومیٹک عناصر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب پنجم کا تعلق مجموعی جائزے اور نتائج اور سفارشات سے ہے۔ تحقیق شدہ موضوع کے لیے مابعد نائن الیون اردو ناول کا انتخاب کیا گیا جن میں قلعہ جنگی (مستنصر حسین تارڑ) آخری زمانہ (آمنہ مفتی) ساسا (شیراز دستی) طاوس فقط رنگ (نیلم احمد بشیر) میں دہشت گرد ہوں (محسنہ جیلانی) بادل (شفق) برف (محمد الیاس) ایک لفظ سٹوری ایک ایٹمی قیامت (ایم اختر) جاگنگ پارک (نکت حسن) جہاں تیرا ہے یا میرا (عبدالصمد) وغیرہ شامل ہیں۔ اس سے قبل اردو ناولوں کو مابعد نائن الیون ٹراما اور اس کے اثرات اور دیگر موضوعاتی اور فنی اثرات کے حوالے سے نہیں پرکھا گیا تھا لہذا اس تحقیق میں فنی فکری جائزے کے ساتھ ٹرومیٹک سٹریس کی نوعیت اور کیفیت کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

سید محسن علی بخاری
سکالر پی ایچ۔ڈی (اردو)

Abstract

11/9, a term that originated from the terrorist attack on the United States on September 11, 2001, has become one of the most recognized terms of the 21st century. Today, this term is spoken and understood universally and is frequently used in literature as well. After 9/11, Pakistan was directly impacted by this tragedy, leading novelists in the region to not only use this term in their works but also to address its serious consequences. The post-9/11 era brought numerous additions and experiments to the text and composition of Urdu literature, particularly in novels. New themes such as terrorism, globalization, Islamophobia, civil war, migration, and extremism were introduced. The canvas of the Urdu novel expanded to such an extent that it encompassed the entire world.

This thesis presents an analytical study of the content, themes, and creative techniques in Urdu novels in the post-9/11 era, exploring how these novels depict the impact of 9/11. Additionally, the study discusses and presents the trauma that occurred in the fields of literature and beyond after this tragic event of 9/11

This research paper delves into the symptoms of traumatic stress disorder as depicted in post-9/11 Urdu novels, offering both technical and intellectual evaluations of these literary works. The study is structured as follows:

In the first chapter, the research begins by exploring the foundational discussions, research methodologies, and theoretical frameworks relevant to the topic. It provides a comprehensive understanding of the concept, meaning, and types of traumas, concluding with an analysis of the relationship between trauma and fiction.

The second chapter reviews the themes and techniques introduced in Urdu novels following 9/11, with the help of selected novels. This chapter also examines how the

traumatic events of 9/11 influenced the narrative structure and thematic content of these novels.

In the third chapter, the research elaborates on trauma theory, its potential applications in literature, and the impact of wars on human life and literary creation. The chapter also includes a detailed discussion of the main characters from selected Urdu novels and provides an introduction to these novels. The fourth chapter offers an in-depth examination of the psychological and emotional effects of trauma, referencing trauma models proposed by prominent psychologists. The chapter focuses on analyzing traumatic characters within selected Urdu novels, studying how these characters' experiences reflect the lasting effects of trauma.

Finally, in the fifth chapter, the research presents a comprehensive review of the entire study, summarizing key findings and offering recommendations based on the results.

اظہار تشکر

اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر گزار ہوں جس نے اپنے خاص کرم سے مجھے اس مقالے کو مکمل کرنے کی توفیق دی اور ہر قدم پر میری مدد فرمائی۔ یہ مقالہ میرے تعلیمی سفر کا ایک اہم سنگ میل ہے، جس کی تکمیل میں کئی افراد اور اداروں کی مدد اور تعاون شامل ہے۔ سب سے پہلے میں اپنی نگران، ڈاکٹر رخشندہ مراد، کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جن کی رہنمائی، علمی بصیرت، گہرائی اور ہمدردی نے مجھے اس مقالے کے مختلف پہلوؤں کو بہتر انداز میں سمجھنے اور اس پر کام کرنے میں مدد دی۔ آپ کے مشورے اور تنقید نے میری تحقیق کو مضبوط بنایا اور اس کو بہتر انداز سے پیش کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

میں اپنی یونی ورسٹی "نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز" کے شعبہ اردو کے تمام اساتذہ خصوصاً ڈاکٹر عابد سیال صاحب (صدر شعبہ لینگویجز)، ڈاکٹر ظفر صاحب، ڈاکٹر عنبرین شاکر صاحبہ (صدر شعبہ اردو)، ڈاکٹر فوزیہ اسلم صاحبہ (سابق صدر شعبہ اردو)، ڈاکٹر روبینہ شہناز صاحبہ اور ڈاکٹر صائمہ نذیر صاحبہ (کوآرڈینیٹر پی ایچ ڈی) کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے میری تعلیمی بنیادوں کو مضبوط کیا اور تحقیق کے مختلف مراحل میں میری رہنمائی کی۔ ان کی علمی مہارت اور تجربے نے میرے علم میں اضافہ کیا اور میری تحقیق کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کی۔ میں یونی ورسٹی کی لائبریری کے عملے کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے تحقیق کے دوران کتابیں، مقالے، اور دیگر مواد تک رسائی فراہم کی۔ دیگر لائبریریوں میں مقتدرہ قومی زبان اور اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد اور لیاقت باغ لائبریری کے معاون عملے کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے میرے مطلوبہ تحقیقی ماخذات تک رسائی کو ممکن بنایا۔ میں جامعہ کوٹلی کے شعبہ نفسیات کے تمام اساتذہ کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے ٹراما کے آثار و احوال کے سمجھنے میں مدد دی اور رہنمائی فراہم کی۔

اپنے دوستوں اور ساتھی سکالرز کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ اس کے علاوہ، میں ان تمام افراد کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے میری تحقیق کے مختلف مراحل میں کسی نہ کسی طریقے سے مدد کی۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں جو اس تحقیق کے دوران میرے ساتھ رہے اور

میری کامیابی کے لیے دعا گو رہے۔ آخر میں، میں اپنے تمام بہن بھائیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے ہمیشہ میری تعلیم اور تحقیق کے لیے میری حوصلہ افزائی کی۔ ان کی دعائیں اور محبت میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں، ان کی شفقت اور سرپرستی کے بغیر میں یہ سفر طے نہیں کر سکتا تھا۔

اس موقع پر میں خصوصی طور پر اپنی شریکِ حیات سیدہ عفت الحسینی کا بھی شکر گزار ہوں جس نے نہ صرف مقالے کی کمپوزنگ، سیٹنگ اور دیگر ٹیکنیکل امور میں مدد دی بل کہ مالی لحاظ سے بھی مجھے پریشان نہیں ہونے دیا۔ یہ مقالہ میری زندگی کا اہم حاصل ہے، اور میں اس کی تکمیل میں شامل ہر فرد کا میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میری اس محنت کو قبول فرمائے اور میری مستقبل کی راہوں کو آسان کرے۔ آمین

سید محسن علی بخاری
سکالر پی ایچ۔ڈی (اردو)

باب اول:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ بنیادی مباحث

i۔ موضوع کا تعارف

نسلِ انسانی اپنے ارتقائی سفر میں بڑے بڑے حادثوں ،جنگوں اور قدرتی آفات کا سامنا اور مقابلہ کرتے دورِ رواں کے پیچیدہ ترین منطقے میں داخل ہوئی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان نے کائنات اور اس کی رمزیات کو اپنے علم اور ہنر سے مسخر کیا مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہزاروں انسان ان قدرتی حادثوں اور خود اپنی شر پسندیوں کی وجہ سے سخت ذہنی صدمے اور اذیت میں مبتلا ہوتا رہا ہے۔ہزاروں اور لاکھوں انسان ان اذیت ناک صدموں کو نہ سہ کے اور یا تو موت کی آغوش میں چلے گے یا کسی نہ کسی پیچیدہ نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہو گے۔اکیسویں صدی جس میں ہم موجود ہیں، تمدنی لحاظ سے ایک پیچیدہ ترین صدی ہے،سیاسی، سماجی،اقتصادی اور تہذیبی و ثقافتی لحاظ سے یہ صدی اپنے اعلاترین تخلیقی دور سے گزر رہی ہے۔ صدی کے آغاز ہی میں ریاست ہائے متحدہ امریکا کی سرزمیں پر نائن الیون کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر ایک خوفناک حملہ ہوا جس میں نہ صرف ٹوین ٹاور مکمل طور پر تباہ ہو گے بل کہ ہزاروں انسانوں نے بھی اپنی جان سے ہاتھ دھویا۔یہ ایک ایسا حادثہ تھا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا میں ایک نئے منظر نامے کو جنم دیا۔امریکا نے بغیر کسی تحقیق اور ثبوت کے اس حملے کے تانے بانے افغانستان سے جوڑے اور افغانستان پر چڑھائی کر دی۔یوں پاکستان سمیت جنوبی ایشیا میں ایک تباہ کن دور کا آغاز ہوا جس نے لاکھوں انسانوں کی زندگیوں کو نگل لیا۔ڈاکٹر لیاقت علی نائن الیون کے حوالے سے لکھتے ہیں

> "نائن الیون کا دن دنیا کی معلوم تاریخ کا ایسا دن کہ جس نے واقعی پوری دنیا کی سیاسی، معاشی، عسکری اور تہذیبی زندگی کو ہلا کر رکھ دیا۔نیو یارک شہر کے دو بلند و بالا ٹاور ہی زمیں بوس نہیں ہوے، انسانی تاریخ کا پورا سفر بھی جیسے یک لخت زمین پر آ گرا"[1]

نائن الیون نے دنیائے عالم کے مسلمانوں کے لیے اور بالخصوص پاکستان کے لیے بہت بڑے معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی مسائل اور انسانی ٹروے کو جنم دیا۔ پاکستان کے ناول نگاروں نے اس حادثے کو نہ صرف دیکھا بل کہ اس کے مضر اثرات ان پر بیتے بھی ہیں اس لیے انھوں نے نائن الیون اور اس کی ذیل میں جنم لینے والے انواح واقسام کے مسائل کا ذکر اپنے تخلیق شدہ ناولوں میں براہِ راست یا کسی نہ کسی حوالے سے کیا ہے۔ یہاں تک کہ اس حادثے کے اثرات بھارت کے مسلمانوں تک بھی پہنچے اور بھارت میں بھی نائن الیون کے زیرِ اثر ناول لکھے گے ۔ نائن الیون نے بلا شبہ ساری دنیا کے ادب کو اپنی لپیٹ میں لیا اور نئے پیدا ہونے والے حالات کو ادب میں پھر پور انداز میں پیش کرنے کا موقع فراہم کیا۔ "پاکستانی ادب پر نائن الیون کے اثرات "میں اس کی توثیق یوں کی گئی ہے

> "گیارہ ستمبر کے اس حادثے نے نہ صرف اسلامی ادب بل کہ ہر ملک کے ادب کو متاثر کیا ہے۔ پاکستانی ادب میں بھی ادیب ایک ایسے دریا کی مانند اٹھے جن کی موجوں میں اگرچہ طوفان کی تیزی اور ہلچل نہ تھی لیکن ایک پھر پور اثر ضرور تھا۔"[2]

مجوزہ تحقیقی مقالے " ادب اور ٹراما: مابعد نائن الیون اردو ناول کا تجزیاتی مطالعہ " (بحوالہ خصوصی منتخب ناول) میں نائن الیون کے حادثے سے جنم لینے والے حالات و واقعات اور موضوعات کا مختلف مسائل کے تناظر میں آج کے انسان کے صدمے اور ذہنی کرب کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا کہ اس واقعے کو کس طرح اردو ناول نے پیش کیا ہے۔ موضوع کو اخذ کرنے کے لیے منتخب ناول لیے گے ہیں جن میں خصوصی طور پر نائن الیون اور اس کے اثرات کو بیانیے کا حصہ بنایا گیا ہے۔

ii۔ بیانِ مسلہ

نائن الیون اکیسویں صدی کا وہ عظیم حادثہ تھا جس نے مشرق و مغرب میں یکساں اثرات مرتب کیے۔ جنگ، خوف، اور موت کا ایسا رقص شروع ہوا جس نے لاکھوں زندگیوں کو نگل لیا۔ ساری دنیا کسی نہ کسی پہلو سے اس حادثے کی زد میں آئی۔ نائن الیون اور اس کے اثرات پر جہاں مغربی ناولوں میں لکھا گیا وہیں اردو ناول نگاروں نے بھی اسے اس کی جزیات سمیت اپنے ناولوں میں جگہ دی۔ فکری اور نفسیاتی لحاظ سے اردو ناول نگار اس حادثے سے بہت متاثر ہوے جس کا اظہار انھوں نے اپنے تخلیق کردہ ناولوں میں جابجا کیا ہے۔ نائن الیون کے جلو میں جنم لینے والے سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، نفسیاتی المیے اور انسانی ٹروے اردو

ناول میں بطور موضوع شامل ہوے۔ اردو ناول نے نائن الیون اور اس کے کثیر الجہت اثرات کو نہ صرف اپنے دامن میں سمیٹا بل کہ بھر پور انداز میں بیان بھی کیا ہے ۔ اس سانحے نے ناول نگاروں کو ایک نئے منتشر، متحارب، افسردہ اور تباہ کن منظر نامے سے متعارف کرایا جس کا تعلق انسان کے ہاتھوں انسان کی پا مالی اور بربادی سے ہے۔ نائن الیون کے اس ہمہ جہت سانحے کے اردو ناول پر فکری، فنی اور موضوعاتی اثرات کا جائزہ لینے کے لیے ضروری تھا کہ باقاعدہ، منظم اور مربوط انداز میں کوئی تحقیقی کام اردو ناول کے حوالے سے کیا جائے۔ اس مجوزہ تحقیقی مقالے "ادب اور ٹراما: مابعد نائن الیون اردو ناول کا تجزیاتی مطالعہ "(بحوالہ خصوصی منتخب ناول) میں نائن الیون کے اردو ناول پر بحوالہ صدمہ اثرات کے ساتھ ساتھ دیگر ہمہ جہت موضوعاتی اور فنی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

iii۔ مقاصدِ تحقیق

1۔ اردو ناول پر نائن الیون کے بعد وقوع پذیر حالات وواقعات مثلاً جنگ، دہشت گردی، انتہا پسندی، کے ساتھ ساتھ تہذیبی، تمدنی، معاشی اور سیاسی و سماجی الجھنوں اور اثرات کا جائزہ لینا۔

2۔ مغرب کی اسلاموفوبیائی فکر کے ابلاغ کا اردو ناول میں جائزہ لینا اور مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کو پیش آنے والے مسائل کے ذکر کا اردو ناول میں جائزہ لینا۔

3۔ نائن الیون نے عام انسانوں خصوصاً مسلمانوں کے فکری نظام کو متاثر کیا اور اردو ناولوں میں اسے کس طریقے سے پیش کیا ہے؟ کا جائزہ لینا۔

4۔ وہ تمام صدمے جو اس حادثے کے بعد رونما ہوے اردو ناول میں مختلف کرداروں کے رویوں اور فکر سے نمایاں کیے گے ہیں ان کا ٹراما تھیوری کے فریم ورک میں رہ کر جائزہ لینا۔

iv ۔ تحقیقی سوالات

نائن الیون نے کس طرح عالمی (مغربی) ادبی منظر نامے کو متاثر کیا؟

نائن الیون نے کس قسم کے ٹراما کو جنم دیا اور اردو ناول پر کون سے موضوعاتی اثرات مرتب ہوے ؟

اردو ناول مابعد نائن الیون مضر اثرات اور ٹراما کی مختلف جہات کو پیش کرنے میں کس حد تک کامیاب رہا؟

v۔ نظری دائرہ کار

اکیسویں صدی کا آغاز ایک عظیم حادثے سے ہوا جب گیارہ ستمبر 2001 کو ریاست ہائے متحدہ امریکا میں عالمی تجارتی مرکز کی دوبلند و بالا عمارتوں کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا گیا۔ یہ حادثہ جسے اب نائن الیون سے جانا جاتا ہے ایک ایسی چنگاری ثابت ہوا جس نے آناً فاناً ساری دنیا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ساری دنیا ایک نئے منظر نامے سے متعارف ہوئی۔ یہ منظر نامہ بڑا خونین نظر آتا ہے۔ ہر طرف ایک عجیب سا خوف ہر اس پیدا ہوا جس نے مشرق اور مغرب دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لاکھوں لوگ مارے گے اور لاکھوں ابھی تک ایک صدمے کی کیفیت میں جی رہے ہیں۔ نائن الیون نے عالمی منظر نامے پر ہمہ گیر قسم کے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ان اثرات نے اردو ناول اور ناول نگاری کی تخلیقی صلاحیت کو ایک نئے عہد سے متعارف کرایا۔ اردو ناول ایسے برق رفتا اور الجھے ہوے حالات و واقعات کا بیانیہ بنا جو نائن الیون کے بعد دنیا میں نمودار ہوا۔ مجوزہ تحقیقی مقالے "معاصر ادب اور ٹراما: مابعد نائن الیون اردو ناول کا تجزیاتی مطالعہ" کو ٹراما جس کا اردو مترادف ذہنی صدمہ ہے، کے نظری دائرہ کار کے مطابق پرکھا جائے گا۔ صدمے کے نظریے نے جنگِ عظیم دوم کے بعد اہمیت حاصل کی۔ اسے جنگ سے بری طرح متاثر ہونے والے لوگوں خصوصاً بچوں اور عورتوں کے حوالے سے استعمال کیا گیا۔ ٹروما کی ابتدائی بحث ہمیں سگمنڈ فرائیڈ کی کتابوں میں مل جاتی ہیں۔ اس نے یہ نفسیاتی اور ٹراما تھیوری اپنی ایک مریضہ جو کے ہسٹریا کا شکار تھی، کے علاج کے دوران تخلیق کی۔ اسے جین مارٹن چارکوٹ نے پہلی مرتبہ اپنی ہسٹیریا کی مریضہ تجربے کے طور پر استعمال کیا۔ اس کے بعد ناقدین نے اس کی مدد سے نفسیات، ادب، فلم، اور سماجیات جیسے متعدد شعبوں میں افراد کے ٹرامائی پہلو کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ٹراما کسی انتہائی غیر متوقع، خوف ناک واقعے, حادثے یا قدرتی آفت وغیرہ کے فوراً بعد پیدا ہونے والے ذہنی اور قلبی انتشار کو کہتے ہیں۔ اس کا تعلق جسمانی چوٹ سے زیادہ ذہنی چوٹ سے ہے۔ عصری ادب کا سب سے اہم موضوع ٹراما (صدمہ) کا ابلاغ ہے۔ عصری ادب میں ٹراما کے نظرے کا ایک اہم دعوی ہے کہ صدمے سے انسان کے اندر ایسا خوف پیدا ہوتا ہے جو اس سے ادراک اور شناخت کو چھین لیتا ہے۔ صدمے (ٹراما) کو سال ہا سال سے مختلف طریقوں سے سمجھا جا رہا ہے۔ آئے روز علم میں اضافے اور کسی فرد، کنبے، برادری اور

معاشرے کے صدماتی تجربے کی بنیاد پر ٹرومے کا نظریہ الگ الگ صورت اختیار کرتا ہے۔ حادثے کی نوعیت، کیفیت اور اس سے وقوع پذیر ہونے والے ہمہ جہت اثرات مختلف انسانوں میں مختلف انداز میں ظاہر ہوتے ہیں لہٰذا ٹراما کی تفہیم بھی اسی متغیر صفت کے مطابق انفرادی اور اجتماعی سطح پر متاثرہ فرد کے ردِ عمل کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ ادب میں ٹراما اور اس کے مابعد اثرات کا جائزہ لیا جاتا رہا ہے۔ٹراما کی بنیادی تین اقسام (Acute ,Chronic and Complex trauma,) کے حوالے سے ادب خصوصاً فکشن میں کرداروں کے تجزیے کے لیے ٹراما تھیوری کو استعمال کیا گیا ہے۔نائن الیون بھی ایک ایسا حادثہ ثابت ہوا جس نے تقریباً ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اس حادثے کے بعد ہونے والی جنگوں نے انسانوں کے اذہان پر بہت برے اثرات مرتب کیے جن کا اظہار اردو ناولوں میں کیا گیا ہے۔ امریکن نقاد: وین ڈیر کالک جو کے ایک ماہرِ نفسیات ہے اور جس نے ٹراما کے حوالے سے بہت سی تنقیدی کتابیں بھی لکھی ہیں، ٹراما کے حوالے سے اپنا نظریہ پیش کرتا ہے:

"The essence of psychological trauma is the loss of faith that there is order and continuity in life. Trauma occurs when one loses the sense of having a safe place to retreat within or outside oneself to deal with frightening emotions or experiences".[3]

نفسیاتی صدمے سے مراد اس یقین کا کھو جانا ہے جس سے زندگی میں ایک ترتیب اور استحکام پیدا ہوتا ہے۔ٹراما اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک انسان کسی خوف ناک جذبے یا تجربے سے نمٹنے کے لیے اپنے اندر یا باہر کسی محفوظ جگہ کا حساس کھو جائے

لٹریری ٹراما تھیوری ادب میں ٹراما کے حوالے سے جو نقطہ نظر پیش کرتی ہے اس کی وضاحت مائیکل بلیو نے اپنے ایک مضمون Trends in Literary Trauma Theory میں اس طرح کی ہے

"A Central claim of contemporary literary Theory assert that trauma creates a speech less fright that divides or destroy identity."[4]

زیر تحقیق مقالے میں اس حادثے کی وجہ سے پیدا ہونے والے حالات و واقعات کے ساتھ انسانی ٹرومے کو درج بالا ٹراما تھیوری کے فریم ورکس کی مدد پر کھا گیا نیز ادب میں ٹراما تھیوری کے ممکنہ پہلوؤں سے بھی تحقیق کو حتمی نتیجے تک پہنچایا گیا ہے۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار

مجوزہ تحقیقی مقالہ " ادب اور ٹراما: مابعد نائن الیون اردو ناول کا تجزیاتی مطالعہ " بنیادی طور پر ایک معاصر ادب کی صنفِ ناول پر تحقیقی مقالہ ہے۔ نائن الیون کے بعد اردو زبان میں بے شمار ناول لکھے گے۔ ان میں سے اکثر پاپولر فکشن میں آتے ہیں۔ مگر زیرِ کار موضوع کو ہم نے منتخب شدہ ان ناولوں کی روشنی میں پرکھا ہے جن میں نائن الیون یا اس کی ذیل میں جنم لینے والے ملکی سطح سے لے کر عالمی سطح تک کے حالات وواقعات کو زیرِ بحث لایا گیا اور نائن الیون کے باعث جنم لینے والے جنگی صدمے اور اس کے اثرات کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر موضوعاتی اور فنی اثرات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اس تحقیق کا تعلق کسی مقداری یا شماریاتی تحقیقی نوعیت سے نہیں اس لیے دوران تحقیق نائن الیون کے زیرِ اثر اردو ناولوں کے تمام پہلوؤں کا جائزہ علمی تحقیق کو بروے کار لیا گیا۔ مواد کی جمع آوری اور ترتیب کے بعد تجزیاتی طریقہ تحقیق اختیار کیا گیا۔ بنیادی مباحث اور زیرِ کار ٹراما تھیوری کو بیان کرنے کے ساتھ ٹراما کا معنیٰ، مفہوم اور اس کی اقسام کو پیش کر کے اسے نائن الیون حادثے کے تناظر میں پرکھا گیا ہے۔ ٹراما تھیوری کو مابعد نائن الیون اردو ناولوں میں دو پہلوؤں سے جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے، ایک میڈیکل اور دوسرا لٹریری۔ میڈیکلی ٹراما کی نوعیت اور کیفیت اور اس کے انسانی دماغ پر اثرات کا جائزہ لینے کے بعد بتایا گیا کہ کس طرح ٹراما انسان کو متاثر کرتا ہے۔ لٹریچر اور ٹراما کو مابعد نائن الیون اردو ناولوں کے تناظر میں پرکھا گیا ہے۔ ان عناصر کا جائزہ بھی لیا گیا جو نائن الیون کے بعد رونما ہوے اور ٹراما کی کسی بھی شکل کو پیدا کرنے میں بطور محرک شامل ہوے، دستاویزی طریقہ تحقیق کو بھی استعمال کرتے ہوے اٹھائے گے سوالات کے جواب تلاش کیے گے ہیں، حتمی، مستند اور قابلِ قبول تحقیق کے لیے اہم نقادینِ فن سے بھی براہِ راست اکتساب کیا گیا۔ ۔علاوہ ازیں مختلف لائبریریوں (لائبریری نمل، مقتدرہ فروغِ قومی زبان، اکادمی ادبیات ، اسلام آباد، اوپن یونی ورسٹی، فیڈرل اردو یونی ورسٹی ، کے ایچ لائبریری مظفر آباد وغیرہ) سے متعلقہ موضوع کے حوالے سے دستیاب تنقیدی کتب سے بھی نقطہ نظر حاصل کیا گیا۔ انٹرنیٹ بھی اس دور میں ایک محقق کے لیے بہت مددگار ہے اس لیے موضوع سے متعلق انٹرنیٹ پر دستیاب تنقیدی کتب اور تنقیدی مضامین سے بھی استفادہ کیا گیا ہے ۔ ہر باب کے مکمل ہونے پر اسے حتمی اور آخری شکل دینے کے لیے اپنے محترم نگران کے ساتھ جامعہ کوٹلی کے شعبہ نفسیات کے اساتذہ سے رہنمائی کے بعد اصلاح وترمیم کے ساتھ مرتب کیا گیا۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق

اکیسویں صدی کے سرعت پذیر منظر نامے میں اردو ناول کی کروٹوں پر باقاعدہ مربوط تحقیقی کام بہت کم نظر آتا ہے۔ خصوصاً نائن الیون اور ٹرامہ کے پس منظر میں اردو ناولوں کے حوالے سے کوئی بڑی تحقیقی کوشش نظر نہیں آتی۔ البتہ کچھ آرٹیکلز اور مضامین اس موضوع سے متعلق مل جاتے ہیں مگر ان میں ایک سرسری سا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ کچھ تنقیدی کتب جن میں اکیسویں صدی کے ناول اور نائن الیون کے اثرات کو جزوی طور پر بیان کیا گیا ہے، موجود ہیں۔ مگر کلی طور پر کسی کتاب میں نائن الیون کو ناول کے حوالے سے بطورِ خاص نہیں بیان کیا گیا۔ اردو ناول پر ما قبل تحقیق کچھ یوں ہے:

ارشاد بیگم، اردو ناول کے باغی کردار، نمل، اسلام آباد، 2015

انیلا سعید، "اردو انول پر مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات، نمل، 2015ء

بلال احمد، اردو ناول پر فرائیڈ کے افکار و نظریات کے اثرات، نمل، 2017

روبینہ سلطان، "تین نئے ناول نگار" دستاویز پبلیشرز، لاہور، 2012ء

شاعر علی شاعر، "جدید اردو ناول" عکس پبلیشرز، لاہور، 2019ء

صوبیہ سلیم، اردو ناول کے کلیدی نسوانی کردار، نمل، اسلام آباد، 2009

صنوبر الطاف، اردو ناول کی تنقید کے رجحانات، نمل، 2018

غفور احمد، "نئی صدی، نئے ناول"، کتاب سرائے، لاہور، 2014ء

ماجد ممتاز، اردو ناول میں مذہبی عناصر، نمل، اسلام آباد، 201

محمد افضال بٹ، اردو ناول میں سماجی شعور، نمل، اسلام آباد، 2007

محمد بشارت، تحقیقی مقالہ

"اردو نظم پر دہشت گردی کے اثرات،" نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ممتاز خان، ڈاکٹر، "اردو ناول میں کرداروں کا حیرت کدہ" فضلی پبلیشرز، کراچی، ن م۔

ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، "اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار" فکشن ہاوس پبلیشرز، لاہور، 2014ء

ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے چند اہم زاویے، انجمن ترقی اردو کراچی، 2014
مشتاق احمد، پاکستانی اردو ناول میں پس ماندہ طبقے کے مسائل، نمل، 2017
نعیم مظہر، ڈاکٹر، پاکستانی اردو ناولوں میں اسلامی فکر کی عکاسی، نمل، 2007

viii۔ تحدید

مابعد نائن الیون، مختلف نوعیت کے اردو ناول لکھے گئے ہیں۔ سب ناولوں کا ذکر اس تحقیقی مقالے میں نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی فہرست بہت طویل ہے لہذا اس مجوزہ تحقیقی مقالے میں پاپولر فکشن کی ذیل میں آنے والے ناولوں کی بجائے ان منتخب اردو ناولوں کا جائزہ لی نے کی کوشش کی گئی ہے جن میں نائن الیون کے مختلف اثرات مثلاً دہشت گردی، فرقہ واریت، گلوبلائزیشن، اسلاموفوبیا وغیرہ کی پیش کش جیسے عناصر موجود ہیں اور جن کے کرداروں میں کسی نہ کسی طور ٹروما کی کسی صورت کا پتا چل رہا ہو۔ یعنی مابعد نائن الیون اردو ناول کی فکر، فن پر جس قسم کے اثرات مرتب ہوے ان کو پرکھنا اور بیان کرنا۔ نائن الیون نے اردو ناول کے فن، موضوع اور پیش کش پر کس قسم کے اثرات مرتب کیے درج ذیل منتخب ناولوں کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔

1۔ "بادل" از شفق (انڈیا) (کرون آفسٹ پریس، پٹنہ، 2002)
2۔ "قلعہ جنگی" از مستنصر حسین تارڑ (سنگِ میل پبلیشرز، لاہور، 2002)
3۔ میں ایک دہشت گرد از محسنہ جیلانی (شہزاد پبلیشر، کراچی، 2008)
4۔ "برف" از محمد الیاس ("سنگِ میل پبلیشرز، لاہور، 2010)
5۔ "جاگنگ پارک" از نکہت حسن (شہزاد پبلیشرز، کراچی، 2010)
6۔ "آخری زمانہ" از آمنہ مفتی (الفیصل پبلیشرز، 2011)
7۔ "پسِ آئینہ" از سرفراز بیگ (مثال پبلیشرز، فیصل آباد، 2013)
8۔ "ایک لوسٹوی ایک ایٹمی قیامت" از ایم اختر (فکشن ہاوس، لاہور، 2017)
9۔ "طاوس فقط رنگ" از نیلم احمد بشیر (سنگِ میل پبلیشرز، لاہور، 2018)
10۔ "جہاں تیرا ہے یا میرا" از عبد الصمد (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2018)
11 "ساسا" از محمد شیراز دستی (عکس پبلیشرز، لاہور، 2019ء)

ان منتخب ناولوں کے ذریعے زیرِ تحقیق موضوع پر تحقیقی کام کیا گیا ہے۔

ix۔ پس منظری مطالعہ

اکیسویں صدی کے عالمی تناظر میں بے شمار اردو ناول مختلف موضوعات تخلیق ہوئے ہیں لیکن جس کثرت سے ناول لکھے اور پیش کیے گے اس حساب سے ان کے حوالے سے تنقیدی کتب جو ان کے تمام تر پہلوؤں کا مکمل جائزہ نائن الیون کے تناظر میں پیش کر سکیں ابھی تک منظر عام پر نہیں آسکی ہیں تاہم چند مضامین اور چند کتب ایسی ہیں جو رواں کے آغاز میں وقوع پذیر ہونے والے حادثے نائن الیون کے واقعات اور ثمرات کا مختصر جائزہ، ناول اور ناول نگار کے حوالے سے فراہم کرتی ہیں۔

Anne Whitehead, Trauma Fiction, Edinburgh University press, 2004.

Ashlee Joyce, The Gothic in contemporary British Trauma Fiction. University of New Brunswick Redaction, Canada ,2019

Michelle Baldev, Trends in Literary Trauma Theory. University of Manitoba ,2018.

Mohsin Hamid "The Reluctant Fundamentalist "Houghton Mifflin Harcourt, 2007, UK

Amir Rabiya, "Post نائن الیون Pakistan's Diasporic Fiction: Redefining South Asian Literature" Kashmir journal of language Research, volume,19, 2013.

Ahmad Gamal, "The global and the postcolonial in post-migratory literature" Journal of Postcolonial Writing, volume 49, 2013.

پروفیسر ، صوفیہ لودھی،ڈاکٹر"حجاب کا ناول پاگل خانہ اور ماحولیاتی تنقید" ریسرچ جنرل (اردو) مشمولہ الماس، شمارہ19، 2017

پروفیسر، صوفیہ لودھی،ڈاکٹر،"ایک کہانی دو تکنیکس "مشمولہ الماس، شمارہ22، 2020

پروفیسر، فضل قادر،ڈاکٹر، نائن الیون اور اسلام، اشریعہ اکادمی، لاہور، پین گرافکس، اسلام آباد، 2005ء

پروفیسر، صوفیہ لودھی، ڈاکٹر، "ایلف شفق کا ناول ناموس" مشمولہ، بہاوالدین زکریہ یونی ورسٹی، ملتان
پروفیسر، صوفیہ لودھی، ڈاکٹر، "تلاشِ بہاراں سے انجامِ بہاراں تک" مشمولہ الماس، شمارہ20، 2018
پروفیسر، روبینہ شہناز، ڈاکٹر، "اردو ادب کی تحریکیں" مشمولہ اردو تنقید میں تصورِ قومیت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2007
سید کامران عباس کاظمی، "معاصر اردو ناول اور عصریت" مشمولہ معیار، جنوری تا جون، 2014ء
شہزاد منظر، "ادب میں انتہا پسند رجحانات" مشمولہ، ماہنامہ فنون، لاہور، 1991ء
فوزیہ چودہری، ڈاکٹر، 11/9 کے اردو ناول پر اثرات، مشمولہ پاکستانی زبان و ادب 11/9 کے اثرات خیابان، جامعہ پشاور، 2010ء
مشرف عالم ذوقی، نائن الیون، سائبر ورلڈ اور ہماری کہانیاں، مشمولہ ایک روزن، آن لائن، جولائی 201ء
محمد کامران شہزاد، نائن الیون اور مذاحمتی ناول، مشمولہ، خیابان، جامعہ پشاور
محمد ساجد، "نائن الیون حقیقت سے اردو افسانے تک" ادارہ نویدِ سحر، لاہور، 2015ء
نجیبہ عارف، ڈاکٹر، "11/9 اور پاکستانی اردو افسانہ" پورب اکیڈمی اسلام آباد، 2001ء

x۔ تحقیق کی اہمیت

انسانی زندگی کبھی دائروی صورت میں حرکت پذیر رہتی ہے تو کبھی ایک مستقیم خط کی مانند آگے بڑھتی ہے۔ بہت سارے تہذیبی عوامل کبھی متوازی خطوط کی صورت ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو سفر کرتے اور کبھی بے قاعدہ شعاوں کی مانند ماحول کو منور کرتے اور انسانی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی زندگی ایک مسلسل انقلاب کی صورت تعمیر و تخریب سے ہم مزاج ہوتی رواں دواں رہتی ہے۔ دور حاضر جس میں ہم جی رہے ہیں اپنی نوعیت کا ایک پیچیدہ ترین دور ہے۔ انسانی تمدن سادہ سے پیچیدہ اور اب پیچیدہ سے پیچیدہ ترین سیاسی، سماجی، سائنسی، معاشی اور معاشرتی اقدار میں داخل ہو چکا ہے۔ آئے روز نظریات و افکار کا ایک جھکڑ چلتا ہے اور پہلے سے موجود فکری نظام کی جڑیں تک ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ لہذا ملکی سطح سے لے کر بین الاقوامی سطح تک انسانی اقدار، خیالات و افکار، طرز زندگی یہاں تک کہ جنگوں کے طریقہ کار میں بھی ایک نیا پن ظاہر ہو رہا ہے۔ بقول ڈاکٹر فخر الکریم

"یہ عہد جس میں ہم سانس لے رہے ہیں انسانی تہذیب کی پوری تاریخ میں سب سے پیچیدہ عہد ہے۔ یہ عہد پیچیدہ اس لیے ہے کہ یہ عبوری دور ہے جہاں کسی چیز کو بھی استحکام نہیں ہے۔ اقدار، نظریات، طرزِ زندگی، تہذیبی مظاہر، رہن سہن کے آداب، تصورات وخیالات، اور انسانی رویے کوئی چیز مستحکم نہیں۔"[5]

اب یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک طرف تو پورا تہذیبی و ثقافتی ڈھانچہ نہ صرف تبدیل ہو رہا ہو بل کہ ایک عالمی وحدت میں بھی ڈھل رہا ہو اور تخلیق کار اسے محسوس کر کے اسے بطور موضوع اپنی تخلیقات کا حصہ نہ بنا تا۔۔ اس ہمہ گیریت نے اردو ناول اور اس کے سروکاروں کو بھی از سر نو ترتیب دیا ہے۔

نائن الیون وہ اثر انگیز سانحہ ثابت ہوا جس نے اکیسویں صدی کے منظر نامے کو کلی طور پر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ نائن الیون نے اقوامِ عالم کے مزاج، سوچ، فکر اور کردار پر بہت گہرے نقش مرتب کیے ہیں ۔عہدِ رواں میں نائن الیون ایک ایسے ٹرانس کی صورت نمودار ہوا جس نے بہت تیزی سے ساری دنیا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ پوری دنیا اس کے ٹرانس سے کسی نہ کسی صورت متاثر ہوئی۔ ناول کا تعلق انسانی زندگی اور اس کے علائق سے بہت گہرا رہا ہے لہٰذا دنیا بھر میں ایسے ناول لکھے گے جن میں نائن الیون کے تغیر آمیز سانحے کو موضوع بنایا گیا۔ اس حوالے سے ایک امریکن محقق کا کہنا ہے

"The Nine Eleven novel has gone through significant transformation: from the central topic, September 11, 2001 has become a frame or a single occurrence in the plot, or even only an assumed reference. The novelists have emphasized the scene or have put a conscious distance between the historical events and literary forms, trying to build a counteractive to the destructive narrative of the post Nine Eleven decade."[6]

دیگر زبانوں کے ناولوں کی طرح اردو ناول نے بھی اس سانحے کو بہ خوبی جگہ دی اور بیان کیا ہے۔ اس عالم گیر واقعے کی جڑیں امریکا کی زمیں میں تھیں اور اس کے ثمرات افغانستان، پاکستان میں بالخصوص اور باقی

ایشیائی ممالک میں بالعموم پائے گے۔اس ہنگامے اور تباہ کن المیے نے عالمی سطح پر ایک ٹرومے کو جنم دیا۔اس ٹرومے کا زیادہ تعلق مسلمانوں سے ہے مگر مغربی اقوام بھی اس سے کسی نہ کسی طرح متاثر ہوئی ہیں۔اس ہنگامہ خیز عالمی فضا کا منطقی نتیجا تھا کہ قلم کار اس بطور موضوع اپنی تخلیقات میں پیش کرتے۔اردو ناول نگاروں نے بھی اس تغیر آمیز موضوع کو لکھا اور فکری، تہذیبی اور ثقافتی کش مکش کے تمام زاویوں کو پیش کیا۔لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ ناولوں کی بنت میں کہیں پوسٹ ماڈرن ازم کا نعرہ بلند کیا جارہا ہے تو کہیں پوسٹ کلونیل ازم کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔عالمی استعماری طاقتوں کا نیو ورلڈ آرڈر ہو یا معاشی نظاموں کی کش مکش، جدید اسلحے کی دوڑ ہو یا ترقی پذیر ممالک خصوصاً مسلم ممالک میں استعماری طاقتوں کی فیفتھ جنریشن وار۔انفرادی سطح پر کسی ایک فرد کی زندگی کا المیہ ہو یا عالمی سطح پر سپر پاورز کا رزمیہ۔اس سب کا نشانہ بہر حال انسان ہے۔اردو ناول نے ان تمام المیاتی اور صدماتی کیفیات کو بہت ہنر کے ساتھ اپنے مزاج کا حصہ بنایا اور بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔۔اکیسویں صدی کے سرعت پذیر منظر نامے میں اردو ناول کے موضوعات پر کوئی باقاعدہ کام نظر نہیں آتا ہے۔البتہ کچھ آرٹیکلز اور مضامین اس موضوع سے متعلق مل جاتے ہیں اور کچھ تنقیدی کتب جن میں اکیسویں صدی کے ناول اور نائن الیون کے اثرات کو جزوی طور پر بیان کیا گیا ہے، موجود ہیں۔یقیناً یہ تحقیقی کام اپنی جہت میں ایک نیا کام ہو ہے جس نے اردو ناول کو نہ صرف ادبی لحاظ سے نائن الیون کے تناظر میں پرکھے بل کہ اس بات کا بھی جائزہ لیا کہ وہ کون سے موضوعاتی، اسلوبیاتی، تکنیکی اضافے ہیں جن کی مدد سے اس صدی کے سیاسی، سماجی اور تمدنی تغیرات کو پیش کیا گیا ہے۔اس موضوع میں عالمی سماجی تناظرات کی روشنی میں اقوامِ عالم کی انفرادی اور بین الاقوامی زندگی کے ٹکراو اور انجذاب سے پیدہ شدہ حالات اور ٹراماتی تناظرات کو پرکھا گیا ہے۔

ب۔ تمہید:

فکریاتِ انسانی یا جسے ہم انسانی نفسیاتی ڈھانچا کہتے ہیں ایک عجیب و غریب کشمکش کے زیر اثر برسرِ پیکار رہتا ہے۔مزاجِ انسانی کی بے شمار تشریحات اور توضیحات ہو چکی ہیں، ماہرینِ نفسیات نے انسانی نفسیاتی دنیاؤں کے ایک ایک گوشے کو پڑھنے، پرکھنے اور پھر اپنی سمجھ کے مطابق بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج انسانی نفسیات اور فکر و نظر پہ بے شمار نظریات پائے جاتے ہیں۔

یہ تو طے ہے کہ انسانی شعور یا انسانی نفسیاتی میکنزم مختلف عمل انگیز حادثات و واقعات سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان مختلف حالات و واقعات میں مختلف قسم کے نفسیاتی رویوں کا اظہار کرتا ہے۔ یہ نفسیاتی رویے جہاں اپنے موروثی خصائص کے آئینہ دار ہوتے ہیں وہیں کچھ مخصوص واقعات یا حادثات ان میں تغیر و تبدل کا باعث بنتے ہیں۔ انسان کی نفسیات اور کردار کی تعمیر انسانی جبلت، انسانی تجربے اور ماحول سے جڑی ہوئی ہے۔ شیدہ محمد ماہرِ نفسیات کے بقول

> "یہ صحیح ہے کہ انسانی فطرت کی تہ میں چند خاص خواہشیں اور جبلی جذبات پائے جاتے ہیں جو کم و بیش تمام انسانوں میں مشترک ہیں جیسے غذا، پانی، گرمی، سونے، آرام حاصل کرنے وغیرہ کی خواہشیں اور ان کے ساتھ کچھ جبلتیں اور مخصوص جذبات بھی ان خواہشات کے ساتھ شامل ہیں جیسے اچانک گھبرا جانے کی صورت میں گم صم ہو جانے کی جبلت، خوف کے مارے فرار ہو جانے کی جبلت، حملہ کرنے کی جبلت، ہمدردی، تقلید، تحقیق اور اپنا سکہ جمانے کی جبلت، یہ تمام جبلتیں خلقی ہیں لیکن ایک شخص میں ان خواہشات اور جبلی جذبات کی قوت اور ان کی نشوونما کا زیادہ تر دارومدار اس کی غذا اور اس کے ماحول اور تجربات پر ہے۔"[7]

انسان کی ذاتی اور موروثی صفات اگرچہ ایک مستحکم حیثیت رکھتی ہیں مگر ان صفات کی نشوونما میں مقامی ماحول یا حالات سے لے کر عالمی حالات، واقعات، حادثات اور ماحول کا اثر بھی موجود ہوتا ہے۔ یہ حالات، واقعات اور حادثات اور ماحول انفرادی سطح سے لے کر اجتماعی سطح تک اور قومی اور ملی سطح سے لے کر عالمی سطح تک کا ہو سکتا ہے۔ آج کا انسان جہاں دور حاضر کے پے در پے رونما ہونے والے فائدہ مند عوامل سے متاثر ہو رہا ہے وہی یہ انسان تسلسل کے ساتھ رونما ہونے والے انسانی المیوں کی آگ میں بھی جلتا ہوا نظر آتا ہے۔ دور حاضر میں نفسیاتی، جسمانی اور روحانی لحاظ سے انسان بہت زیادہ تکلیف میں مبتلا ہو چکا ہے۔ ان تکالیف کی نوعیت جہاں جدا جدا ہے وہی ان کے اسباب کی نوعیت بھی الگ الگ ہے۔ دنیا کے اس عروج کے دور میں جہاں انسان نے اپنی قابلیت سے بہت سے نئے افلاک کی دریافت کی ہے وہیں ہماری دنیا میں ہسپتالوں اور شفا خانوں میں لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم جتنے متمدن ہوئے اتنے ہی ذہنی اور جسمانی عارضوں کا شکار بھی ہوئے ہیں۔ یعنی انسان کی ترقی انسان کی نجات کے ساتھ اس کی ہلاکت کا باعث بن رہی ہے۔

اس بات پر اب کسی قسم کی بحث یا دلیل کی ضرورت نہیں کہ انسانی نفسیات رونما ہونے والے واقعات سے متاثر ہوتی ہے یا نہیں۔ نفسیات دان بے شمار تجربات اور تھیوریز پیش کر چکے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک معمولی دکھنے والا واقعہ بھی بعض اوقات کسی انسان کے تمام تر نفسیاتی ڈھانچے کو بری طرح متاثر کر جاتا ہے۔ یاد رہے کہ ایک انسان کا نفسی شعور ہوتا ہے اور ایک ذہنی شعور، نفسی شعور وہ ہوتا ہے جو انسان کی ذات کے ساتھ منسلک ہو اور ذہنی شعور نفسی شعور کے تابع مختلف عوامل سے متاثر ہوتا رہتا ہے اور یہ عمل انسان کی ساری زندگی جاری رہتا ہے نفسیات کا تجزیہ انسان کے ذہنی شعور سے ہے اور ذہنی شعور تحت الشعور اور لاشعور پر انحصار کرتا ہے۔ بہت ساری چیزیں انسان کی موجودہ یاداشت سے ہوتی ہوئی تحت الشعور اور پھر وہاں سے لاشعور کے نہاخانوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات انسان کسی بہت پہلے گزرے حادثے کی وجہ سے بہت دیر کے بعد متاثر ہونا شروع ہو جاتا ہے یا بعض اوقات کوئی حادثہ اسے فی الفور متاثر کر کے کسی نفسیاتی عارضے میں مبتلا کر دیتا ہے۔ انسان ابتدا ہی سے کچھ بیرونی اور کچھ اندرونی عوامل سے متاثر ہوتا چلا آرہا ہے یہ عوامل وقت کے ساتھ ساتھ اس کے شعور سے ہم آہنگ ہو کر اس کے نفسی شعوری ڈھانچے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ بے شمار ایسے واقعات انسانی زندگی میں گزرتے ہیں جو مختلف صورتوں میں انسانی شخصیت، مزاج ۔سوچ اور رویے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ یعنی دوسرے لفظوں میں ماحول اور اس کے دیگر عناصر انسان کے ذہن کو ہر صورت میں کسی نہ کسی طور متاثر کرتے ہیں۔ یہ اثرات جہاں مثبت ہوتے ہیں وہیں یہ مضمرات کی صورت میں بھی ظاہر ہوتے ہیں، یہ مضمرات کم یا زیادہ شدید نوعیت کے ہو سکتے ہیں۔

ماہرین نے مختلف شدید حادثوں اور کیفیتوں سے دوچار ہونے والے انسانوں کی نفسیاتی صورتوں کو مد نظر رکھ کر ٹراما یا صدمے کی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ ایک انسان کسی حادثے کے حوالے سے کس طریقے سے رد عمل کرتا ہے؟ وہ اس کی اپنی فطرت، مزاج اور نفسیاتی صحت پر منحصر ہے۔ ہر انسان کی کسی بھی سانحے کے حوالے ردِ عمل کی نوعیت کیفیت اور مقدار الگ الگ ہو سکتی ہے۔ ان سب کیفیات کے لیے ماہرین نفسیات نے الگ الگ نام اور ان کی خصوصیات بتائی ہیں۔ عموماً کسی بھی ذہنی تناؤ یا صدمے وغیرہ کے لیے ماہرین نفسیات لفظ ٹراما استعمال کرتے ہیں۔ کوئی فرد اگر کسی غیر معمولی واقعے، حادثے یا تجربے سے گزرے تو وہ ایک خاص نفسیاتی عارضے کا شکار ہو سکتا ہے۔ یہ نفسیاتی عارضہ یا تو ایک دم ظاہر ہوتا ہے یا اس کے ظاہر ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے، بہر حال کوئی ایسی صورت حال جو انسانی دماغ، جذبات اور احساسات کو بری طرح متاثر کرے تو اسی کو ٹروما کی ابتدا کہا جاتا ہے۔ ٹراما یا صدمہ ایک ایسی کیفیت ہے جس میں انسان ذہنی طور پر شدید

خلجان یا ہجان کا شکار ہو جاتا ہے۔ ٹراما جسے اردو میں صدمہ کہا جاتا ہے دو طرح سے وقوع پذیر ہو سکتا ہے، ایک عین اس وقت جب کوئی انسان کسی غیر معمولی حادثے کو دیکھ رہا ہو یا اس سے گزر رہا ہو، دوران حادثہ یا دوران مشاہدہ، انسان اس غیر معمولی صورتِ حال سے ایک دم گھبرا جاتا ہے اور وقتی طور پر بے ہوش ہو جاتا ہے یا سکتے میں چلا جاتا ہے اور اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اگر تو انسان حادثے کی کچھ مدت بعد سخت ذہنی تناؤ والی کیفیت سے باہر آجائے تو یہ ٹراما کی ابتدائی صورت ہوتی ہے مگر یہاں ایک اور صورت حال بھی بہت اہم ہے کہ انسان وقتی طور پر کسی شدید صورت حال سے نکل تو آتا ہے مگر وہ حادثہ یا واقعہ اس کے دماغ کے اندر آہستہ آہستہ پختہ ہونا شروع ہو جاتا ہے اور بالاخر وہ ایک ذہنی عارضے کا شکار ہو کر رد عمل ظاہر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ حادثے کے بعد انسانی ذہن کی صورت حال بدلنے کے پروسیس کو پوسٹ ٹرومیٹک سٹریس ڈس آرڈر کہا جاتا ہے۔ ٹرومے کے وقوع پذیر ہونے کے حوالے سے انسان کی صحت عمر اور جنس وغیرہ کا بھی اہم کردار ہوتا ہے ۔ضروری نہیں کہ انسان کو کوئی صدمہ کسی حد سے گزرنے یا کسی حادثے کے مشاہدے سے پیدا ہو، انسان بے شمار خواہشات اور جذبات و احساسات کا مرقع ہوتا ہے اور ایک جذباتی انسان اپنی خواہشات یا احساسات کے حوالے سے بہت زیادہ حساس واقع ہوتا ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہماری بے شمار خواہشات پوری ہونے سے قاصر رہتی ہیں، ایسے میں ہمارے دماغ یا ذہن پر ایک تصادم کی کیفیت نمودار ہوتی ہے جو سخت جذباتی صدمے یا ٹراومے کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ شید احمد اپنی کتاب "ہماری نفسیات" میں اس حوالے سے لکھتے ہیں

> "ہر شخص کی زندگی کے ساتھ اندرونی اختلافات لگے رہتے ہیں کچھ اختلافات جزوی امور میں ہوتے ہیں جن کا تصفیہ کرنے میں دیر نہیں لگتی لیکن بعض اختلافات یا تصادم بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جو ہماری زندگی کو ہی دھرم بھرم کر دیتے ہیں ہمارے سکون و اطمینان پر ضرب کاری لگاتے ہیں ہماری صحت کو تباہ اور ہماری قابلیت کو ملیا میٹ کر دیتے ہیں یہ اختلافات ہفتوں مہینوں اور سالوں میں ہمیں پریشان کیے رکھتے ہیں"[8]

انسانی رویے نہایت پیچیدہ رہے ہیں۔ اسی لیے انسانی رویوں اور انسانی نفسیات کو سائنسی علم قرار دے کر اس پر سائنسی اپروچ سے تحقیق جاری ہے جو اب ایک پختہ تحقیق کے ساتھ بہت ساری نفسیاتی الجھنوں کا

تجزیہ کر کے حل پیش کر چکی ہے۔ صدمہ یا ٹراما انسان کی اندرونی کش مکش کا نتیجا ہو یا بیرونی عمل کا نتیجا، بہر حال انسان کے لیے ایک سخت ترین صورت حال کا موجب ہو سکتا ہے اور اس کا انجام انسان کی مکمل ذہنی اور جسمانی تباہی کی صورت میں نکل سکتا ہے۔

ج۔ ٹراما کیا ہے؟ معنی اور مفہوم:

ٹراما یونانی لفظ ہے جس کا مطلب ہے "زخم" پہلے پہل یہ یونانی لفظ ٹراما صرف جسمانی زخم کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، مگر اب ٹرومے کا لفظ زیادہ تر کسی ذہنی روحانی یا جذباتی صدمے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی قسم کے ٹرومیٹک حادثے انسانی نفسیات پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں جو جسمانی زخم ٹھیک ہو جانے کے باوجود بھی انسانی نفسیات میں جاری رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب ماہرین ٹرومے کی اصطلاح کو نفسیاتی، جذباتی ،ذہنی اور روحانی صدمات کے طور پر لیتے ہیں۔ کیمرج ڈکشنری کے مطابق ٹراما سے مراد ہے۔

"Severe lasting emotional shock and pain caused by an extremely upsetting experience" [9]

یعنی ٹرومے کا لفظ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کوئی فرد یا افراد مختلف حادثات، حملوں یا دیگر ناگوار کیفیات کی وجہ سے پیدا ہونے والی ذہنی یا جسمانی الجھنوں اور صدموں وغیرہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کسی خوفناک یا الم ناک سانحے سے ایک انسان گزرے تو اس کے ہوش و حواس پر اس سانحے یا حادثے کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس حادثے یا واقعے کے دوران انسان کو ہر شے اپنے قابو سے باہر ہوتی ہوئی محسوس ہو سکتی ہے۔ ٹرومے یا صدمے کے لیے ضروری نہیں کہ انسان خود کسی حادثے یا سانحے سے گزرے، وہ کسی خوفناک سانحے کو دیکھ کر بھی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو سکتا ہے۔ کوئی شخص سنگین حالات میں اپنے آپ کو جتنا بے بس اور مجبور سمجھے گا اتنا ہی زیادہ امکان ہے کہ وہ کسی خاص قسم کے صدمے یا ٹرومے کا شکار ہو جائے۔ اس ٹرومے کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں مثلا کوئی حادثہ یا چوٹ پُر تشدد واقعہ یا بچپن میں کوئی غیر معمولی حادثہ وغیرہ، یہ وہ چند اسباب ہیں جو انسان کو ایک نارمل رویے سے کسی پیچیدہ صورت کی طرف لے جاسکتے ہیں۔ ٹرومے کے حوالے سے آج تک کوئی واضح اور دوٹوک تعریف تو نہیں آئی البتہ ٹرومے کی مختصر اور واضح تعریف یوں کی جاسکتی ہے

"جب کوئی فرد بہت دباؤ، خوفناک یا پریشان کن واقعے یا واقعات کے تسلسل کا سامنا کرتا ہے اور ان کے مقابلے میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے"

ایک اور طریقے سے ٹراما کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے

"ٹراما کسی خوفناک واقعے یعنی حادثے، عصمت دری یا قدرتی آفت کے دوران جذباتی یا شدید صدماتی رد عمل ہے"

کسی صدماتی کیفیت کا سامنا کرنے والے فرد کا فوری رد عمل جو ہو سکتا ہے وہ سکتہ یا ہوش و حواس کا کھو جانا ہے۔ لیکن طویل مدتی صورت میں کسی بھی فرد کے اندر جذبات کا انتشار یا ماضی کی یادوں میں گم ہو جانا کے ساتھ ساتھ سر کا درد، کپکپاہٹ، بے حسی یا متلی جیسی نقصان دہ علامات ظاہر ہو سکتی ہیں۔ یعنی ٹراما انسان کے دل و دماغ سمیت اسے جسمانی عارضوں میں بھی مبتلا کر سکتا ہے۔

یہ دکھ اور صدمے جسمانی اور روحانی تکلیف کا باعث ہوتے ہیں جن کے علاج کے لیے باقاعدہ کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔ اکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق ٹروما سے مراد ہے

"A physical injury or wound or a powerful psychological shock that has the damaging effects."[10]

کالیبر پی ائی (ماہرِ نفسیات) اپنے ایک مضمون ٹراما اینڈ پبلک مینٹل ہیلتھ اے فوکس ریویو میں لکھتے ہیں

"The word trauma drive from Greek word for wound or hurt mental health. Psychological trauma has since become more broadly defined as an experience that is subjectively perceived as painful or distressing and results in acute or chronic mental and physical impairment or daysfunction."[11]

وقت کے ساتھ ساتھ ٹراما اپنی ابتدائی شکل سے نکل کر مزید تباہ کن صورت حال اختیار کر سکتا ہے اس حوالے سے سینڈرا بلوم اپنی کتاب میں لکھتی ہیں

"Stress and trauma affect everyone, and the earlier it starts in life, the longer it lasts, the more frequently it happens and the more distrust develops."[12]

ٹراما کی ایک اور معقول تعریف جو ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ

"ٹراما ایک تادیر رہنے والا جذباتی رد عمل ہے جو اکثر کسی تکلیف دہ حادثے یا واقعے کے دوران یا واقعے سے گزر جانے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ ایک صدماتی واقعے سے گزرنے کا تجربہ ایک انسان کے احساسِ تحفظ ،ادراکِ ذات اور جذبات کو کنٹرول کرنے کی قابلیت کو بری طرح مسخ کر سکتا ہے"

ٹراما فوری طور پر متاثرہ فرد کے اعصابی نظام کو منتشر کرتا ہے اور اس کی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کو روک دیتا ہے۔

ایک بھارتی ماہر نفسیات پریتی بالا شرما اپنے ایک آرٹیکل

Trauma studies: an Echo of ignored screams

میں لکھتی ہیں

"Trauma is an emotional response to a disastrous event like an accident, natural disaster or abuse. The immediate reaction to such situation is of shocks and Denial, but in long term individuals may face unpredictable emotions flashbacks and physical symptoms like headaches, tremor, numbness or nausea."[13]

انسانی رویوں اور نفسیاتی حرکات و سکنات پر تحقیق اگرچہ بہت پہلے شروع ہو چکی تھی مگر اصطلاح" ٹراما" پہلے پہل جسمانی زخم کے لیے ہی استعمال ہوتی رہی۔ 19 ویں صدی کی پہلی دو دہائیوں تک ماہرین نفسیات انسان کی دماغی بیماریوں کے لیے جس سوچ کے ساتھ تحقیق کر رہے تھے وہ تھا ہسٹیریا۔ انسان کی ذہنی الجھنوں کے لیے ہسٹیریا کا لفظ بہت عرصے تک استعمال ہوتا رہا ہے۔ مگر 18 میں ماہرین یا ڈاکٹرز نے ایک ریل گاڑی کے حادثے میں زخمی ہو جانے والے افراد کا جب علاج شروع کیا تو انہیں ان افراد کے حوالے سے یہ انکشاف ہوا کہ وہ ایک خاص نفسیاتی الجھن میں مبتلا ہیں۔ ان کے اندر غیر معمولی نفسیاتی اور اعصابی تناو کو ریکارڈ کیا گیا۔ حادثے کے شکار بچ جانے والے ان افراد کے حوالے سے ایک نفسیاتی مطالعہ شروع ہوا جو آگے چل کر

ٹروما کو جسم سے زیادہ انسانی جذبات و احساسات اور ذہنی اشتکالات سے منسلک کرنے میں مدد گار ثابت ہوا۔

ٹراما کے مطالعے کے حوالے سے ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ٹراما کے خصائص اور اس کی نوعیت اور کیفیت کے حوالے سے میڈیکلی مطالعہ اور جائزہ بہت بعد میں شروع ہوا اس کے آثار و مباحث ہمیں پہلے لٹریچر میں ملتے ہیں۔ کچھ ماہرین تو ٹروما کے آثار اور مباحث کو قبل مسیح کے دور سے جوڑتے ہیں، پرانی رزمیہ نظموں اور کہانیوں کے اندر ٹروماٹک اسٹریس جیسے بہت سے کردار اور افکار پائے جاتے ہیں اگرچہ ان کا ذکر اج کے اس پہلو میں نہیں تھا جس میں آج ٹروما کو لیا یا سمجھا جارہا ہے یا جس کی تعریف آج کے نفسیات دان کرتے ہیں اس حوالے سے چارلس اور اس کے معاون ایمے بریان کا کہنا ہے

"Hard as it may be to believe, psychological trauma did not always exist- at least in the way it is understood in that 21st century. Despite receiving explicit recognition only in relatively recent times, human being, throughout history, likely always have suffered psychologically as a result of tragedy, disaster, violence and loss."[14]

اسی کے بعد چارلس اور اس کا معاون ٹراما کے لٹریچر میں ظہور کے حوالے سے اپنی رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

"The greatest source of detailed accounts of these reactions before the 19th century is found not in medical at documents but in literature and religious texts.[15]

بن ایزرا ٹراما کے نقوش کی دریافت 4 ہزار قبل مسیح سے کرتا ہے۔ شہر اُور کے کھنڈر سے دریافت شدہ کتبوں سے حاصل معلومات کے مطابق ان میں ایسے واقعات درج ہیں جن پر پوسٹ ٹروماٹکس سٹریس کے آثار مل جاتے ہیں۔ چارلس محقق بین ایزرا کے حوالے سے میں لکھتے ہیں

"Ben Azra argued that first documented account of postromantic reactions was recorded on cuneiform tablets from

ancient summer more than 4000 years ago, some of these tablets contain a narrative of the death of king ornament in combat and destruction of the city of ur."[1]

اس کے بعد ایک یونانی مصنف ہیروڈوٹس نے 440 قبل مسیح کے کچھ آثار لٹریچر میں دریافت کیے اور پوسٹ ٹرمیٹکس اسٹریس کی کچھ مثالیں پیش کی اس نے یونان کی کچھ جنگوں کے احوال کا مطالعہ کر کے ان عناصر کو پیش کیا تھا جن کا تعلق صدمے، خوف اور ڈر سے ہے جدید ٹراما کے تصورات کا آغاز 19 ویں اور بیسویں صدی میں ہوا۔ ٹراما کو جذباتی اور نفسیاتی صدمات کے معنوں میں استعمال کرنے کے حوالے سے ماہر نفسیات چارلس کا کہنا ہے۔

"Reflecting its etymological origins, the term trauma has been used in medicine since at least the last 17th century to describe physical injuries inflicted from an external source or accident" [17]

ٹراما کا بطور تھیوری آغاز بہر حال 1990 کے بعد شروع ہوا جس کی بنیاد فرائیڈ کے ٹراما کے وضع کردہ ماڈل پر رکھی گئی۔ زبان و ادب میں ٹراما کی پیش کش اور معقول انداز سے اس کا بیان 90 کی دہائی کے بعد ہی شروع ہوا۔

البتہ ٹراما کی طرف مطالعے کا باقاعدہ آغاز فرائیڈ کے نفسیات کے حوالے سے پیش کیے گے نظریات کے بعد شروع ہوا۔ انیسویں صدی میں جب ہیسٹیریا کے مریضوں کی نفسیات پر تحقیق شروع ہوئی تو یہی سے میڈیکلی ٹراما کے ابتدائی نقش ابھرنا شروع ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے مائیکل بیلیو اپنے تحقیقی مقالے میں لکھتے ہیں۔

"Freud's theories on traumatic experience and memory define the psychological concepts that guide the field. Psychoanalytic theories regarding the origins and effects of trauma arose in the nineteenth century study of shock and hysteria by researchers who, in addition to Freud, Freud early theories in studies on

Hysteria written with Joseph Breuer, and especially his adapted theories later in his career in Beyond the Pleasure Principle."[18]

فرائیڈ اور اس کی ٹیم نے ہیسٹریہ پر کام شروع کیا جو آگے چل کر ٹراما کے مطالعے کے لیے ایک بنیاد بن جاتا ہے۔ ایک اور فرانسسی نیورالوجسٹ جین مارٹن چارکوٹ نے بھی اپنے ہسپتال میں مریضوں کے نفسیاتی مطالعے کے دوران دماغی صدمے کے آثار کو نوٹ کیا اور ہسٹیریہ اور ٹراما کے فرق کو محسوس کیا۔ چارلس فگلے اور ان کے معاون محقق اپنی ایک تحقیق میں لکھتے ہیں۔

"Charcot connected the presenting issues of patients with hysteria with their psycho-social histories. Indeed, Charcot saw the symptom similarities in hysterias manifested by survivors of diverse types of traumatic events"[19]

آگے چل کر کیتھی کراؤتھ اور اس کے ہم عصر لوگوں نے ٹراما کے مطالعے کو آگے بڑھایا۔

د۔ ٹرومے کی نوعیت، کیفیت:

ٹراما بعد از حادثہ، جنگ یا تباہی، کس طرح انسانی ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے؟ اور کس طرح نہایت تکلیف دہ واقعات ذہن میں خاص عرصے کے بعد دوبارہ جنم لیتے ہیں؟ اور ایک فرد کو کن کن نفسیاتی المیوں یا صدموں کا تجربہ کرنا پڑتا ہے؟ اس سب پر ایک ماہر نفسیات کیتھی کراؤتھ نے 1995 میں اپنے ایک مفصل کام

"Trauma: exploration in memory" میں بیان کیا ہے وہ لکھتی ہے

"It can be described as, an overwhelming experience that is related to an event of sudden or catastrophe nature, adding that the response on the part of the individual who is going through it.[20]

کراؤتھ کا کہنا ہے کہ صدمہ اس زبردست تجربے کے طور پر بیان کیا جا سکتا ہے جس کا تعلق ایک اچانک اور تباہ کن نوعیت کے واقعے یا حادثے کے ساتھ ہوتا ہے. اس حادثے یا تباہ کن سانحے سے گزرنے

والے فرد کا رد عمل عموماً تاخیر سے ہوتا ہے مگر بہت زبردست ہوتا ہے۔ ایک انسان جو کسی بڑے حادثے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہوتا اور اسے اچانک کسی غیر متوقع اور ہولناک صورت کا سامنا کرنا پڑے تو رد عمل فلیش بیک، گھبراہٹ، مایوسی اداسی، فرار، اور شناخت کے کھو جانے کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ کوئی فرد بھی جو کسی حادثے کا شکار ہوتا ہے بنیادی طور پر دو ٹراموں سے گزرتا ہے ایک حادثے کے بالکل دوران اور دوسرا بعد از حادثہ، دیر سے کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہونا بعد از حادثہ یا وقوعہ انسان کے ذہن اور رویے پر پائے جانے والے اثرات کے لیے ماہرین نفسیات نے ایک اصطلاح پوسٹ ٹرومیٹک اسٹریس ڈس آرڈر (پی ٹی ایس ڈی) وضع کی ہے۔

ایک امریکن ماہر نفسیات وین ڈیئر کالک جس کا ٹراما سٹڈیز پر بہت زیادہ کام ہے ٹراما کے حوالے سے لکھتا ہے۔

> "The essence of psychological trauma is, the loss of faith that there is order and continuity in life. Trauma occurs when one loss the sense of having a self-place to retreat within or outside, one self to deal with frightening emotions or experiences."[21]

یعنی نفسیاتی صدمے سے مراد اس یقین کا کھو جانا ہے جس سے زندگی میں ایک ترتیب اور استحکام پیدا ہوتا ہے۔ ٹراما اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک انسان کسی خوفناک جذبے یا تجربے سے نمٹنے کے لیے اپنے اندر یا باہر کسی محفوظ جگہ کا احساس کھو جائے۔ اس تعریف سے ایک اور اہم نقطہ سامنے اتا ہے جو تقریباً سب ماہرین نفسیات کی کی گئی تعریفوں کا مرکزی لفظ ہے وہ یہ کہ انسان ٹرومے میں اپنی شناخت کھو جاتا ہے۔ یہی وہ بنیادی نقطہ ہے جو انسان کو ایک نارمل فرد سے ایک ابنارمل صورت کی طرف لے جاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ کہ ٹرومے سے متاثرہ شخص ذاتی طور پر کسی حادثے یا المیاتی صورت حال سے گزرے وہ اپنے کسی قریبی رشتہ دار دوست وغیرہ کی غیر معمولی سخت کیفیت کو دیکھ کر بھی نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو سکتا ہے۔ غیر متوقع یا پُر تشدد موت یا چوٹ وغیرہ بھی انسان کے ذہنی میکنزم کو اتھل پتھل کر سکتے ہیں۔ ٹراما یا صدمے کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔ ٹراما اپنی نوعیت کیفیت اور اثر کے لحاظ سے مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے۔ یہاں ٹرومے کے اسباب کا ذکر کرنا مناسب ہے تاکہ ٹرومے کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھا جا سکے۔

ہ۔ ٹراما کے اسباب

ہر عمل کی وجہ سے رد عمل ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی صداقت ہے جو تقریباساری کائنات میں وجود رکھتی ہے۔ بل کہ شاید اس کائنات کا وجود بھی کسی حد تک عمل اور رد عمل کے تابع ہے۔ مگر کچھ عمل اور ردِ عمل انسانی مزاج اور فطرت کے لحاظ سے فی نفسہ مضر ہو سکتے ہیں اور بالخصوص جب بات انسانی ذہن اور اس پر دباؤ ڈالنے والے اسباب کی ہو تو نتیجا مثبت کی بجائے منفی بھی ہو سکتا ہے

i۔ قدرتی آفات

روز اول ہی سے انسان اپنی بقا کی جنگ لڑتا چلا آرہا ہے۔ اس کی بقا کی ان کوششوں کا ایک بڑا حصہ اسے اپنے ماحول اور ماحول کے اثرات سے بچنے پر صرف کرنا پڑتا رہا ہے۔ انسان نے غار سے نکل کر متمدن زندگی کا سفر شروع کیا تو ساتھ ہی اسے ماحول موسم اور قدرتی آفات سے مقابلہ کرنا پڑا۔ قدرتی آفات میں زلزلے، طوفان، سیلاب، آگ، قحط، برفانی تودے اور سمندری طوفان وغیرہ شامل ہیں۔ یہ خوفناک صورتیں انسان کو مکمل طور پر لاچار کر کے بے بس کر دیتی ہیں۔ ان قدرتی آفات کی وجہ سے موت کا رقص ہو یا پھر بھوک، ننگ اور پیاس کی کیفیات، انسان کے جذبات و احساسات بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ قدرتی آفات سے سب نظام زندگی مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان سنگین صورتوں میں انسان اپنی بقا کے لیے شدید کوششوں میں برسرِ پیکار ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی محدود اور جلدی تھک جانے والی اور خوفزدہ ہو جانے والی فطرت اسے کسی نہ کسی ذہنی عارضے میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ان آفات سے متاثر ہونے کے دو اہم پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ لوگ براہِ راست ان آفات کا سامنا کریں اور شدید نقصانات اٹھائیں جیسا کہ املاک کا تباہ ہو جانا، گھروں کا گر جانا، اموات کا ظاہر ہونا یا زخمی ہونا۔ ان صدماتی کیفیات سے انسان ذہنی اور جسمانی طور پر بری طرح متاثر ہوتا ہے لہذا اس صدماتی فضا میں وہ ایک کرب اور دکھ کو محسوس کرتے ہوے ٹروما کی مختلف حالتوں میں سے کسی ایک یا بہت سی حالتوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ قدرتی آفات سے متاثر ہونے کی دوسری وجہ یا دوسرا پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ کسی آفت یا حادثے کے جو ثانوی اثرات ہوتے ہیں وہ انسان کو متاثر کریں۔ یعنی یہ کہ کسی آفت کے براہ راست اثرات کے بعد دوسرے درجے کے وہ غیر یقینی حالات ہیں جو انسانی آبادیوں کو وسیع پیمانے پر متاثر کرتے ہیں۔ انسانی حالات و واقعات یا صدمات میں غذائی قلت، زخمیوں کے لیے علاج معالجے کا نہ ہونا، کاروبار کا تباہ ہو جانا، وبائی امراض کا پھوٹ پڑنا، رہائش گاہوں کا ختم ہو جانا اور بے روزگاری کے ساتھ ان افراد کی وہ

قابل رحم صورت حال ہے جو کسی آفت کے زیر اثر پیدا ہوئی ہو۔ یہاں ایک اور نفسیاتی صورت حال بھی بعض اوقات پیدا ہو جاتی ہے کہ اس وسیع پیمانے پر تباہ ہونے والے علاقے میں آنے والی امدادی ٹیموں کے ممبران بھی اگر طویل عرصے تک ایسی جگہ قیام کریں تو وہ بھی ان آفتوں کے آفٹر شاکس سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی کسی نہ کسی پریشانی کا سامنا کرتے ہیں۔ مشاہدہ بذات خود انسان کے حواس پر موثر اثرات مرتب کرتا ہے۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ قدرتی آفات ہمہ گیر انداز سے نہ صرف انسانی زندگی بل کہ انسانی نفسیاتی ڈھانچے کو بھی متاثر کرتی ہیں۔ ٹراما اور اس کے تناؤ کے حوالے سے تحقیقاتی ادارہ "انٹرنیشنل سوسائٹی فار ٹرومیٹک اسٹریس سٹڈیز" اپنی ایک رپورٹ میں قدرتی آفات کی درجہ بندی کرتے ہوئے لکھتا ہے

"Disasters commonly occurs. They may be caused by nature, including earthquakes, floods, wildfire, tornadoes. In addition, disaster maybe human- made caused by people through mishap or neglect, often large number of people are affected and this share their experiences of trauma and traumatic loss. Many losses are occurred after natural or man-made disaster, including loss of love ones, work place, School, houses possessions and communities. Survivors may also lose their routine way of living and working. Some loss their confidence in the future.[22]

i. ii باہمی تشدد یا جنگیں

جنگ کیا ہے اور کس طرح سب نظامِ زندگی کو مفلوج کر دیتی ہے اس کا ذکر تو آگے آئے گا مگر ہم یہاں مختصر الفاظ میں جنگ کے مفہوم کو ضرور سمجھنا چاہیں گے انسائیکلوپیڈیا کے مطابق جنگ کا مطلب ہے

Any struggle in which two large groups try to destroy or conquer each other is a war"[23]

قدرتی آفات کے بعد دوسرے نمبر پر انسان کو متاثر کرنے والے خود انسان ہیں۔ باہمی تشدد، مار پیٹ، قتل و غارت گری اور جنگیں ٹروما کے لیے وہ ساز گار پیداواری صنعتیں ہیں جو بڑے پیمانے پر انسانی زندگیوں کی پامالی کا سبب ہیں۔ انسانی تاریخ ایسی ہزاروں مثالوں سے بھری پڑی ہے جن میں ایسی جنگوں، فتنوں

اور خون ریزیوں کا ذکر ہے جنہوں نے انسانی نظامِ حیات کے ساتھ ساتھ انسانی اذہان کو بھی بری طرح متاثر کیا ۔ دنیا نے ترقی کے جو سفر کیے ہیں دراصل ان سفروں میں بے انتہا سفاکانہ جنگوں کا بھی ایک حصہ رہا ہے ۔ حضرت انسان جو اس زمین پر تقریباً سب سے آخر میں آ،نے والی مخلوق ہے مگر اس مخلوق نے ہر دو پہلو یعنی مثبت اور منفی لحاظ سے اس زمین اور اس کے ماحول اور یہاں تک کہ یہاں کی تمام تر آب وہوا کے ساتھ ساتھ خود اپنی نسل پر بھی بے پناہ اثرات مرتب کیے ہیں۔ خوب سے خوب تر کی تلاش بذاتِ خود ایک اعلا صفت ہے مگر اس صفت یا خواہش میں جب جنون اور دیوانگی شامل ہو جاتی ہے تو یہیں سے مسائل جنم لینا شروع ہوتے ہیں۔ انسان نے اس جنون اور دیوانگی میں اپنے جیسے ہزاروں لاکھوں انسانوں کو بے دریغ موت کی وادیوں میں دھکیلا اور بظاہر اپنے فتوحات کا جھنڈا گاڑا لیکن یہ فتوحات کبھی خون سے بغیر ممکن نہیں رہی۔ لہذا بالکل سادہ لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ جنگیں، تشدد، دہشت گردی دراصل انسان کی وہ خونی صفتیں ہیں جنہوں نے انسانی بستیوں، آبادیوں کے ساتھ ساتھ انسانی ذہنوں میں ہزاروں طرح کے مسائل کو جنم دیا۔ علاقوں کے علاقے اس خون خرابے، تشدد، جنگ اور دہشت گردی کی بھینٹ چڑھتے رہے، کروڑوں انسان ان جنونی اقدامات کی قیمت ادا کرتے رہے اور لاکھوں بچ جانے والے لوگ بے شمار نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو کر زندہ رہے۔ اس کرہ ارض پر لفظ امن بنیادی طور پر کبھی بھی اپنے پورے مفہوم یا پوری تفہیم کے ساتھ نافذ نہیں رہا۔ اس زمین پر کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی وقت ایک طبقہ، گروہ یا ملک جنگ و قتال ظلم و دہشت میں مصروف رہا۔ لہذا ہم امن کے مکمل مفہوم سے ہمیشہ نا آشنا ہی رہے ہیں۔ جہاں کہیں بھی انسانی آبادیاں رہی، ان میں کسی نہ کسی سطح پر تصادم زیرِ کار رہا ہے۔ یہی تصادم المیہ بن کر کبھی تاریخ کا حصہ بنتا رہا ہے اور کبھی انسانی نسلوں میں ایک صدما (ٹراما) ایک کرب، ایک دکھ اور تکلیف بن کر رواں دواں رہا ہے۔ اس تصادم کے مثبت پہلو سوائے اس کے کچھ نہیں رہے کہ انسانوں کو اپنی بقا کے لیے نئے نئے تجربات، علوم اور ٹیکنیکس کو اختیار کرنا پڑا۔ یہی آج کی متمدن زندگی کا راز ہے۔ فرائیڈ نے اس تمام ہست و بود کی بقا دو متضاد قوتوں یعنی حیات اور موت کے درمیان تصادم کا نتیجا قرار دی ہے مگر یہ تصادم جب جب خطرناک صورت اختیار کرتا رہا انسانی علمیے جنم لیتے رہے قاسم یعقوب اپنی کتاب اردو شاعری میں جنگوں کے اثرات میں انسانوں کی فطرت کے حوالے سے ایک ماہر نفسیات کا قول لکھتے ہیں۔

"Human beings specially men are inherently violent"[24]

جنگوں کے محرک مذہبی رہے ہوں یا سماجی ، جنگیں اپنے ساتھ ان گنت صدمات کا طوفان لاتی ہیں۔ تمام تر پُر تشدد واقعات کے دوران یا ان کے بعد ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے المیے انسانی زندگیوں کو پوری طرح متاثر کرتے رہے ہیں۔ لہذا انسانی نفسیاتی ڈھانچہ ان اثرات سے صدمات کا شکار ہو کر مختلف انواع کے ذہنی مسائل کا شکار ہوتا رہا ہے۔ بڑے بڑے ٹراما سینٹرز سے جاری اعداد و شمار نے متاثرہ علاقوں یا ملکوں کے بارے میں بہت خوفناک صورتِ حال کو واضح کیا ہوا ہے۔

iii۔ نقل و حمل کے حادثات

پُر تشدد واقعات یا جنگوں کے ساتھ ساتھ انسان قدرت کی طرف سے آنے والے حادثات سے بھی صدموں کا شکار ہوا ہے اور یہ حادثات یا سانحات انسان کے ساتھ روز اول ہی سے جڑے چلے آرہے ہیں۔ ذرائع نقل و حمل میں فی زمانہ ترقی ہوتی رہی ہے اور آج کا دور جہاں دیگر جہات کے حوالے سے ترقی کی انتہاؤں پر ہے وہیں ذرائع نقل و حمل میں بھی جدید ترین طریقوں کا استعمال عرصہ دراز سے شروع ہو چکا ہے۔ انسان نے اپنی سہولیات کے لیے جو جو ایجادات کی ہیں وہ ایک طرف تو اس کی زندگی کو نہایت آسان بنانے کے کام آرہی ہیں وہی دوسری طرف خود انسان کی زندگی کے لیے کسی وقت بھی نازل ہو جانے والی آفت کے طور پر منڈلاتی رہتی ہیں۔ ہوائی جہاز ہوں یا ٹرین، سمندری جہاز ہوں یا زمینی گاڑیاں یا بسیں وغیرہ، حادثات آئے روز ایک نئے صدمے کے طور پر ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اکثر حادثات میں الم ناک اموات ہوتی ہیں اور یہ بڑے پیمانے پر انسانوں کو متاثر کرتے ہیں۔ مر جانے والے تو چلے جاتے ہیں مگر ان حادثات میں بچ جانے والے اکثر اوقات ایک تناو کی سی کیفیت سے دوچار رہتے ہیں۔ حادثے کے بعد ان کے دماغ کے اندر خلل پیدا ہو جاتا ہے جسے ماہرین ٹروما کا نام دیتے ہیں۔ ماہرین نفسیات ایسے مریضوں کے لیے ٹراما سینٹر چلاتے ہیں جہاں ان کا علاج کیا جاتا ہے۔

iv۔ آگ

اچانک بھڑک اٹھنے والی آگ جو کسی عمارت، گھر یا علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے تو وہاں کے مقیم افراد سخت اذیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بڑی عمارتوں میں آگ لگ جانے کی وجہ سے بہت سے لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور بہت سے بچ جانے والے دہشت اور خوف میں مبتلا ہو کر قلیل یا طویل عرصے تک کسی ذہنی الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی صورت حال کسی گھریلو آگ کی بھی ہے۔ کسی گھر میں لگ جانے والی

آگ کے نتیجے بھی بھیانک ہوتے ہیں جو موت یا کسی ٹروما کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ آگ سے آنے والی جسمانی یا نفسیاتی چوٹ کا علاج جہاں طویل مدتی ہو سکتا ہے وہیں اس علاج سے گزرنے والے فرد کے لیے یہ صورت حال ایک مسلسل اذیت کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔ جلے ہوئے جسم کا علاج۔ سرجری وغیرہ کے پراسیس سے گزرنے والا فرد ایک عام یا نارمل انسان کی طرح نہیں ہو سکتا کیوں کہ وہ اپنی معذوری کے صدمے کی وجہ سے ایک ٹرومیٹک صورت حال کا سامنا کرتا رہتا ہے۔

v۔ جنسی تشدد

جنسی تشدد جہاں انسان کو جسمانی طور پر زخمی کرتا ہے وہیں یہ تشدد اس کی روح پر بھی کاری ضرب لگاتا ہے۔ جنسی تشدد ہو یا عصمت دری کا جرم، اس کا اطلاق زبردستی کسی کے ساتھ زیادتی کے زمرے میں آتا ہے۔ کسی نوعمر بچے یا بچی کے ساتھ جنسی درندگی اس کے لیے تاعمر کا روگ بن جاتی ہے۔ ایسے بچے کبھی نارمل زندگی بسر نہیں کر پاتے۔ یہاں تک کہ ان کا مناسب اور بہترین علاج نہ کرالیا جائے۔

"جنسی تشدد ایک وسیع اصطلاح ہے جو تشدد کی کارروائیوں کے تسلسل کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ جنسی تشدد کا مطلب یہ ہے کی کوئی شخص کسی دوسرے کو اس کی رضامندی کے بغیر ناپسندیدہ جنسی سرگرمی پر مجبور کرتا ہے یا اس سے جوڑ توڑ کرتا ہے"[25]

جنسیت کی زد میں بڑی عمر کی عورتیں یا افراد بھی آسکتے ہیں جن کے ساتھ زبردستی تشدد سے ناروا سلوک کیا گیا ہو۔ ملکی اور بین الاقوامی اعداد و شمار کے اداروں کی رپورٹس کو دیکھا جائے تو ہر سال کروڑوں افراد مرد عورتیں بچے اس تشدد کا شکار ہو کر ایک گہرے ذہنی جسمانی اور روحانی صدمے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے حادثات سے گزرنا بذات خود ایک نہایت تکلیف دہ امر ہے مگر اس کے بعد پیش آنے والی صورت حال مریض کے لیے کبھی سازگار نہیں رہتی لہذا ٹروما کے عوامل میں جنسی عدم برداشت کی نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔

vi۔ دہشت گردی

دہشت گردی کی تعریف بہت وسیع ہے جس کی ابتدائی صورت کسی سے ناحق اونچی آواز میں مخاطب ہونا ہے اور جس کی شاید حتمی شکل خون خرابہ اور قتل وغارت گری ہے۔ دہشت گردی کسی نہ کسی صورت میں

ہمارے ارد گرد موجود رہتی ہے۔ سیاسی دہشت گردی ہو یا سماجی، مالی دہشت گردی ہو یا جنگی، تمام کی تمام خوف حراس اور دہشت کو پروان چڑھاتی ہیں۔ انسانوں کو عدم تحفظ کا احساس دلاتی ہیں اور ایک انجانے خوف ڈر میں مبتلار کھتی ہیں لہذا نفسیاتی معالج دہشت گردی کو انسانی نفسیاتی بیماریوں کا ایک بڑا اور اہم عنصر تصور کرتے ہیں۔ ویکیپیڈیا کے مطابق دہشت گردی سے مراد ہے

> "خوف ہراس پیدا کر کے اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر ایسا نپا تلا طریقہ کار یا حکمتِ عملی اختیار کرنا جس سے قصور وار اور بے قصور کی تمیز کیے بغیر عام شہریوں سمیت ہر ممکنہ ہدف کو ملوث کرتے ہوے وسیع پیمانے پر دہشت وتکلیف اور رعب و اضطراب ،جسمانی یا نفسیاتی لحاظ سے پھیلایا جائے"[2]

دہشت گردی ایک ہی وقت میں جانی مالی اور ذہنی تکالیف کو جنم دیتی ہے۔ چھری یا چاقو سے حملہ ،بندوق سے حملہ یا کسی اور بڑے اوزار سے کیا گیا حملہ متاثرہ فرد کے لیے سوہان روح بن جاتا ہے اور وہ طویل عرصہ تک خوف، ڈر اور صدمے کا شکار رہتا ہے۔ مابعد نائن الیون دہشت گردی کا جن پوری طرح باہر نکل چکا ہے اور اس کے مضمرات میں ہزاروں، لاکھوں انسان نہ صرف اپنی جانیں گنوا بیٹھے ہیں بل کہ جنگ زدہ علاقوں میں بچ جانے والے لوگوں کی ذہنی، روحانی اور جسمانی کیفیات بھی ناگفتہ بہ ہیں۔ یہاں کے لوگ ذہنی اور جسمانی طور پر اس قدر تناؤ کا شکار ہیں کہ وہ نارمل زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ دہشت گردی نے حالیہ دو دہائیوں میں ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور یہ ایک عالمی چیلنج کے طور پر سامنے آئی ہے یقیناً اس کے جو اسباب بھی ہوں مگر اس کے نتائج بھیانک ہیں اور انسانوں کے لیے تباہ کن ہیں۔

ٹروما کے بے شمار اسباب ہو سکتے ہیں جن میں سے چند ایک جو قابل ذکر تھے بیان کیے گے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی کے ساتھ نفسیاتی بد سلوکی، مسلسل غیر انسانی رویہ۔ چوٹ، زخم، کسی قریبی رشتہ دار کی اچانک موت انسان کے دماغ کو نہ صرف متاثر کرتے ہیں بلکہ اسے صدماتی کیفیات سے بھی دوچار کر دیتے ہیں۔ ان اسباب کی وجہ سے کسی فرد یا افراد کو کس قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے ان میں سے اہم درج ذیل ہیں۔

1۔ شدید جذباتی رد عمل اور صدمے کے احساسات کا بیدار ہونا اور ان احساسات کے نتیجے میں اضطراب، خوف، غم اور ناامیدی کا پیدا ہونا۔

2 ۔ غصہ، ناراضی، غداری اور افسردگی جیسی نفسیاتی الجھنیں۔

3- توجہ مرکوز کرنے میں مشکل، یاداشت کی کمی ک، سی واقعے کا بار بار یاد آنا وغیرہ۔

4 ۔ ذہنی رد عمل کے ساتھ ساتھ جسمانی رد عمل بھی ٹروما کی علامات میں شامل ہے جیسے تناؤ، خشار خون کا بڑھ جاناتھکاوٹ، سونے میں دشواری۔

5۔ڈرونے خواب، دل کی دھڑکن کا تیز ہو جانا، متلی، مسلسل دائمی سر درد

۔ بھوک میں کمی جنسی خواہش کی کمی عدم اعتماد چڑچڑاپن۔

7۔ تنہائی پسند ہونا قوت فیصلہ کی کمی اور روحانی بے کیفی کی صورت۔

8 ۔، صدمے کی شدت کی صورت میں لایعنی گفتگو حرکات وسکنات، چیخنا چلاناوغیرہ یہ وہ علامات ہیں جو ٹرومے کے مریض میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

د۔ ٹراما کی اقسام

ٹراما کے اسباب مختلف ہیں یعنی ٹراما مختلف ذرائع کی پیداوار ہے۔ٹرومے کی کیفیت یاشدت کا انحصار وقت حالات، حادثے یاسانحے کی شدت کے ساتھ ساتھ متاثرہ فرد کی نفسیاتی کیفیت سے جڑا ہے۔ ایک ہی حادثہ مختلف افراد پر مختلف طریقوں سے اثر انداز ہوتا ہے۔ کچھ اس حادثے سے شدید متاثر ہوتے ہیں اور کچھ کم۔ کچھ حادثے سے گزر تو جاتے ہیں مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس حادثے کے اثرات ان کے دماغ یانفسیات پر ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ یعنی ٹراما کی کیفیت کا انحصار انسانی مزاج، لچک کے عوامل اور حادثے کی نوعیت سے جڑا ہوتا ہے۔ اوکلاہمہ ڈیپارٹمنٹ اف مینٹل ہیلتھ کی تحقیق کے مطابق ٹراما تین مختلف پہلو سے تقسیم کیا جاسکتا ہے

> "Trauma tends to affect three primary group of people, the person who experiences the event, the person who witnesses the event and then the situation it appeals to."[27]

یعنی ٹراما تین طریقوں سے لوگوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ پہلے نمبر پر وہ لوگ جو ٹرومے کا براہ راست تجربہ کرتے ہیں، دوسرے وہ لوگ جو اس حادثے یاسانحے کو دیکھتے ہیں اور تیسرے نمبر پر وہ حالات آتے ہیں جن میں سے یہ دو طرح کے لوگ گزرتے ہیں۔ ماہرین نفسیات میں ٹرومے کی درج ذیل اقسام بہ لحاظ کیفیت بتائی ہیں۔

i۔ براہِ راست ٹراما

ٹراما کی اقسام میں سب سے سادہ قسم براہ راست ٹروے کی ہے۔ یہ اس لیے کہ یہ کیفیت کسی انسان کو براہ راست محسوس ہوتی ہے یہاں تک کہ متاثرہ شخص اسے اپنے طور پر جسمانی اور روحانی دونوں طریقوں سے محسوس کر سکتا ہے اور اسے یاد رکھ سکتا ہے۔ یہ ٹروے کی اس لیے سادہ ترین قسم قرار دی جاتی ہے کہ متاثرہ شخص کسی گہرے اور شدید صدمے کا شکار نہیں ہوتا اور وہ اپنے اندر رونما ہونے والی جسمانی، جذباتی یا ذہنی تبدیلیوں کو بذات خود محسوس کر لیتا ہے۔ یعنی اس کا نفسیاتی میکنزم اس قابل ہوتا ہے کہ وہ ایک نارمل انسان کی طرح اپنے آپ کا جائزہ لے سکے اور خود ہی ان ہیجان آمیز احساسات یا تجربات کے لیے معالج کی طرف رجوع کر سکے۔

ii۔ بلو اسطہ ٹراما

بالواسطہ ٹراما براہ راست ٹروے سے ذرا مختلف ہے۔ اس میں کوئی فرد کسی حادثے یا سانحے سے براہ راست مشاہداتی یا جسمانی طور پر ٹروے کا تجربہ نہیں کرتا لیکن اس کے باوجود ایسے انسان پر بھی اس واقعے یا حادثے کا زبردست اثر پڑتا ہے۔ مثلاً نائن الیون کا سانحہ بے شمار لوگوں نے براہ راست نہ دیکھا نہ ان پر بیتا ،انہوں نے اسے ٹی وی، اخبارات یا میڈیا میں دیکھا۔ یعنی جسمانی طور پر ایسے افراد وقوعہ پر موجود نہ تھے اور نہ ہی انہوں نے اسے براہ راست دیکھا، لیکن جب نائن الیون کے بعد اس سانحے کے حوالے سے مطالعہ شروع کیا گیا اور اس سانحے کے بارے میں ان لوگوں سے پوچھا گیا جنھوں نے اسے ٹی وی پر دیکھا تھا اور جسمانی طور پر اسے نہیں محسوس کیا تھا تو حیران کن طور پر یہ بات سامنے آئی کہ ان لوگوں پر بھی اس سانحے کے کچھ نہ کچھ اثرات موجود تھے۔ وقوعہ سے دور فاصلے پر موجود افراد بھی وقوع پذیر ہونے والے حادثے سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ اس کی مثال ہم 2005 میں ہونے والے آزاد کشمیر اور پاکستان میں ہونے والے زلزلے سے بھی سمجھ سکتے ہیں کہ زلزلہ کشمیر اور پاکستان کے مختلف علاقوں میں ہوا مگر اس کے اثرات ہر اس انسان پر بھی مرتب ہوئے جس کے رشتہ دار ان علاقوں میں موجود تھے اور وہ خود بیرون ملک۔ محض ٹی وی یا ٹیلی فون کے ذریعے اپنے پیاروں کی خبر گیری کر رہے تھے زلزلے کی خبر ایسے افراد کے لیے ایک شدید نفسیاتی کرب کا باعث بنی کیوں کہ فطری طور پر ان کا ذہن اپنے گھر والوں کی طرف گیا اور وہ ان کی خیریت کے حوالے سے بے چین اور بے قرار ہوئے۔ زلزلے کے بعد کے حالات و واقعات ایک تسلسل کے ساتھ دور اور قریب کے لوگوں کو متاثر کرتے رہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ سانحے کی جگہ سے دور رہنے والے لوگ بھی جذباتی یا نفسیاتی طور پر اس

سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ یعنی ایک تعلق جو آپ کا آپ کے رشتہ داروں یا دوستوں سے ہوتا ہے دور کسی جگہ بھی آپ کو نہ صرف تکلیف میں مبتلا کر سکتا ہے بلکہ آپ کو شدید تناؤ کا شکار کرتے ہوئے ٹروما کا مریض بنا سکتا ہے۔

iii۔ شدید صدمہ (ایکیوٹ ٹراما)

شدید صدمے یا ٹروما سے مراد وہ صدمہ ہے جو کسی ایک واقعے کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ واقعہ اتنا زبردست ہوتا ہے کہ اس سے متاثر ہونے والے کا وہ اعصابی نظام جو اس کی بقا کا ضامن ہوتا ہے وہ کام کرنے سے رک جاتا ہے۔ کیمبرج ڈکشنری میں ایکیوٹ ٹراما کا یہ مطلب بتایا گیا ہے۔

"If a bad situation is acute, it causes severe problem or damage" [28]

حادثے یا سانحے کی نوعیت کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ یہ جنسی تشدد سے لے کر کسی قدرتی آفت تک کی نوعیت کا واقعہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ان سب طرح کے واقعات کے رد عمل کے طور پر ان سے گزرنے والے فرد کے اندر ایک خطرے، ڈر اور خوف وغیرہ کی لہر پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمارے اعصابی نظام کا فطری کام یہی رہا ہے کہ یہ ہمیں مختلف خطرات کا ادراک کرائے اور ان سے بچنے کے لیے ہمارے جسم میں رد عمل پیدا کرے۔ جو لوگ کسی ایک واقعے یا واقعات کا تجربہ یا مشاہدہ کرتے ہیں ان کا ان واقعات کے حوالے سے رد عمل مختلف ہو سکتا ہے۔ واقعے کی نوعیت اور شدت وہ عوامل ہیں جو کسی بھی فرد میں رد عمل کے نظام کو ترتیب دیتے ہیں۔ ہر متاثرہ انسان کا اپنا ماضی، تاریخ، تجربہ اور اعصابی نظام واقعے سے متعلق اس کے رد عمل کو واضح کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یعنی ٹروما کی یہ قسم دو طریقوں سے عمل پذیر ہو سکتی ہے۔ یعنی واقعات کے علاوہ انسان کا وہ خاص رویہ جو کسی واقعے کے اثر انداز ہونے یا نہ ہونے کو ترتیب دیتا ہے اس کی وہ رد عملی لچک ہوتی ہے جس کے کم زور یا مضبوط ہونے سے انسان کے رد عمل کی شدت کا تعین ہوتا ہے۔ واقعے یا واقعات کی شدت یا نوعیت انفرادی سطح پر کسی فرد کا ماضی، تاریخ، تجربہ اور اعصابی نظام شدید ذہنی صدماتی تناؤ تب رونما ہوتا ہے جب ایک فرد براہ راست کسی حادثے کو دیکھتا ہے یا اس سے گزرتا ہے۔ یہاں واقعے کا شدید ہونا اہم ہے اگر واقعہ اپنی نوعیت میں صدمتی فضا کا حامل ہے تو وہ افراد کو متاثر کرے گا اور اثرات جو کسی فرد میں پیدا ہو

سکتے ہیں وہ خطرات، خوف، غم اور دکھ وغیرہ ہوسکتے ہیں۔ شدید صدماتی عارضہ درج زیل عوامل کی وجہ سے ہو سکتا ہے

1 ۔ لڑائی
2۔ دہشت گردی اور دہشت گردانہ حملے
3۔ جسمانی یا جنسی حملہ
4۔ گاڑیوں کا حادثہ
5۔ اچانک دکھ دے خبر موت وغیرہ کا سننا
۔ قدرتی آفات کا سامنا کرنا
7۔ مریض کو اپنے متعلق کسی مہلک بیماری کا پتہ چلنا

یو ایس اے کے مینٹل ہیلتھ ادارے کے مطابق ایکیوٹ یا شدید ٹراؤمے کی تعریف یوں ہے

"Acute trauma is a one-time event that happens under a limited amount of time this could be like a sexual or physical assault, going through a natural disaster or possibly car accident."[29]

ایکیوٹ ٹرومے یا شدید تناؤ کے خطرات کے اثرات مختلف ہو سکتے ہیں۔ ہر انسان کی اپنی انفرادی صورت حال پر منحصر ہے کہ وہ ان شدید صدماتی واقعات میں کس طرح کا ردعمل کرتا ہے؟ واقعے کے بعد کے حالات بھی اس ٹراومیٹک ڈس آرڈر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مثلاً وقوعہ کے بعد بقا کے حوالے سے ضروری وسائل کی دستیابی، کسی فرد کے پہلے سے موجود نفسیاتی عارضے وغیرہ بھی شدید صدماتی خرابی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اب یہاں یہ اہم ہے کہ شدید صدماتی خرابی کی وجہ کچھ ہو مگر اس کا عمومی رد عمل اس طرح کا ٹرومیٹک ہو سکتا ہے۔ ٹراما کی اس قسم کی علامات عموماً سانحے کے دو چار ہفتوں کے بعد شروع ہو جاتی ہیں۔ یعنی ایکیوٹ سٹریس ڈس آرڈر کا اگر بروقت علاج نہ کیا جائے تو یہ پوسٹ ٹرومیٹک سٹریس ڈس آرڈر میں تبدیل ہو جاتا ہے

شدید صدمے یا ٹرومے کی علامات درج زیل ہو سکتی ہے۔

- شدید بے چینی

- خوف و حراس
- بے حسی لاتعلقی
- جذباتی رد عمل کی کمی حادثے کی تفصیلات پر
- بات کرنے سے اجتناب
- بے خوابی یعنی نیند کے مسائل
- شدید غصہ چڑچڑاپن
- اپنی صحت کے حوالے سے بیگانہ ہو جانا
- پروفیشنلزم کی کمی اور خودکشی کے خیالات اور غم کی کیفیات

ایکیوٹ ٹراما یا شدید صدمہ قابل علاج ہوتا ہے ایسے مریض کو جلد کسی ماہر نفسیات سے علاج شروع کروادینا چاہیے ورنہ یہ ٹرامامزید ذہنی انتشار کا باعث بن سکتا ہے۔

iv۔ دائمی صدمہ (کرونک ٹراما)

کرونک ٹراما کے لیے اردو میں لفظ دائمی صدمہ استعمال ہوتا ہے۔ دائمی صدمہ اپنی نوعیت میں ایک ایسی کیفیت کو کہا جاتا ہے جس میں کوئی فرد مسلسل ایک ہی طرح کے حادثات یا واقعات کا تجربہ کرتا رہے یا اسے بار بار ایک ہی طرح کے حادثے سے گزرنا پڑے تو اس کا ابتدائی طرز کا ٹراما جس کو ہم یک وقتی ٹراما کہتے ہیں یا جو محض ایک حادثے ہی سے جڑا ٹراما ہوتا ہے وہ دائمی ٹرومے یا صدمے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یعنی انسان واقعات کی سیریز سے مسلسل نبرد آزما رہے اور نفسیاتی طور پر صدموں کا شکار رہے تو یہ ٹراما ایکیوٹ ٹرومے سے کرونک ٹرومے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات ایک ہی واقعہ یا حادثہ کسی انسان کو تہ در تہ یا ایک کے بعد ایک کر کے تسلسل کے ساتھ ایک صدماتی کیفیت میں مبتلا رکھتا ہے۔ یہ حادثہ ایک ہی طرز کا ہو سکتا ہے یا مختلف حادثے مل کر ایک ایسی سیریز بناتے ہیں جو انسان کی شناخت کو بری طرح مسخ کر دیتے ہیں۔ یہ صورتحال بھی دائمی صدمے کے درجے میں آتی ہے۔ طویل عرصے تک کسی ایک طرح کی اذیت یا مسلسل مختلف طرح کی اذیت کا شکار رہنے والا فرد دائمی صدمے یا جسے انگلش میں کرونک ٹراما کہتے ہیں اس سے نکل کر پیچیدہ ترین صدمے کے اندر داخل ہو سکتا

ہے۔ یہ وہ احساس ہے جو پوسٹ ٹرومیٹک سٹریس ڈس آرڈر کہلاتا ہے۔ امریکی ماہر نفسیات جیوتھ ہرمن کے بقول

"People subjected to prolonged, repeated trauma, develop insidious progressive form of post traumatic disorder that invades and erodes the personality. The victim of the chronic trauma may feel him or herself to be changed irrevocably, other may lose the sense of that he has any self at all."[30]

کرونک ٹراما یا دائمی صدمے میں ایک انسان اپنی ذات کا ادراک کھونا شروع کر دیتا ہے اور خود کو خوف کے اندھیروں میں محسوس کرتا ہے۔ دائمی صدمے کا شکار لوگ مسلسل مشتعل، چوکس، بے چین اور بے قرار رہتے ہیں۔ ایسے لوگ کسی خوفناک صورتحال کو دیکھ کر نہایت خوفزدہ اور کپکپاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات مکمل احساس کو کھو دیتے ہیں۔ یعنی کیفیتِ خوف کا عذاب ان کی زندگی میں دائمی صورتحال اختیار کر لیتا ہے۔ ٹرومے کی ابتدائی شکل یعنی ایکیوٹ ٹرومے میں ایک فرد حادثے کے دوران یا حادثے کے فورا بعد کچھ دیر کے لیے اپنے آپ سے بیگانہ ہوتا ہے جب کہ دائمی صدمے کی صورت میں متاثرہ شخص خود کو مکمل طور پر ایک بدلا اور شخص پاتا ہے یا پھر وہ اپنے وجود کے ادراک ہی سے بے احساس ہو جاتا ہے۔ ماہرینِ نفسیات ایکیوٹ ٹرومے کو ٹرومے کا پہلا باقاعدہ درجہ قرار دیتے ہیں اور ان کے مطابق ٹرومے کا دوسرا درجہ کرونک ٹراما ہے جس کو اردو میں ہم دائمی صدمہ بھی کہتے ہیں۔ دائمی صدمہ اپنی شدت کے لحاظ سے دوسرے درجے کا ٹراما ہے۔ جس کا علاج نہ ہونے کی صورت میں یہ ٹرومے کے تیسرے پیچیدہ ترین ٹرومے میں تبدیل ہو سکتا ہے۔

دوسرے درجے کا ٹراما جسے کرونک ٹراما کہا جاتا ہے مسلسل ایسے واقعات سے گزرنے کے سبب ہوتا ہے جو متاثرہ فرد کے لیے اذیت ناک ہوں۔ یہ ٹراما اس قدر شدت رکھتا ہے کہ یہ انسان کو اس کے ہوش و حواس سے بے گانہ کر سکتا ہے۔ اوکلاہما ڈیپارٹمنٹ آف مینٹل ہیلتھ کے مطابق

"Chronic trauma is there an event may happen over and over and again or it may be a multiple layering of events. For example, chronic trauma might apply in cases of abuse, neglect, domestic

violence, human trafficking, or might be that, someone has multiple events happened to him."[31]

کرونک ٹراما سے متاثر لوگ ذہنی یا جسمانی طور پر کسی قسم کا سکون محسوس نہیں کرتے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا یہ احساس بڑھتا جاتا ہے کہ ان کا وجود ان کے لیے مسلسل ایک اذیت کا باعث بنتا جارہا ہے۔ وہ تسلسل کے ساتھ حالتِ اضطراب میں رہتے ہیں یہاں تک کہ ذہنی کرب کے ساتھ ساتھ ان کی صحت پر بھی برے اثرات مرتب ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ سر درد، معدے کی خرابی، پیٹ درد، متلی وغیرہ اس کی عام علامات ہیں۔ تہ دار صدمے جو ایک ہی واقعے کے بار بار رونما ہونے سے پیدا ہوتے ہیں یا مختلف طرح کے واقعات کے مسلسل ہجوم کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کے نتیجے میں زندہ بچ جانے والے لوگوں کو جھٹکے لگنا، گھٹن محسوس ہونا، دل کی دھڑکن کا بے ترتیب ہونا وغیرہ محسوس ہوتا ہے۔ ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنے والے حضرات اپنی اس حالت کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی، جسمانی یا ذہنی ابتری اور دہشت نما ماحول کے درمیان فرق کرنا بھی نہیں جانتے۔ کرونک یا دائمی صدمے کی درج ذیل وجوہات ہو سکتی ہیں۔

- طویل مدتی بد سلوکی: ایک انسان طویل مدت تک بد سلوکی کا شکار رہے تو وہ دائمی صدمے کا شکار ہو سکتا ہے۔
- مسلسل جنسی تشدد کا سامنا کرنا۔
- مسلسل سنگین معاشی مسائل کا شکار رہنا
- گھریلو جنسی تشدد اور ریپ کا شکار ہونا
- مسلسل جنگی صورتحال میں پڑے رہنا
- مسلسل تکلیف دہ اور غمناک صورتحال میں رہنا
- مسلسل کسی نفسیاتی عارضے کا شکار رہنا یا کسی فوبیا کا شکار رہنا۔

v۔ کرونک ٹروما کی علامات

- بے حسی اور بیکاری کا مسلسل احساس
- اپنے جذبات کو احساسات پر قابو رکھنے میں مسائل کا سامنا۔

- دوسرے لوگوں سے ملنے جلنے میں گھبراہٹ محسوس ہونا۔
- کسی بھی صدمے کے لیے رد عمل میں تاخیر۔
- مستقل تھکاوٹ، نیند کی خرابی ڈراؤنے خواب، ماضی پرستی اور ایسی گفتگو سے پرہیز کرنا جو کسی حادثے سے جڑی ہو۔

دائمی صدمہ یا کرونک ٹراما اگر مسلسل جاری رہے تو ایسا مریض ٹروما کے حتمی اور آخری مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کا علاج تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ ٹروما کی ایسی صورت حال کو پیچیدہ یا کمپلیکس ٹراما کہا جاتا ہے۔

vi۔ پیچیدہ ٹراما (کمپلیکس ٹراما)

انسانی زندگی بہت سارے اہم ترین عناصر کے اندر گھری ہوئی ہے۔ انسان جہاں اس کائناتِ لامحدود کا مرکزی کردار ہے وہیں اس کی زندگی کئی اعتبار سے قابل ذکر رہی ہے۔ اپنی بقا کی جدوجہد نے انسان کو جہاں دورِ جدید کی معراج سے آشنا کرایا ہے وہیں اس بے پناہ مادی ترقی کے نتیجے میں حاصل ہونے والی سہولتوں، خوشیوں اور آسانیوں کے ساتھ اسی شدت کے دکھ صدمے اور تکالیف بھی انسانوں کی قسمت میں رہے ہیں۔ یعنی انسان ذہنی، بدنی اور روحانی اعتبار سے جہاں ترقی کرتا چلا آیا ہے وہیں انہی پہلوؤں کے اعتبار سے اذیتوں کا شکار بھی رہا ہے۔ ہماری زندگی میں کئی ایک ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن کو ہم یاد نہیں رکھنا چاہتے۔ ہماری زندگی میں رونما ہونے والا کوئی ایک تلخ یا خوفناک حادثہ تو شاید ہم وقت کے ساتھ ساتھ بھول جائیں مگر تسلسل سے رونما ہونے والا ایک ہی طرح کا حادثہ یا خوفناک کیفیت ہمارے لیے نہایت ناقابل برداشت ہو سکتے ہیں۔ اور یہ صورت حال ہماری ساری زندگی کو اپاہج بنانے کا موجب ہو سکتی ہے۔ ہم شدید صدمے سے ہوتے ہوئے دائمی صدمے کا شکار ہو سکتے ہیں اور دائمی صدمہ اگر مکمل مسلط رہے تو ہم پیچیدہ ترین نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔ کمپلیکس ٹراما، ٹروما کی دیگر صورتوں سے ہٹ کر ایک نہایت خطرناک کیفیت ہے جو انسان کی مکمل شکست وریخت کا باعث بنتی ہے۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ صدمہ معمولی شدت کا ہو یا زیادہ اس کے اثرات انسان کو ہر صورت میں اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ یعنی ٹراما وہ تکلیف دہ صورت ہے جو وقتی طور پر ایک مخصوص عرصے کے لیے آکر انسان کو متاثر کرتی ہے مگر یہی ٹراما اگر مسلسل انسان کے دماغ میں نشوونما

پاتا رہے تو انسان کو اس طرح جکڑ لیتا ہے کہ انسان کو اپنی سابقہ، نارمل اور آرام دہ زندگی میں واپس پلٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔۔یو کے ٹراما کونسل کے مطابق

"The UK Trauma Council defines complex trauma as traumatic experiences involving multiple events with interpersonal threats during childhood or adolescence."[32]

یہ صدماتی نشوونما جسے کمپلیکس ٹراما کہا جاتا ہے محض ایک حادثے یا واقعے پر مشتمل نہیں ہوتی بل کہ پے در پے حادثات کی ایک ایسی سیریز ہے جس کا سامنا کرتے کرتے ایک فرد ٹروما کی پیچیدہ ترین صورت میں داخل ہو جاتا ہے۔یہ سیریز مہینوں اور سالوں کو محیط ہو سکتی ہے۔ کمپیلس ٹراما ہر طرح کی عمر کے افراد کو بری طرح متاثر کر سکتا ہے اور اس کی سطح عام ٹراما کی نوعیت سے بہت زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔یو کے ٹراما کونسل کے مطابق

"Complex trauma typically has a more significant impact on children and young people's mental health outcomes than non-complex forms of trauma." [33]

پیچیدہ صدمہ عام طور پر دائمی تناو، باہمی منفی تجربات جیسے کمیونٹی میں بدسلوکی، نظر انداز ہونا، یا تشدد سے پیدا ہوتا ہے۔

کمپلیکس ٹراما کیسے نشونما پاتا ہے؟

جب ایک انسان کسی تکلیف دہ واقع کا تجربہ کرتا ہے تو یہ تلخ تجربہ اس کے دماغ کے اس نظام کو تحریک دیتا ہے جو احساسات و جذبات کو کنٹرول کرتا ہے جسے لمبک کہا جاتا ہے۔ کوئی بھی صدمہ جب کسی انسان کو جسمانی اور ذہنی طور پر متاثر کرتا ہے تو دماغ کا یہ حصہ جو جذبات کو کنٹرول کرتا ہے انسان کو ایک آرام دہ اور پر سکون کیفیت مہیا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اسی لیے عمومی طور پر لوگ حادثے یا سانحے کے اثرات سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یعنی حادثے کے بعد انسان کے سنبھل جانے کے چانس موجود ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی انسان مسلسل پے در پے ایک ہی طرح کے واقعے سے گزرے یا مختلف حادثات کی سیریز سے گزرتا رہے جو سالوں کو محیط ہو تو ایسے انسان کا اپنے مکمل نفسیاتی توازن کے ساتھ نارمل زندگی کی طرف واپس آنا مشکل ہو جاتا ہے کیوں کہ انسانی اعصاب کو کنٹرول کرنے والا دماغ کا حصہ لمبک ان پہ در پے صدمات کی

وجہ سے شدید متاثر ہوتا ہے اور پوری طرح انسانی جذبات واحساسات کو توازن میں نہیں رکھ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا فرد پیچیدہ نفسیاتی عارضے کا شکار ہو جاتا ہے۔ اوکلاہمہ ڈیپارٹمنٹ آف ٹراما اسٹڈیز کے مطابق

"Complex a lot like chronic trauma, except that it happens at the in actions aur reaction of the caregiver the person that are person could be able to trust. The importance of understanding complex trauma, is because it does not end when the trauma ends."[34]

پیچیدہ ٹراما اس واقعے کے ختم ہو جانے کے بعد بھی جاری رہتا ہے جو اس کے پیدا ہونے کا باعث بنتا ہے۔ یعنی یہ بعد از حادثہ ایک خطرناک ترین پیچیدہ نفسیاتی الجھن کا نام ہے جو حادثے یا حادثات کے بعد عمر بھر یا تادم علاج جاری رہتی ہے۔ کمپلیکس ٹراما بچوں، بڑوں مرد عورتوں وغیرہ کو پوری طرح متاثر کرتا ہے اس کے اسباب اور علت وہی ہیں جو کرونک ٹراما کے ہیں۔ یعنی دائمی صدمے کو اسی طرح چھوڑ دیا جائے تو یہ خطرناک صورت اختیار کرتا ہوا کمپلیکس ٹروما میں داخل ہو جاتا ہے۔ غیر انسانی رویے، تشدد، رشتوں میں تناؤ، حادثے وغیرہ اس ٹروما کا باعث بنتے ہیں۔ امریکی ماہر نفسیات میتھیو تھامس اپنی ایک ریسرچ میں کہتا ہے

"Complex trauma can affect people in lots of different ways. children and adolescents with complex trauma often have negative thoughts emotions are believe about themselves or the world they might have uncomfortable feelings in their bodies from leaving with constant stress leaving a turmeric life can make it hard for young people to have healthy relationships or imagine a good future.[35]

پیچیدہ ٹراما لوگوں کو مختلف طریقے سے متاثر کرتا ہے اور مختلف عمر کے لوگوں کو متاثر کرتا ہے یہ ایک ایسی تکلیف دہ صورت حال ہے جس میں مبتلا شخص منفی خیالات، جذبات اور عقائد کا حامل بن جاتا ہے۔ ایسے فرد کے لیے زندگی پر پر سکون طریقے سے یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

vii۔ پیچیدہ صدمے کی علامات

- ماضی میں گم رہنا یا داشت کی شدید کمی
- .جذبات کے کنٹرول میں دشواری ہر وقت مشتعل اور چوکنا ہونا
- زندگی میں دلچسپی کی کمی خود اعتمادی کی کمی
- ایسی تمام باتوں سے بچنا جس سے انسان خوفزدہ ہو

ٹراما کی عموماً بڑی اقسام ایکیوٹ ٹراما، کرونک ٹراما اور کمپلیکس ٹراما ہی قرار دی جاتی ہیں مگر اس کی مزید اقسام میں نفسیاتی ٹراما، جنگی ٹراما وغیرہ بھی اہم ہیں جن کا ذکر اگے آئے گا۔اس ساری بحث کا خلاصہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسانی دماغ جہاں بہت سے اہم کارنامے سرانجام دے چکا ہے اور بہت سے مشکل حالات میں کا مقابلہ کرتا چلا آیا ہے وہی اس کے دماغ میں کوئی معمولی سی بات بھی خلل ڈال سکتی ہے جو اس کی زندگی کو مکمل برباد کر دے۔درج بالا ٹراما کیفیات کی روشنی میں آنے والے ابواب میں منتخب اردو ناولوں کا ٹرومیٹک جائزہ لیا گیا ہے۔

ز۔ افسانوی ادب (ناول) اور ٹراما

ٹرومے کی تفہیم اور اس کے بیان کے لیے اگرچہ بڑے پیمانے پر فلمیں ٹیلی فلمیں اور ڈرامے تخلیق ہوئے مگر فکشن میں ٹرومے کا مطالعہ ادبی کام سے متعلق ہی رہا ہے۔افسانوی ادب، بنیادی طور پر انسانی زندگی، سماج ہی کی علامت سمجھا جاتا ہے اور اس میں جہاں فرضی کرداروں اور حالات و واقعات اور حادثات کا بیان ہوتا ہے وہی حقیقی دنیا میں پیدا ہونے والے عظیم المیوں اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اثرات کو بھی جگہ دی جاتی ہے۔اس کے علاوہ ٹراما کی تفہیم اور تشریح و توضیح کا کام کیا جاتا ہے۔جنگِ عظیم اول ہو یا دوم ،ویت نام کی جنگ ہو یا نائن الیون کے حملے ،افسانوی ادب میں ان واقعات کی باز گشت سنائی دیتی ہے۔نائن الیون نے تو افسانوی ادب کو ایک نئے افق سے متعارف کرایا ہے۔جہاں ٹراما کسی ایک فرد یا قوم کا مسئلہ نظر نہیں آتا بل کہ پوری دنیا ایک گلوبل ویلج کی طرح ایک ہی طرح کے تجربے سے گزرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بے شمار افسانوی تخلیقات اپنے اندر وقت اور جگہ کے میکنزم کو محفوظ کرتے ہوئے ٹرومے کی کیفیات کو بیان کر رہی ہیں۔ایک مغربی ناول نگار ایبکا ویسٹ نے اپنے ناول

"The Return of soldier (1998)"میں جنگ عظیم اول کے اس سپاہی کی داستان لکھی ہے جو ذہنی تکلیف میں مبتلا تھا اور اسے بھولنے کی بیماری لگی ہوتی ہے۔ایک اور ناول نگار ہیلن اپنے ناول "Basic

"Black with pearls(1980)میں ٹرومیٹک کرداروں کو تخلیق کر کے پیش کرتا ہے. ایک اور اہم بات کہ ٹراما کیفیات کا دائرہ انگریزی افسانوی ادب میں ہی نہیں پر کھا گیا بل کہ دیگر زبانوں کے افسانوی ادب میں بھی ٹرومک کی پیشکش کو یقینی بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ پاکستان، بھارت اور افغانستان ایک طویل عرصے سے حالتِ جنگ میں مبتلا ہیں، اس کے علاوہ اندرونی خانہ جنگی نے بھی یہاں کے لوگوں اور افراد پر شدید صدماتی اثرات چھوڑے ہیں۔ بچوں پر تشدد ہو یا خوآتین کی عصمت دری، فرقہ وارانہ تشدد ہو یا مذہبی انتہا پسندی، نائن الیون کے براہ راست اثرات ہوں یا دہشت گردی کی حالیہ لہر، میانمار (برما) میں مسلمانوں کی نسل کشی ہو یا حالیہ دنوں میں اسرائیل کی غزہ پر ظالمانہ جنگ، اس سب جنگی کیفیت کو افسانوی ادب اور ناول میں جگہ ملی ہے اور ملنی چاہیے۔ اردو ناول کے مزاج پر اثر انداز ہونے والے اہم ترین فکری اور فنی عوامل کا جائزہ لے کر یہ کوشش کی گئی ہے کہ یہ پتہ چلایا جآئے کہ ایا اردو فکشن یعنی ناول کے بیانیہ میں بھی مغربی دنیا کی مصنفین کی طرح یہ روایت موجود ہے کہ اردو ناول نے بھی حادثات اور سانحات کی زد میں مبتلا افراد کا ذکر کرنا ضروری سمجھا ہے کہ نہیں۔ کیا اردو ناول میں بھی اکیسویں صدی کے حالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے کہ نہیں ۔ بہر حال فکشن میں انسانی المیوں کا ذکر قدیم سے مروج ہے اور جدید دور تو شعوری طور پر اس پہلو پر لکھ رہا ہے اور ان اثرات کا جائزہ لے رہا ہے جو وسیع پیمانے پر انسانوں کی زندگیوں کو شکست وریخت کا شکار کر کے انہیں فنا کر دیتے ہیں۔ بیسویں صدی میں ہونے والے عظیم حادثوں کو بھلے وہ قدرتی تھے یا خود انسان کی کوششوں کا نتیجا مصنفین نے بھرپور انداز میں ان کو اپنے ناولوں کا حصہ بنایا اور ان حالات وواقعات کی شدت کو بیان کیا جو انسانوں کے لیے نہایت ناقابل برداشت رہی ہے۔ ایسے ہزاروں ناول، ڈرامے اور فلمیں لکھی گئی ہیں جن میں انسانی المیے کو بہت موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کام جہاں فکشن میں موثر انداز ٹرومے کی روایت کو محفوظ کرتا ہے وہی یہ اس بات کو بھی یقینی بناتا ہے کہ ان افسانوی تحریروں کے ذریعے انسانوں کو یہ باور کرایا جآئے کہ جنگیں یا گولہ بارود وغیرہ انسان کے لیے نہایت مضر ہیں۔ برصغیر کی تقسیم پر لکھا گیا اردو یا ہندی ادب بے شمار ایسے ناولوں اور افسانوں سے بھرا پڑا ہے جن میں ہمہ پہلو انسانی المیوں کی داستانیں رقم ہیں۔ ٹراما کی ایک سیریز ہے جو ہمیں مختلف کرداروں کی صورت میں ناولوں جلوہ گر ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ نائن الیون کے بعد کچھ پاکستانی ناول نگاروں نے کوشش کی ہے کہ نائن الیون نے عالمی سطح پر جس قسم کے ثرات مرتب کیے ہیں ان کا احاطہ کیا جآئے۔ یہ اثرات فکری تھے یا فنی، ان ناول نگاروں نے کوشش کی ہے کہ ان کو اپنے ناولوں میں پیش کر سکیں۔ دہشت گردی، جنگوں کا بیان، اسلاموفوبیا کا ذکر، گلوبلائزیشن کے اثرات کا ذکر، فرقہ وارانہ

مسائل کا بیان وغیرہ اکیسویں صدی کے ناول کے خصوصی موضوعات ہیں۔ افسانوی ادب تخلیق کرنے والوں نے تو ٹرامیٹک حالات اور واقعات کو اپنے بیانیے کا حصہ بنائے رکھا مگر ایک چیز کی کمی محسوس کی جاتی ہے کہ اس پیش کش کی تفہیم، تعبیر و تشریح کے لیے کوئی ایسی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آتی جس میں افسانوی ادب کے ٹرومیٹک پہلو کو آجاگر کیا گیا ہو۔ اس مقالے میں یہی کوشش کی گئی ہے کہ مابعد نائن الیون، اردو ناول نے کس طرح کے مزاج کو اپنایا ہے اور کس قسم کی کیفیات کو بیان کیا ہے۔ اس بات کا بھی جائزہ اس مقالے کا حصہ ہے کہ مابعد نائن الیون اردو ناول میں کیا ٹرومے کی کوئی کیفیت کو کرداروں کی صورت میں بیان کیا گیا ہے یا نہیں؟

حوالہ جات

1. لیاقت علی،ڈاکٹر،نائن الیون کا عصری منظر نامی اور اردو افسانے کا بیانیہ، مشمولہ،نائن الیون دنیا اور اردو افسانے کے تخلیقی رجحانات، فکشن ہاوس لاہور، 2023 ص 9
2. سہیل احمد،(مرتب) پاکستانی زبان و ادب پر 11/9 کے اثرات، مقالات بین الاقامی ادبی سیمینار، باڑہ گلی کیمپس، ص 5
3. Van der Kolk, Psychological Trauma, Washington, DC: American Psychiatric Press.1987 page 12
4. (Michale Balaev, Trends in literary theory, University of Manitoba ,2018 page4
5. فخر الکریم،ڈاکٹر،اکیسویں صدی میں اردو ناول:چند مباحث، مشمولہ ادبیات اسلام آباد شمارہ نمبر 24،123 2020 ص47
6. Zindziuviene Lerida Elements of Trauma Fiction in the نائن الیون Novel, University of Timisoara, P 73
7. شید امحمد، ہماری نفسیات، ای اے سینٹرز، انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی، 1939، ص
8. ایضا ص88
9. https://dictionary.combridge.org. Trauma
10. اکسفورڈ، پرنٹینگ پریس، 2008، ص 2
11. . Kleber, PI, Trauma and public mental Health: A Focused review, Front Phychiatry,2019, P, 10
12. Sandra L Bloom, A guide to Trauma informed Approaches, Humanizing mental Health Care center, Australia,2018, Page 3
13. Priti Bala Sharma, Trauma studies: an Echo of Ignored Screams, Karishna Offset Shahdara, India 2020, page 4

14. Charles R FIglay Amy Bryan, The study of Trauma: A Historical Over view. PA Handbook of Trauma Psychology USA, Volume1,2017, page,8

15. ایضا ص 21

16. ایضا ص9

17. ایضا ص13

18. Michelle Balave, Trauma studies, John Wiley Son's Let,2018, P 31

19. Charles R FIglay Amy Bryan, The study of Trauma: A Historical Over view, p

20. Caruth, Trauma: Exploration in memory, Johns Hopkins University Press,1995 page 11

21. Vander Kolk, Phycological Trauma, American Psychiatry press, Washington,1987, p18.

22. International Society of Traumatic stress studies, Mass Disasters, Trauma and loss, One Park view Plaza, USA 201 page 2

23. https://ur.m.wikipedia.org/wiki

24. قاسم یعقوب، اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات، سٹی بک پوائنٹ۔ کراچی، 2015، ص14

25. https://www.woar.prg/ur/what-is-sexual-violence.

26. https://ur.m.wikipedia.org/wiki

27. Oklahoma Department of mental Health, Categories of Trauma, Oklahoma City USA, page1

28. https://dictionary.combridge.org. Trauma

Oklahoma Department of mental Health, Categories of Trauma, Oklahoma City USA, page2 .29

Judith Herman, Trauma and recovery, Basic Books Publisher New York,1992 page2 .30

Oklahoma Department of mental Health, Categories of Trauma, Oklahoma City USA page12 .31

Oklahoma Department of mental Health, Categories of Trauma, Oklahoma City USA page 12 .32

. Mathew Kalith Ems, Complex Trauma, Department of Phycology, University of Missouri USA 2014page 340 .33

باب دوم

معاصر اردو ناول پر نائن الیون کے اثرات

الف۔ تمہید

اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق کی تو اس کے ساتھ ہی خیر و شر کا ایک تصور بھی قائم ہوا جو ہر انسان کے تہذیبی اور ثقافتی سفر میں ہم رکاب رہا۔ جب سے انسانی معاشرہ قائم ہوا تب سے ہی خیر و شر کا تصور چلا آ رہا ہے۔ خیر اور شر ایک دوسرے پر غالب آنے کی سعی کرتے رہے ہیں۔ خیر و شر کے اس غالب و مغلوب ہونے کے نتیجے میں ایک تصادم پیدا ہوتا ہے جو نئے نتائج اخذ کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ انسانی زندگی خیر و شر کے ان واقعات سے بھری پڑی ہے۔ یہ واقعات انسانی زندگی کو لمحوں میں زیر و زبر کر کے رکھ دیتے ہیں اور پھر لا محالہ ان کے خوف ناک نتائج جنم لیتے ہیں۔ انسانی معاشرے کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو کوئی عہد خیر و شر کے تصادم کے واقعات سے خالی نہیں ہے۔ عہد قدیم میں انسان نے اپنی بقا کے لیے خود سے کمزور قبیلوں پر حملہ کیا اور ان کے مال مویشیوں اور افراد پر قبضہ کیا۔ انسان جب زرعی معاشرے میں داخل ہوا تو کاشتکاری کے لیے دوسروں کی زمینوں کے زبردستی حصول کو ممکن بنایا۔ اس کے بعد جب دولت اور اقتدار کا حصول انسانوں کی قتل و غارت اور کا ایک مستقل ذریعہ بن گیا۔ تاریخ انسانی ایسے تمام حادثات و واقعات سے عبارت ہے۔ ان حادثات و واقعات کے اثرات انسانی معاشرے پر ناگزیر ہیں۔ ادب چوں کہ زندگی کا آئینہ دار ہے اور ہمارے ماضی کو حال سے جوڑے رکھتا ہے اس لیے ادیب اپنی ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ اس ماضی اور حال کے تمام واقعات کی عکاسی کرے اور ماضی اور حال کے تمام واقعات کے نتیجے میں مستقبل کے اندیشوں اور آنے والے حالات کی پیشین گوئی کو اپنے تخلیقات کا حصہ بنائے۔ تاریخ انسانی میں ہر عہد کی اپنی مخصوص اہمیت ہے۔ لیکن بیسیوں صدی میں انسانی معاشرہ جدید زندگی سے روشناس ہوا۔ بیسویں صدی نے اپنے عہد میں ہونے والے حالات و واقعات کے نتیجے میں ہر ادیب کو نئے موضوعات فراہم کیے۔ اور ہر ادیب نے اپنی استطاعت کے مطابق اسے اسے مختلف اصناف میں اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ تاریخ برصغیر کے تناظر میں بیسویں صدی کا سب سے اہم واقعہ تقسیم برصغیر ہے۔ جس کے نتیجے میں متحدہ ہندوستان، پاکستان اور بھارت، دو ملکوں میں

تقسیم ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستانی معاشرے میں ہر عہد میں نشیب و فراز آتے رہے لیکن ۱۹۷۱ میں سقوط ڈھاکہ ایک عظیم سانحہ بن کو نمودار ہوا۔

اس سانحے کے اثرات ایک عام فرد کی زندگی سے لیکر بالائی طبقے کے افراد کی زندگی پر بھی پڑے۔ اور سقوط ڈھاکہ کے اس المیے کو ہر ادیب نے اپنی استطاعت کے مطابق اپنی تخلیقات میں بیان کیا۔

ب۔ نائن الیون کے واقعات اور رد عمل

اکیسویں صدی کی ابتداء ہوئی تو ۲۰۰۱ء میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر امریکہ پر ہونے والے حملوں نے پوری دنیا میں ہل چل مچا دی۔ اگرچہ اس سانحے کے اثرات بیسویں صدی میں ہونے والی دو عظیم جنگوں کی تباہ کاریوں سے کم تھے لیکن پھر بھی پوری دنیا کا معاشی نظام اس سے متاثر ہوا۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کو امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی بلند و بالا عمارت پر دو جہاز ٹکرائے اور اس کے بعد پینٹا گون کی عمارت سے جہاز ٹکرانے کے بعد وائٹ ہاؤس کی طرف بھی ایک طیارے کا رخ کیا گیا مگر امریکی سیکیورٹی کی بروقت کارروائی کی وجہ سے یہ جہاز مار گرایا گیا۔ عالمی سطح کے اس تجارتی مرکز میں کام والوں کی ایک بڑی تعداد لقمہ اجل بنی اور یوں اس حادثے نے پوری دنیا پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ امریکہ نے اس حملے کی ذمہ داری افغان مجاہدین کی تنظیم القاعدہ پر عائد کی۔ اگرچہ روس افغان جنگ میں روس کو شکست دینے کے لیے امریکہ نے افغان مجاہدین پر مشتمل القاعدہ تنظیم کا آغاز کیا۔ لیکن روس کے تسلط کے اختتام کے بعد القاعدہ کا وجود خود امریکہ کے لیے خطرے کی علامت بن گیا۔ القاعدہ تنظیم اور امریکی حکومت کی باہمی سطح کی چپقلش کے بعد القاعدہ نے امریکہ کو دھچکا دینے کی خاطر ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر زبردست حملہ کیا جس کے غیر متوقع نتائج پوری دنیا کو بھگتنے پڑے۔ تمام دنیا میں القاعدہ گروپ کی شدید مذمت کی گئی۔ اس کے خلاف مظاہرے کیے گئے۔ القاعدہ چوں کہ ایک مسلم تنظیم تھی چنانچہ اس حملے کے بعد پوری دنیا اور بالخصوص امریکہ میں رہنے والے مسلمان امریکی عتاب کا نشانہ بنے۔ امریکہ میں نسل در نسل رہنے والے مسلمان افراد کا بھی جینا حرام کر دیا گیا اور امریکی معاشرے میں رہنے والے غیر ملکی مسلمانوں کو بھی شدید ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ امریکہ نے ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کا بدلہ تمام اقوام عالم کے مسلمانوں پر طرح طرح کی پابندیاں لگا کر لیا۔ نائن الیون کے اس حادثے کے بعد ادب میں دہشت گردی کی اصطلاح قتل وغارت، تخریب، منافقت اور تباہی و بربادی کے طور پر استعمال ہونے لگی۔ اس واقعے نے تاریخ کو ایک نئی راہ پر لا کھڑا کیا نائن الیون کے اس واقعے نے پوری دنیا کے ادب، سیاست، تجارت،

ثقافت اور معاشرت پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس حادثے کے نتیجے میں امریکہ میں رہنے والے لاکھوں مسلمان بے گھر ہوئے۔ انہیں ملازمتوں اور دفاتر سے نکال دیا گیا۔ ان کی عزت نفس مجروح کی گئی ان پر دہشت گرد ہونے کا لیبل لگا کر ان کو ظلم و تعدی کا نشانہ بنایا گیا۔

امریکی دباؤ اور خوف نے مسلمان خاندانوں میں انسانی اقدار کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔ ان واقعات کے براہِ راست نتائج ادب پر بھی مرتب ہوئے اور سیاست و سماج پر بھی۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے اس حادثے کے بعد بین الاقوامی سطح پر ایک غیر معمولی تبدیلی واقع ہوئی۔ امریکہ کی طاقتور اشرافیہ نے ترقی پذیر ممالک پر اپنا تسلط جمانے کے لیے نئی نئی پالیسیاں بنائیں۔ امریکہ نے اس حادثے کے بعد اسامہ بن لادن کو انسانیت کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا اور مسلمانوں کو اپنے ناروا سلوک کا نشانہ بنایا۔ اس حادثے کے اثرات عالمی سطح پر زندگی کے تمام شعبوں پر مرتب ہوئے اس واقعے کو بنیاد بنا کر پوری دنیا کے ادیبوں نے عالمی سطح کے سیاسی منظر نامے، معاشرتی سطح پر افراد کے عدم تحفظ، قتل و غارت اور جبر و استحصال کو موضوع بنایا۔ گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ کے اس واقعے کے اثرات پر مختلف ناول لکھے گئے، دستاویزی فلمیں بنائی گئیں، کہانیاں لکھی گئیں، موسیقی اور مصوری کے ذریعے اس واقعے کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوششیں کی گئیں۔ امریکہ سے تعلق رکھنے والے ادیبوں نے اس واقعے کو ایک عام فرد کی زندگی سے متعلق کر کے موضوع بنایا اور اپنی تخلیقات میں دکھایا کہ اس حادثے نے عام فرد کی داخلی اور نجی زندگی پر کس طرح اثرات مرتب کیے۔ کین کیلفس (Ken Kelfus) نے اپنے ناول A Disorder , Peculiar to the Country میں ایک شادی شدہ جوڑے کی زندگی کو دکھایا گیا ہے کس طرح وہ باہمی رضامندی سے اپنی زندگی میں ایک دوسرے سے علاحدہ ہوے اور نائن الیون نے کس طراھ ان کی زندگیوں کو متاثر کیا؟۔ نائن الیون کے واقعے کی بنیاد پر ہی ایک اور ناول لکھا گیا جس کی کہانی رچرڈ ریویو کی ایک معروف تصویر کی بنیاد پر لکھی گئی۔ یہ ناول ڈان ڈیلیلیو کا ایوارڈ یافتہ ناول The Falling Man ہے۔ اس میں رچرڈ نے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی بلند و بالا عمارت سے ایک گرتے ہوے آدمی کو دکھایا ہے۔ اسی طرح کے بے شمار ناول مثلاً نیئیل کا ایوارڈ یافتہ ناول Netherland ، ولیم گبسن کا ناول جس کا عنوان Pattern Recognition,جوناتھن سیفران کا ناول Extremely Loud and Incredibly Close، وغیرہ لکھے گے جن میں نائن الیون کے اثرات کو بہ خوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ امریکہ میں مقیم پاکستانی ادیب محسن حمید کا ناول The Reluctant Fundamentalist بھی اسی تناظر میں لکھا گیا ہے۔ اس ناول میں دکھایا گیا ہے کہ پاکستان سے تعلق رکھنے والے کردار چنگیز کی زندگی پر نائن الیون کے واقعے نے اپنے

بھیانک نتائج کس طرح مرتب کیے کہ اسے اپنے خوابوں اور اور اپنی خوشگوار زندگی سے دستبردار ہونا پڑا۔ ناول میں واضح کیا گیا ہے کہ ستمبر ۲۰۰۱ کے حادثے کے بعد امریکی سیاست کس طرح عام افراد کی نجی زندگی پر اثر انداز ہوئی۔ نائن الیون کے اس حادثے کو عالمی سطح پر تو بیان کیا گیا لیکن نائن الیون کا واقعہ پاکستان پر کس طرح اثر انداز ہوا اس حوالے سے ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں۔

> "گیارہ ستمبر کا واقعہ، جو اگرچہ پاکستان سے کوسوں دور کسی اجنبی سرزمین پر رونما ہوا مگر اپنے عالمی ہمہ گیر اثرات، اور پاکستان کی مخصوص سیاسی و دفاعی نوعیت اور جغرافیائی حیثیت کے پیشِ نظر، پاکستان کی سیاست، معیشت، معاشرت اور شہری زندگی کے امن و سکون پر شدت سے اور منفی طور پر اثر انداز ہوا، اردو فکشن اور شاعری دونوں میں بھرپور طریقے سے رونما ہوا ہے "[1]

یہ جنگ بنیادی طور پر تو امریکہ اور افغانستان کے درمیان تھی لیکن ان دو ملکوں کی لڑائی میں پاکستان بھی براہ راست اس سے متاثر ہوا۔ پاکستانی معاشرے میں بسنے والے افراد پر اس سانحے کے اثرات رونما ہوئے ۔انہیں معاشی و معاشرتی سطح پر کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جبکہ امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کی زندگی تو تباہ و برباد ہو گئی۔ ان سے ان کا روزگار چھین لیا گیا۔ انہیں بے جرم کی سزائیں دے کر بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا۔ دنیا بھر کے ادیبوں نے اس موضوع پر کھل کر لکھا۔ پاکستان سے تعلق رکھنے والے ادیبوں نے بھی اس موضوع کو اپنی تخلیقی سطح پر برتا اور مختلف اصناف ادب میں اس کا اظہار کیا۔ اردو ادب میں شاعری، افسانے اور ناول میں اس موضوع کا خاصا برتا گیا ہے۔ اردو افسانوی ادب پر نظر ڈالی جائے تو اس موضوع پر سب سے زیادہ افسانے میں لکھا گیا۔ اردو افسانہ نگاروں نے گیارہ ستمبر کے واقعے کے بعد ہونے والے قومی و عالمی سطح کے سیاسی منظر نامے کے ساتھ ساتھ اس کے تہذیب و معاشرت پر ہونے والے اثرات کو بیان کیا۔ اردو افسانہ میں اس موضوع کو برتنے والے افسانہ نگاروں میں مسعود مفتی (شناخت)، نیلوفر اقبال (آپریشن مائیس)، افتخار نسیم (پردیسی)، عرفان احمد عرف (رئیلٹی شو)، خالدہ حسین (ابنِ آدم) فرخ ندیم (چودھویں رات کی سرچ لائٹ)، مصطفیٰ کریم (عجائب گھر)، عاطف سلیم (لاوقت میں ایک منجمد ساعت)، منشاء یاد (ایک سائیکلوسٹائل وصیت نامہ)، ڈاکٹر رشید امجد (مجالِ خواب)، علی حیدر ملک (دہشت گرد چھٹی پر ہیں)، مسعود صابر (سرخ)، محمد حمید شاہد (سئور گ میں سئور)، زاہدہ حنا (نیند کا زرد لباس)، پرویز انجم (مہاجر پرندے)، عطیہ سید (بلقیان کا بت) اہم نام ہیں۔ اردو ناول کی بات کریں تو سانحہ ستمبر کے بعد معاشرے پر رونما ہونے والے سیاسی و سماجی

اثرات، فوجی آپریشن، عدم تحفظ، معاشرتی انتشار، معیشت کا عدم استحکام، فرد کی داخلی و نجی زندگی کی تنہائی، بے بسی اور الجھن، نفسا نفسی کا عالم اور خود غرضی جیسی کیفیات کو اردو ناول میں بھی موضوع بنایا گیا۔

ناول کی صفت یہ ہے کہ یہ اپنے وقت کے تہذیبی اور ثقافتی عوامل کو بہت آسانی اور کفایت کے ساتھ اپنے دامن میں جگہ دے سکتا ہے۔ اس کی جڑت انسانی معاشرے سے ہوتی ہے اور اس کے تمام عناصر کے اندر انسانی معاشرت ہی کی پیش کش ہوتی ہے۔ آئے روز جو انقلابات انسانی سماج میں رونما ہوتے ہیں ان کو بہت تسلی اور خوبی کے ساتھ ناول بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ انسانی زندگی کے تمام خد و خال ناول کی وسعت کے سبب نمایاں طور پر ناول میں دیکھے، سنے اور بیان کیے جاسکتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر احسان اکبر کہتے ہیں

> "ناول کا اہم عمل کسی بڑے مسلے یا سوال کی رونمائی ہے۔ ایسے بڑے سوال کا ذکر جسے زندگی کے پیچ در پیچ تعامل اور ایک دوسرے سے مربوط رشتوں کے سلجھاؤ کے بغیر سمجھنا بھی محال ہو۔ اپنے عہد کی پوری زندگی کی دستاویز بننے کا شرف اس حوالے سے ایک بڑے ناول ہی کا مقدر ہے۔ ناول علم کے پھیلنے اور اسرار کی کشود کے عہد میں ابھرنے اور مقبول ہونے والی صنفِ فن ہے۔ اپنے اسلوب اور مزاج کے اعتبار سے یہ صنف عقلی بھی ہے اور عمومی بھی"[2]

یعنی ناول ایک جیتی جاگتی زندگی کی وہ تصویر ہے جس کو ناول نگار اپنے ماحول اور اردگرد سے حاصل کیے گے رنگوں سے بھرتا ہے۔ داستان کی طرح اس میں غیر حقیقی اور غیر عقلی بیانیے موجود نہیں ہوتے۔ زمانہ موجود میں جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے ناول کا خام مواد اسی منظر نامے سے جمع کیا جاتا ہے اور ناول کے آہنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر شبیر احمد قادری لکھتے ہیں

> "ناول کا خام مواد گرد و پیش کے انسانی اور کائناتی احوال سے اخذ کیا جاتا ہے۔ ناول نگار جتنا صاحبِ مطالعہ اور عمیق مشاہدے کا حامل ہو گا، اس کے ناول میں اثر پذیری کا دائرہ اسی قدر کشادہ ہو گا"[3]

اس میں کوئی شک نہیں کہ ناول کی کامیابی اور اس کے اندر پیش کی جانے والی کہانی کی اثر پذیری کا انحصار ناول نگار کے ماہرانہ ہنر پر بھی ہے۔ ایک اور اہم بات کہ ناول نہ صرف عصری حالات کی تصویر ہاتا ہے بل کہ اسے انسانی زندگی کی تاریخ بھی کہا جاسکتا ہے۔ ایک نقاد کے بقول

"ناول اور تاریخ کا تعلق بہت گہرا ہے، ناول تاریخ کو جزوی طور پر اپنے اندر سمیٹ کر تاریخ کو کہانی کی شکل عطا کرتا ہے تو یہی تاریخ ناول کو بنیادی مواد اور ماخذ بھی فراہم کرتی ہے"[4]

اگر ہم اردو ناولوں کی بات کریں تو ہمیں معلوم ہے کہ اردو ناول دیگر زبانوں کے ناولوں کی نسبت اگرچہ ابھی کم عمری کا حامل ہے مگر یہ بات مسلمہ ہے کہ اردو ناول نے اپنے ہر دور کی تصویر کو بہترین انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ایسے بیسیوں اردو ناول موجود ہیں جو نہ صرف اپنے فن پر پورے اترتے ہیں بل کہ ان کے اندر اپنے معاصر حالات کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ اکیسویں صدی میں بھی اردو ناول اپنی پرواز کو مزید اوپر اٹھاتے ہوے، اعلا فکری اور فنی تقاضوں کو پورا کرتے ہوے اور عصریت کی آواز بنتے ہوے اپنا سفر جاری رکھے ہوے ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ اکیسویں صدی کا اہم ترین واقعہ نائن الیون کا سانحہ ہے۔ اس سانحے نے پوری دنیا کو ابھی تک اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق فرد نے اس کے اثرات کو محسوس کیا ہے۔ نیے انداز اور نئی آواز کو اردو ناول نے جدت کے ساتھ پیش کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے شاعر علی شاعر اپنی کتاب جدید اردو ناول میں لکھتے ہیں۔

"آج کے اردو ناول کا پھیلاؤ اس قدر زیادہ ہے کہ اس میں سبھی کچھ سما جاتا ہے اور ناول نگار کا فن یہی ہوتا ہے کہ وہ ناول میں تمام کردار، سماجی رویے اور مختلف پہلو کی تصویر کشی کرے، اسی پھیلاؤ کا نتیجہ ہے کہ اردو ناول علاقے سے نکل کر شہر، شہر سے نکل کر ملک اور ملک سے نکل کر بین الاقوامی سطح تک پھیل گیا ہے"[5]

ایک اور پہلو جو اکیسویں صدی کے ناول کے حوالے سے اہم ہے وہ یہ کہ ناول خود ہی سماج اور حالات وواقعات سے متاثر نہیں ہوا بل کہ اس نے معاشرے اور افراد کو بھی اپنی فکر اور مضامین سے متاثر کیا ہے اور ایک تاریخ مرتب کی ہے۔ اکیسویں صدی کے ناول کے حوالے سے شاعر علی شاعر لکھتے ہیں۔

"جہاں اس صدی میں ناولوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے وہاں ان کا معیار بھی بلند ہوا ہے متعدد ناول ایسے بھی ہیں جن کو ہم ناقابل فراموش کہہ سکتے ہیں کیوں کہ انہوں نے قارئین کے اذہان و قلوب کو متاثر کیا ہے۔ ان ناولوں کی تعریف میں لکھے گئے مضامین، تبصرے اور ناقدینِ فن کی مثبت آرا اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ یہ اردو ادب میں اضافہ ہی نہیں بل کہ تاریخ اردو ادب کا حصہ بھی ہے"[6]

پاکستان وہ سرزمین ہے جس نے براہِ راست نائن الیون کے اثرات کو پنے اوپر محسوس کیا ہے۔ امریکا کی افغانستان پر جنگ کی وجہ سے پاکستانی لوگوں نے اس کے مصائب کو اپنے اوپر مسلط ہوتے بھی پر کھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے ادیب نے بھی اس سانحے کے مضمرات یا ثمرات کو اپنی تخلیق کا حصہ بناتے ہوے محفوظ کیا ہے۔ ایسے بے شمار ناول اردو زبان میں تخلیق ہوے ہیں جن میں نائن الیون کی آواز اور تصویر کشی کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر محمد اشرف کمال اکیسویں صدی کے اردو ناول کے حوالے سے لکھتے ہیں

> "اردو ناول میں اکیسویں صدی کے آغاز ہی سے تخلیقیت اور ادبیت کی جگہ موضوعیت نے لے لی ہے۔ میڈیا ،پروپیگنڈا، اشتہار بازی، کاسمیٹکس انڈسٹری، بنیاد پرستی، شدت پسندی، دہشت گردی، عالمی طاقتوں کا گٹھ جوڑ، ملٹی نیشنل کمپنیوں کا عالمی معیشت پر کنٹرول، معاشی دباو، عالمی تنازعات، نائن الیون کا سانحہ، افغان امریکا جنگ، عراق کی صورتِ حال، بے شمار ایسے موضوعات ہیں جو کہ اردو ناول کی زینت بنتے جارہے ہیں" [7]

کوئی شک نہیں کہ اردو ناول نے اس دورانیے میں بے شمار موضوعات اور ٹیکنیکس کو اپنایا ہے۔ جدید دنیا کی تمام خصوصیات کے رنگوں کو اردو ناول کی بنت میں شامل دیکھا جاسکتا ہے۔ عالمی استعماری نظام اور اس کی چالیں، امریکی عمل داری اور جنگی جنون کی بازگشت، مسلمانوں کے اندر پائی جانے والی بے چینی اور بے قراری، جہادی تنظیموں کی سرگرمیاں، پاکستانی شہروں پر خود کش حملوں کے مناظر، سیاسی کش مکش ،انفارمیشن ٹیکنالوجی کے جلوے وغیرہ سب اردو ناولوں کے موضوعات کا حصہ بن کر اردو ناول کی دنیا میں آباد ہوے ہیں۔ اردو ناول نگار محض اپنے تخیل کی بنیاد پر ان واقعات کو نہیں بیان کر رہا بل کہ اس نے ان سب حالات وواقعات کو تقریبا آپنے ارد گرد وقوع پذیر ہوتے ہوئے مشاہدہ بھی کیا ہے۔ اسی مشاہدے اور تجربے کا نتیجا ہے کہ اردو ناول نگاروں نے بہت کامیابی کے ساتھ ان تمام مناظر کو اپنے ناولوں کے اندر پیش کرنے میں کامیاب ہوے ہیں۔ ان ناول نگاروں میں مستنصر حسین تارڑ، آمنہ مفتی، نیلم احمد بشیر، محمد الیاس، شیراز دستی، نکہت حسن، شفق، محسنہ جیلانی، ایم اختر وغیرہ شامل ہیں۔

ج۔ نائن الیون کے اردو ناول پر موضوعاتی اثرات

ستمبر ۲۰۰۱ میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر ہونے والے حادثے نے تمام دنیا کی سیاست، سماج، معاشرت اور ادب پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے۔ انگریزی ادب میں اس موضوع پر وسیع پیمانے پر تحقیق کی گئی جس کے نتیجے میں کئی انگریزی فلموں، دستاویزی فلموں اور مصوری کی مدد سے اس سانحے کو دکھایا اور سمجھایا گیا۔ پاکستان اور امریکہ میں بسنے والے پاکستانی مسلمان اس واقعے کے نتیجے میں امریکی عتاب کا خصوصی نشانہ بنے تو پاکستانی ادیبوں نے بھی ان حالات کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور انہیں ناول اور افسانے کا موضوع بنایا۔ اردو ناول کی بات کریں تو اس موضوع پر سب سے پہلے مستنصر حسین تارڑ کا ناول قلعہ جنگی اہم حیثیت رکھتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا ناول قلعہ جنگی موضوعاتی لحاظ سے نائن الیون کے اثرات سے نمودار ہونے والے حالات وواقعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ قلعہ جنگی میں بہت موثر انداز میں چند مجاہدین کی شکستہ حالی کا ذکر ملتا ہے۔ یہ ناول دراصل امریکہ کی نہتے افغانوں پر جنگ مسلط کرنے اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے المیے کی ایک داستان ہے۔ امریکی ظلم وبربریت اور بمباری کے نتیجے میں لاکھوں انسانی زندگیوں کے چراغ گل ہوئے۔ اس ناول میں سماجی المیہ پایا جاتا ہے جسے قاری بہت شدت سے محسوس کرتا ہے۔ یقیناً جنگ انسانی زندگی کے لیے بے شمار مسائل کو جنم دیتی ہے اور اس کے نتیجے میں ایک ایسی تباہ کن تصویر سامنے آتی ہے جس کا تصور کرنا ہی بڑا بھیانک ہوتا ہے۔ قلعہ جنگی ایک رزمیہ کہانی ہے جو بے یارومددگار مجاہدین کی آخری سانسوں کی تصویر بہت کربناک طریقے سے پیش کرتی ہے۔ یہ مجاہدین جو رنگ ونسل کے لحاظ سے الگ الگ ہیں مگر اپنے مقصد کے لحاظ سے ایک گروہ اور جسم کا حصہ معلوم ہوتے ہیں، ایک قلعے کے تہ خانے میں محصور ہیں۔ ان مجاہدین کے نفسیاتی اور جذباتی صدمے کی یہ داستان ان ہزاروں برسرپیکار مجاہدین کی داستان بھی ہے جو امریکہ کی سپر پاور کے سامنے سینہ سپر ہو کر جہاد میں مصروف عمل رہے۔ یہ ناول ان بدترین واقعات کا بیانیہ بھی ہے جو دورانِ جنگ افغانستان کی سرزمین پر وقوع پذیر ہوئے۔ امریکہ کی خود ساختہ تہذیب اور انسانی حقوق کی پاسداری کے جھوٹے دعووں کی کلی بھی اس ناول کے ذریعے کھولی گئی ہے۔ اپنی طاقت کے نشے میں چور ایک سوکالڈ مہذب ملک کس طرح نہتے انسانوں کو تہ تیغ کرتا رہا اور کس طرح کے مظالم ظہور پذیر ہوتے رہے یہ سب کچھ ناول قلعہ جنگی کے اندر موجود ہے۔ ڈاکٹر امجد طفیل قلعہ جنگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "افغانستان میں رونما ہونے والے انسانی المیے نے بہت سے لکھنے والوں کو آپنی طرف متوجہ کیا۔ اس میں قلعہ جنگی اس اعتبار سے اہم تحریر ہے کہ اس میں ایک ناول

نگار کی حساس طبع نے سیاسی معاملات میں الجھنے کی بجائے انسانی المیے کو اپنا موضوع بنایا ہے"[8]

حمیرا اشفاق کا یہ جملہ امریکہ کی بالادستی کا جامع اشارہ ہے۔

"انسان کی کس قدر جنون میں مبتلا ہو سکتا ہے اور کس طرح اپنے ہی ہم جنسوں کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے اس ناول میں موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔" قلعہ جنگی افغانستان پر امریکی حملے کی کتھا ہے"[9]

مستنصر نے اس ناول کا انتساب " ان افغان بچوں کے نام کیا جو بارودی سرنگوں کی وجہ سے اپاہج ہو گئے "[10]

اس کے بعد ایک اور ناول جو اسی موضوع پر لکھا گیا ہے آمنہ مفتی کا ہے۔ جس کا عنوان " آخری زمانہ " ہے۔ مثال پبلشرز فیصل آباد سے شائع ہونے والے اس ضخیم ناول کا انتساب ہی اس انسان کے نام ہے جو قاتل بھی ہے اور مقتول بھی۔ جو ظالم بھی ہے اور مظلوم بھی۔ ایک خوبصورت دیہات میں بسنے والے خالد، جمیلہ، راحیلہ، باغ علی، شاہین اور دیگر ضمنی کرداروں پر مشتمل یہ ایک دلچسپ ناول ہے جس کا خمیر گاؤں سے اٹھتا ہے۔ ناول کے پس ورق پر معروف ناول نگار اور افسانہ نگار عبداللہ حسین کی رائے درج ہے جس میں وہ ناول کے بارے میں لکھتے ہیں۔ " مجھے آمنہ مفتی کا 'آخری زمانہ' واقعی پسند آیا اور میں چاہوں گا کہ ہر شخص اس کو پڑھے۔ لہٰذا میں نے اس ناول کو پڑھ ڈالا۔ "[11]

آمنہ مفتی جو بہترین افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار ہیں۔ اکیسویں صدی میں بہ طور ناول نگار بھی اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ آپ کا ناول " آخری زمانہ " درحقیقت تیزی سے اختتام کی طرف دوڑتے ہوئے زمانے کی ایک تمثیل سمجھا جا سکتا ہے۔ ناول " آخری زمانہ " ایک ہمہ پہلو ناول ہے جس میں ایک ہی وقت میں سیاست، صحافت، سماجی عدم مساوات، شہری و دیہاتی زندگی کا نقشہ اور نائن الیون کے بعد دہشت گردی جیسے موضوعات کو جگہ دی گئی ہے۔ غریب انسانوں کی زندگیوں کا نقشہ ہو یا امیر زادوں کی زندگی کی تلخیاں، جہادی تنظیموں کی سرگرمیاں ہوں یا معصوم مسلمانوں کا دہشت گرد گروہوں کے اعلیٰ کار بننے وغیرہ کا ذکر " آخری زمانہ " کی کہانی کے اندر موجود ہے۔ محمد حمید شاہد آخری زمانہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس ناول میں جس طرح کرداروں کو تراشا گیا ہے، جس طرح گہرے مشاہدے کو کام میں لا کر دیہات اور دہی زندگی کو لکھا گیا ہے، رشتوں کی اونچ نیچ کو کہانی میں متن کیا گیا ہے، سیاسی اکھاڑ پچھاڑ سے متاثر ہوتی زندگیوں کو دکھایا گیا ہے، نائن الیون کے بعد کی سفاکی اور دہشت گردی کو گرفت میں لیا گیا ہے۔ یہ سب ایک ہی وقت میں اتنا حقیقی اور تخلیقی ہو جاتا ہے کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو اسی کہانی کا حصہ سمجھنے لگتا ہے"[12]

گاؤں کے خوبصورت قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ گاؤں کے رسم و رواج، گاؤں کی عورتوں کے مخصوص لب و لہجے اور مکالمات کے ساتھ کہانی ایک دلچسپ انداز سے آگے بڑھتی ہے اور ناول کے پہلے حصے میں افغانستان پر حملہ روس کی خبر سنائی جاتی ہے۔ ناول کی کہانی میں افغانستان اور روس کی جنگ کی خبروں کو بھی ساتھ ساتھ موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے بعد ناول میں بابری مسجد کے شہید ہونے کے واقعے کو بیان کیا جاتا ہے۔ جس سے ناول کی کہانی ایک نئے موڑ سے گزرتی ہے اور ناول کے تمام کرداروں کی زندگی میں ایک تاسف بھرا احساس جنم لیتا ہے۔ یہ ناول دیہاتی زندگی سے شروع ہو کر افغانستان پر روس کا حملہ، بابری مسجد کا انہدام، امریکہ کی مدد سے طالبان کی القاعدہ تنظیم کی تشکیل، پاکستانی اور امریکی معاشرے کا تضاد، اسلامی خلافت کا ناسٹلجیا، اسلامی تعلیمات، بیسویں صدی کے آخری حصے کے عالمی منظر نامے، سیاسی و عسکری قوتوں کا طرز عمل، افغان مجاہدین کا رہن سہن، مذہبی لبادہ اوڑھ کر دھوکہ دہی کرنے والے ملاؤں، آئی ایس آئی، کارگل جنگ کی ناکامی، سقوط ڈھاکہ کا صدمہ، مارشل لاء کے نتیجے میں ہونے والی سیاسی و سماجی پابندیاں، اور خاص طور پر نائن الیون کا ہونے والا حادثہ اور اس کے نتیجے میں معاشرے میں بسنے والے عام افراد کی خانگی زندگی، ان کا عدم تحفظ، عالمی سیاسی منظر نامے کے ان کی نجی زندگیوں پر اثرات، نوجوان لڑکے لڑکیوں میں پیدا ہونے والے محبت کے جذبات اور اس کے نتیجے میں محسوس ہونے والی تنہائی، محبت کی تمام کیفیات، کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ بلقیس ریاض ناول کے حوالے سے لکھتی ہیں۔

"نیلم نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کا نقشہ کچھ ایسا بیان کیا تھا۔ یوں لگنے لگا جیسے مین ہیٹن کے لوگوں کے قریب میں کھڑی تھی اور اس کی تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔"[13]

یہ ناول اپنے اندر وسیع سطح پر موضوعات رکھتا ہے۔ ناول میں مرکزی کرداروں کے علاوہ ضمنی کرداروں کی بہتات ہے۔ آمنہ مفتی نے اپنے ناول "آخری زمانہ" میں دکھایا ہے کہ نائن الیون کے واقعے نے

ایک تیسرے ملک پاکستان کے عام شہریوں کی زندگی کو کس قدر جھنجھوڑ کے رکھ دیا ہے کہ ان کا ذہنی سکون اور زندگی کی بنیادی قدروں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔

"مگر جینا دشوار کتنا تھا۔ تہور علی خان کی صحت گر رہی تھی۔ سارا سارا دن بیٹھے خبریں اور تبصرے، اور پھر بلڈ پریشر، دل پہ دباؤ، عجیب عجیب خبریں تھیں۔ جانے نائن الیون نے کسی جناتی مشین کا بٹن دبا دیا تھا اور ساری دنیا قرونِ وسطی کے جنگجو اور وحشی دور میں لوٹ گئی تھی۔ تورا بورا، قندھار، ہرات، مزار شریف، قابل، قلعہ جنگی۔ نام تھے کہ تہذیب و ثقافت کے خرابے، جہاں امریکی طیارے گدھوں کی طرح اڑتے پھر رہے تھے۔"[14]

ناول میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ القاعدہ تنظیم جس کی تشکیل کرنے والوں میں امریکہ شامل ہے۔ روس افغان جنگ میں روس کو شکست دینے کے لیے امریکہ نے اس تنظیم کا ساتھ دیا مگر بعد میں اس تنظیم میں شام مجاہدین کو ہی دہشت گرد قرار دے دیا اور ان کے خلاف جنگ شروع کر دی جس کی زد میں مشرق وسطی کے ساتھ ساتھ پاکستان بھی لپیٹ میں آیا۔ اس حوالے سے آمنہ مفتی لکھتی ہیں۔

"پاکستان بحیرہ عرب کی بندرگاہ، اور شام میڈی ٹرینئین کی، درمیان میں افغانستان، ایران، عراق، ادھر نیچے کویت، اور پھر سعودی عرب، دنیا کا قلب، اگر امریکہ یہاں پنجے گاڑ لیتا ہے۔ تو سارا یورپ، سارا افریقہ۔ سارا ایشیاء اس کی براہِ راست زد میں آ جائیں گے۔ تو بس یہ تو ایک واضح بات ہے۔ نہ صدام کا قصور ہے، نہ ملا عمر کا نہ کسی اور کا۔ سعودی عرب کے بعد مصر کو چھوڑ کے لیبیا ہے یہ ہی اس کا جرم ہے۔ اسامہ کو یہ سب معلوم ہے۔ اسی لیے وہ سعودی عرب میں امریکی فوج کے آنے کے خلاف تھا۔ بے شک اسے جگایا خود امریکہ نے ہے۔[15]

اس طرح آمنہ مفتی کا یہ ناول دو مرکزی کرداروں خالد اور راحیلہ کی کھیل جنگ جنگ سے شروع ہوتا ہے اور ایک طویل سفر اختیار کر کے پوری دنیا کو اس جنگ میں لپیٹ لیتا ہے جس میں انسان کہیں کھو جاتا ہے اور ہر طرف جنگ کے بلند و بالا شعلے ہی نظر آتے ہیں۔ نام نہاد مذہبی سیاسی راہنما اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے لیے اعلیٰ نظریات کو حقیر جان کر انہیں بدنام کرتے ہیں۔ اور یوں خیر اور شر کے اس تصادم میں کئی نسلیں بھینٹ چڑھتی ہیں۔

نائن الیون کے تناظر میں ایک اور اہم ناول بھارت سے تعلق رکھنے والے معروف افسانہ نگار اور ناول نگار عبدالصمد کا ہے۔ وہ اپنے پہلے ناول "دو گز زمین" کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ یہ ان کا پہلا ناول ہے جو تقسیم بر صغیر سے قبل کے دور سے لیکر سقوط ڈھاکہ تک کے دور کے مسلمانوں کی سیاسی، سماجی، معاشرتی صورتحال کا عکاس ہے۔ عبدالصمد کا ناول "جہاں تیرا ہے یا میرا" ایک معروف ناول ہے جس میں ہندوستان سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے ساتھ پیش آنے والے سیاسی، سماجی اور مذہب کی بنیادوں پر ہونے والے تعصبات کو بخوبی بیان کیا گیا ہے۔ ناول ۵۵ مختصر اور طویل اکائیوں میں تحریر کیا گیا ہے جو ایک دوسرے کو یوں جوڑتی ہیں کہ پورے ناول کے مطالعہ کے دوران کہیں بھی پلاٹ میں جھول نظر نہیں آتا۔ کہانی ایک روانی سے آگے بڑھتی ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کو درپیش چیلنجز کی عکاسی کرتے ہوئے اختتام پزیر ہوتی ہے۔ ناول کے موضوعات میں ہندوستان میں بسنے سے مسلمانوں کی سلگتی ہوئی زندگی کو بیان کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان جنہیں تقسیم ہندوستان کے بعد کبھی حقوق کی آزادی میسر نہ ہوئی۔ نائن الیون کے واقعے کے بعد ان کی زندگی اور اجیرن کر دی گئی۔ نائن الیون کا واقعہ جہاں امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں پر اثر انداز ہوا وہیں ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان اس کے اثرات سے دوچار ہوئے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی مفلسی، بیروزگاری اور اور مفلوک الحالی کے ساتھ ساتھ یہ ناول نائن الیون کے بعد مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے ظلم، ان کی نجی و معاشرتی زندگی کے انتشار اور مذہب کی بنیادوں پر ان سے متعصبانہ سلوک کو بھی ناول میں واضح کیا گیا ہے۔ یہ ایسے عوامل ہیں جنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی شناخت کو مٹانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ دنیا میں پہلے ہی ہندوستانی مسلمانوں کا تعارف پست حال اور قابل رحم قوم کے طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن نائن الیون کے واقعے کے بعد دہشت گردی کو بھی مسلمان سے جوڑ کر ان سے نفرت کی ایک لازمی وجہ گھڑی گئی اور یوں ان سے ناروا سلوک ایک نئے سرے سے آغاز کیا گیا۔ راشد اس ناول کا مرکزی کردار ہے جس کا تعلق ہندوستان کے متوسط زیریں طبقے سے ہے اور وہ ساری زندگی روزگار کی تلاش میں دربدر پھرتا ہے اور بالآخر امریکہ چلا جاتا ہے۔ راشد کے امریکہ جانے کے بعد یہ بھید کھلتا ہے کہ امریکہ میں جانے والے مسلمانوں کو کس اذیت کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ان پر کس درجے کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے اور ان سے جانبدارانہ سلوک کر کے انہیں ان کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ ناول کے مرکزی کردار راشد کے ماموں قدیر امریکہ میں رہتے ہیں اور ایک خوشحال زندگی گزارتے ہیں مگر نائن الیون کے سانحے کے بعد ان کی زندگی کو طرح طرح کے خدشات لاحق ہوتے ہیں جن کا بیان ناول نگار نے اس طرح کیا ہے۔

"نائن الیون کے بعد سب لوگ بڑے خائف تھے کہ اب قدیر ماموں کی وہ حیثیت رہے گی یا نہیں، کیا وہ اسی طرح آتے رہیں گے؟ طرح طرح کی خبریں وہاں سے آتیں اور سب کے دل دھڑکتے رہتے۔ لگ تو یہی رہا تھا کہ قدیر ماموں اور ان جیسے لوگوں کی زمین وہاں تنگ ہو رہی ہے۔ ہلکی پھلکی زندگی اچانک بھاری ہو گئی ہے اور وہ لوگ وہاں سے کسی بھی وقت نکالے بلکہ دھکیلے جاسکتے ہیں۔"[16]

ناول میں نائن الیون کے واقعے کو ایک دوسرے زاویئے سے بھی دیکھا گیا ہے کہ امریکہ میں مقیم وہ مسلمان جو خوشحالی اور آسودگی کہ بلکہ عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے تھے۔ نائن الیون کے بعد ان کی آزادانہ حیثیت اور عیش و عشرت ختم ہو گئی اور وہ مفلوک الحال ہوئے تو انہوں نے نائن الیون کا واقعہ برپا کرنے کے ذمہ داران کو طعن و تشنیع اور لعنت ملامت کا نشانہ بنایا اور انہیں بری طرح کوسنے لگے۔ ناول سے ماخوذ مندرجہ ذیل اقتباس اسی تناظر کو بیان کرتا ہے۔

"نائن الیون برپا کرنے والوں کو سرعام گالیاں دے رہے تھے۔ چند لوگوں کی ناعاقبت اندیشی اور مزہبی جنون نے لاکھوں افراد کی زندگیاں خطرے میں ڈال دیں۔۔۔۔ ہمیں اس ملک نے دولت سے مالامال کر دیا۔ یہاں رہتے تو پیسے پیسے کو تڑپتے رہتے، پیسے ہی جوڑنے میں ساری زندگی گزر جاتی۔ پھر بھی بے شمار چیزوں کی حسرت باقی ہی رہ جاتی ۔۔۔ بیٹھے بیٹھے ہماری زندگیوں کو برباد کر دیا۔ جس ملک نے لاکھوں انسانوں پر احسان عظیم کیا، اس کا یہ صلہ دیا انہوں نے۔۔۔"[17]

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ناول نگار نے مرکزی کردار راشد کے ذریعے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ نائن الیون کے واقعے کے بعد امریکی ذہنوں میں مسلمانوں کا کیا تصور ابھرا کہ انہوں نے مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دے کر انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیں اور معاشی ابتری میں گھیرا کہ امریکہ تو ایک طرف ان کا ہندوستان میں رہنا آسان نہ رہا۔

نائن الیون کے بعد امریکہ اور افغانستان کے دو ملکوں کے مابین ہونے والی جنگ کے نتائج ہندوستانی اور پاکستانی مسلمانوں کو بھگتنا پڑے۔ جس کا گہرا تاثر اردو ادب نے بھی قبول کیا۔ نائن الیون کے سانحے کے تناظر میں لکھے جانے والے ناولوں میں ایک اور اہم ناولٹ "میں دہشت گرد ہوں" ہے۔ جسے بھارت سے تعلق رکھنے والی معروف ناول نگار محسنہ جیلانی نے تخلیق کیا ہے۔ شہرزاد پرنٹرز کراچی سے شائع ہونے والا یہ ناولٹ

سانحہ نائن الیون کے پس منظر میں تخلیق کیا گیا ہے جو ضخامت کے اعتبار سے مختصر سہی لیکن اپنے موضوع کی وسعت کے اعتبار سے لائق تحسین ہے۔ مصنفہ نے اس ناولٹ میں مغربی طرز زندگی، طرز معاشرت اور مسلمانوں کے بارے میں متعصبانہ رائے کو بڑے واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ کہانی کا کینوس ساٹھ کی دہائی سے سے شروع ہو کر نائن الیون کے سانحے کے بعد کی طرز زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ ناول کی کہانی احمد علی اور سعیدہ کے دو مرکزی کرداروں کی زندگی کا احاطہ کرتی ہے جس بہتر مستقبل کی تلاش اور اپنے دکھوں کا علاج ڈھونڈنے کے لیے پاکستان کا رخ کرتے ہیں۔ مگر پاکستان میں جاری سیاسی و سماجی انتشار اور بے یقینی کی فضا انہیں مجبور کرتی ہے کہ وہ پاکستان سے لندن ہجرت کر جائیں۔ مغربی ملک میں پیدا ہونے والے ان کے بچے بالخصوص زرینہ نئی نسل کی آئینہ دار ہے۔ زرینہ کے ماں باپ ایک ان جانے خوف میں پلٹے پاکستان لوٹ جاتے ہیں مگر زرینہ کا بیٹا جس کا تعلق ایک بالکل نئی نسل سے ہوتا ہے وہ اپنی زندگی کے بلند و بالا خوابوں کی تکمیل کے لیے امریکہ کا رخ کرتا ہے۔ مگر جیسے ہی نائن الیون کا واقعہ رونما ہوتا ہے تو ان کے لیے ایک انتشار اور اذیت کی فضا قائم ہو جاتی ہے جس میں سانس لینا تک محال ہے اور زندگی گزارنا تو آگ میں جلنے کے مترادف ہو جاتا ہے۔

> "اس نے ٹی وی آن کیا۔ سی این این پر دیکھا کہ نیو یارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے جڑواں ٹاور جل رہے تھے۔ بہت سے لوگ اس کی کھڑکیوں سے کود رہے تھے۔ نیچے لوگوں کی بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ہر طرف دھواں اور خاک تھی۔ دو طیارے ان ٹاوروں سے ٹکرائے تھے۔ ایک دہشت کا عالم تھا۔۔۔ اس کے بعد حالات یکدم بدل گئے۔ لوگوں کا رویہ بدل گیا، تیور بدل گئے۔ وہ تمام مسلمانوں کو دہشت گرد سمجھنے لگے۔ لوگ ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں کرتے۔ نظریں نہیں ملاتے۔"[18]

ناول سے ماخوذ مندرجہ بالا اقتباس اس فکر کو روشن کرتا ہے کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کا یہ حادثہ اگرچہ ہندوستان اور پاکستان سے دور کسی اور ملک میں ہوا مگر اس کے نتائج ہندوستان میں بسنے والے عام افراد کی زندگیوں پر بھی اثر انداز ہوئے۔ سمجھ انتشار پیدا ہوئے جس میں افراد کی باہمی شناخت مٹتی چلی گئی اور وہ ایک دوسرے سے نظریں چراتے رہے۔۔

> "وہ کہہ رہی تھی، نیو یارک ائیر پورٹ پر میری اس قدر بے عزتی ہوئی۔ اس قدر مجھے humiliate کیا گیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ میرا خیال ہے میں پہلی اور آخری مسلم

عورت نہیں ہوں جس کے ساتھ اس قدر ہتک آمیز رویہ اختیار کیا گیا اور بد تمیزی کے
لیے میرے دل میں نفرت ہی نفرت ہے۔"[19]

مصنفہ نے ناولٹ میں تین نسلوں کی کہانی کے ذریعے اکیسویں صدی میں اسلام دشمنی اور عراق و افغانستان پر مسلط ہونے والے نئے سامراجیوں کی اقتدار کی ہوس کو خوب بیان کیا ہے۔ مغربی ممالک میں بسنے والے لوگ مسلمانوں کو کس قدر تنگ نظری سے دیکھتے ہیں اور ان کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتے ہیں۔ مفاد پرست مغربی معاشرہ اقتدار کی ہوس میں کس قدر بنیادی انسانی اقدار سے محروم ہو گیا۔ یہ ناول اس موضوع کا مکمل اور کامیاب احاطہ کرتا ہے۔ مصنفہ نے اپنے ناولٹ میں نائن الیون کے بعد یورپی ذہنی فضا کو بیان کیا ہے جس میں ہر مسلمان کو دہشت گرد سمجھا جاتا ہے ان کے روزگار چھین لیے جاتے ہیں، ان پر طرح طرح کی پابندیاں مسلط کر دی جاتی ہے۔ گلی کوچے اور شاہراہ سے گزرتے وقت ان کی تلاشی لی جاتی ہے اور معمولی سے معمولی شک کی بنا پر انہیں موت کی سزا سنادی جاتی ہے۔ "میں دہشت گرد ہوں" میں مابعد نائن الیون مغرب میں آباد مسلمانوں کے نفسیاتی اور جذباتی احساسات کو مختلف کرداروں سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناول میں اسلاموفوبیائی فکر کا بھی اندازہ ہوتا ہے جس کے تحت بے گناہ مسلمانوں کو محض اس لیے اذیت کا نشانہ بنایا گیا کیوں کہ وہ اسلام پر عمل پیرا اور مسلمان ہیں۔ ناول میں مغربی اقوام کی اس متعصبانہ سوچ کی بھی عکاسی ہے جس کے تحت وہ ہر مسلمان کو دہشت گرد قرار دے کر صفہ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اس ناول میں زرینہ کا کردار مذکورہ بالا تمام مسائل کی عکس بندی کا کامیاب نمونہ ہے۔

محمد شیراز دستی کا ناول "ساسا" اس ضمن میں ایک اور اہم ناول ہے۔ "ساسا" (جو ناول میں ایک پرندے کا نام ہے) شیراز دستی کے تہذیبی شعور اور فکری مرتبے کا اظہاریہ ہے۔ انہوں نے اس ناول میں عشق و محبت، طرز معاشرت، تہذیبی منظر نامہ اور تاریخی شعور جیسے متنوع موضوعات کو کامیابی سے سمیٹا ہے۔ یہ ناول بنیادی طور پر ناول کے مرکزی کردار سلیم کی تلاش محبت کی داستان ہے جس کا آغاز تو ڈیرہ غازی خان کے ایک گاؤں سے ہوتا ہے اور پھر اس میں امریکہ کی کلوراڈو یونی ورسٹی کی طالبات اینا اور جینی بھی شامل ہو جاتی ہیں لیکن بالآخر اپنے گاؤں کی منزہ ہی کو اپنی منزل بناتا ہے۔ تلاش محبت کا یہ طویل سفر سلیم کو اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حالات، تہذیبی و ثقافتی رویئے اور میڈیائی حقیقتوں سے روشناس کرواتا ہے۔ ناول کا قاری اس ناول میں دو تہذیبوں کا تصادم، سماجی عدم مساوات، عدم تحفظ، سیاسی انتشار اور محنت کش طبقے کے استحصال کا بغور مطالعہ کرتا ہے۔ خالدہ حسین ناول کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔

"مشرق اور مغرب کی تہذیب کا تقابلی مطالعہ بہت سے لکھنے والوں کا موضوع رہا ہے مگر "ساسا" ہمیں دونوں تہذیبوں کے روزمرہ زمینی واقعات میں نئی معنویت پیدا کرتا نظر آتا ہے۔"[20]

ناول میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح نائن الیون کے واقعے کے بعد سامراجی طاقتوں کی پالیسیاں کمزور اور ترقی پذیر ملکوں کے محنت کش طبقے کے لیے زہر قاتل ثابت ہوئیں۔ نائن الیون کے بعد پیش آنے والے واقعات اور میڈیا کے غیر منصفانہ تبصروں نے پاکستانی اور دوسرے مسلمانوں کو ہر قوم کی نظروں میں مشکوک کر کے ان کی اصل شناخت سے محروم کر دیا۔ اسلامی افکار کو اسلامی بنیاد پرستی کا نام دے کر دنیا بھر میں ہونے والے ظلم و ستم کو غیر منصفانہ طریقے سے پاکستان اور مسلمان سے جوڑ دیا گیا۔ امریکہ نے نائن الیون کا انتقام جس بے دردی سے لیا اس کی ایک جھلک مندرجہ بالا اقتباس میں ظاہر کی گئی ہے۔

"نائن الیون کے بعد سے اب تک دہشت گردوں نے تو امریکہ کے صرف پانچ فوجی مارے ہیں مگر امریکہ مسلمان ملکوں میں کم از کم پانچ لاکھ لوگوں کو براہِ راست یا بالواسطہ عشقِ خاک کر چکا ہے۔ "[21]

نائن الیون کے واقعے کے بعد نئے ورلڈ آرڈر نے کمزور ملکوں کا استحصال کرنا شروع کر دیا اور اسلام اور دہشت گردی کو ایک ہی سکے کے دو رخ قرار دیا جس کی بھاری قیمت خاص طور پر پاکستان نے ادا کی۔ ناول نگار نئے ورلڈ آرڈر کے اس منظر نامے کو یوں بیان کرتے ہیں۔

"نئے ورلڈ آرڈر میں قبلہ رخ نہ ہونے والوں کی سزا موت تعین ہوئی تھی۔ سادہ اس اصول سے واقف نہ تھا سو اس سے فرعون وقت کی نماز قضا ہو گئی اور جو ایسا کرتے ہیں انہیں ٹھنڈی چھاؤں والی قبروں میں اترنے کا حق نہیں دیا جاتا۔ نئے نظام انصاف کی رو سے اس کے چیتھڑے اڑائے جانے تھے سو اڑائے گئے۔ ماتم کیسا؟ آہ و فغاں کیونکر؟"
22

امریکہ نے نائن الیون کے بعد مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دے کر ان پر ظلم و ستم کی ایک نئی روایت کا آغاز کر دیا جس کے فروغ کے لیے میڈیا نے اپنا بھرپور کردار ادا کیا اور پاکستانی مسلمانوں کو ان جرائم

کی سزادی جن میں وہ ملوث ہی نہ تھے۔ "ساسا" اپنی نوعیت کا ایک منفرد ناول ہے۔ محبت کی تلاش سے شروع ہونے والا یہ ناول پاکستان اور امریکہ کی سرزمینوں کے تفاوت کی داستان ہے۔ اس ناول میں محبت کو بنیاد بنا کر تہذیبی تصادم اور ٹکراؤ کے بیانیہ کو بھی متن کا حصہ بنایا گیا ہے۔ سلیم جو محبت کی حقیقت کی تلاش میں پاکستان سے امریکہ پہنچتا ہے وہاں مابعد نائن الیون ہونے والے واقعات کے زیر اثر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ مشرق و مغرب میں نہ صرف جغرافیائی دوری ہے بلکہ سوچ، فکر، معیشت، سیاست وغیرہ کے لحاظ سے بھی بہت بڑی دوری پائی جاتی ہے۔ سلیم جہاں ایک طرف ایک امریکی لڑکی کے پالتو پرندے کو پورے اہتمام کے ساتھ زمین میں دفن کرنے کی رسم ادا کرتا ہے وہیں وہ اپنے ملک پاکستان میں ڈرون حملوں میں اور خودکش حملوں میں مارے جانے والے لوگوں کے اڑتے ہوئے ٹکڑوں اور بے گور و کفن لاشوں یاد کر کے روتا ہے۔ یہ تفاوت اسے اس قدر ذہنی اذیت کا شکار کرتا ہے کہ وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ سلیم کی محبت کی تلاش جو انفرادی مسئلہ دکھتی تھی اب عالمی سطح پر ایک المیے کی صورت نمودار ہوتی ہے کہ یہ محبت محض لڑکے لڑکی کی محبت کو محیط نہیں ہونی چاہیے بل کہ عالم انسانی کو بھی اسی اس کی سخت ضرورت ہے۔ دو تہذیبوں اور دو الگ نسلوں کے نفسیاتی زاویوں کو نائن الیون کے بعد کے حالات کے تحت بیان کرتا یہ ناول معاصر اردو ناولوں میں ایک بہترین اضافہ ہے۔

محمد الیاس کا ناول "برف" پاکستان کے جہاد کشمیر کے حوالے سے حالات کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ ناول نجی زندگی کے ساتھ ساتھ جہاد کشمیر کے تمام تر حالات کو بھی بہت باریک بینی سے پیش کرتا ہے۔ سیاسی لحاظ سے پاکستان کے حالات و واقعات کو اس ناول کے اندر بیان کیا گیا ہے۔ اس کا مرکزی تھیم جہاد کشمیر کے اندر غیر ذمہ دارانہ کرداروں کی نشاندہی اور شدت پسند اسلامی سوچ رکھنے والوں کی نفسیات کا بیانیہ ہے۔ شدت کی حد تک اسلامی اصول و قواعد کو اپنانے اور حالات کے مطابق لچک نہ دکھانے پر جو سماجی المیے وجود میں آتے ہیں ان کا ذکر اس ناول کا اہم پہلو ہے۔

بھارت کے اردو ناول نگار شفق کا ناول "بادل" مابعد نائن الیون بھارتی عوام کی ذہنی اور نفسیاتی صورت حال کی داستان معلوم ہوتا ہے۔ ایسا مخلوط معاشرہ جہاں مسلمان ہندو اور دیگر مذاہب کے ماننے والے اکٹھے رہتے ہوں، کا بیان اس ناول کی وساطت سے پیش کیا گیا ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی کے بعد امریکا کے افغانستان پر حملے کے حوالے سے ہندوؤں کی مکروہ ذہنیت کا ذکر بھی ناول کے متن کا حصہ ہے۔ ہندوؤں کا پاکستان اور مسلمانوں کے حوالے سے نفرت آمیز رویہ اس ناول کا اہم موضوع ہے۔ اگرچہ ناول میں ایک

لڑکی سلمہ اور نعیم کی کہانی بھی بیان کی گئی ہے مگر اس کے متن میں امریکہ کی جنگی کاروائیوں اور مسلمانوں پر مصائب کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔

"جاگنگ پارک" نگہت حسن کا ناول ایک معاشرتی المیہ کی صورت سامنے آتا ہے۔ مابعد نائن الیون پاکستان کے اندر لوگوں کی ذہنی اور جذباتی صورت حال کی عکاسی پارک کی علامت کے طور پر کی گئی ہے۔ جاکنگ پارک محض پارک نہیں بل کہ ایک جیتے جاگتے گھر کا نقشہ ہے جس کے باسی طرح طرح کی بکھری سوچ اور فکر رکھتے ہیں۔ کلی طور پر ساری قوم ایک جذباتی صدمے کا شکار نظر آتی ہے۔ سیاسی، مذہبی اور معاشرتی لحاظ سے ایک منتشر صورت اس ناول میں پیش کی گئی ہے۔ نائن الیون کے بعد پاکستان کی بگڑتی معاشی صورت حال کس طرح لوگوں کے ذہنوں پر دباؤ ڈال رہی ہوتی ہے اس کا تجزیہ بھی کہانی کی صورت اس ناول میں شامل ہے۔

ایم اختر کا ناول "ایک لوسٹوری ایک ایٹمی قیامت" ماضی، حال اور مستقبل کا ایک منظر نامہ ہے۔ اس ناول میں گلوبلائزیشن کے زیر اثر کرداروں کو پیش کیا گیا ہے۔ اسامہ، وکرام، ڈونیا وغیرہ اس ناول میں نفسیاتی الجھنوں کے مبلغ ہیں۔ وکرم خالص ہندو متعصب سوچ کا حامل ہے جب کہ اسامہ ایک معتدل اور مثبت سوچ کا حامل بتایا گیا ہے۔ مابعد نائن الیون عالمی منظر نامے کو اس ناول میں پیش کرنے کے بعد امریکی جارحیت اور امریکہ میں مسلمانوں کے مسائل اور پاکستان بھارت کی ممکنہ ایٹمی جنگ کو پیش کر کے اس کے سنگین نتائج بیان کیے گئے ہیں۔ دراصل مصنف جنوبی ایشیائی لوگوں اور مغربی لوگوں کی فکر کو پیش کر کے عصر حاضر کے فکری اور نظریاتی زاویوں اور باہم اختلافات اور ٹکراؤ کی موجودگی کو بیان کر رہا ہے۔

نیلم احمد بشیر بھی عصر رواں کی اہم ادیبہ ہیں۔ آپ کا ناول "طاوس فقط" رنگ کئی لحاظ سے اہم سمجھا جا سکتا ہے اس میں آپ نے نائن الیون کی تباہ کاریوں کو انسانی رویوں، نفسیات اور تہذیبوں کے تصادم کے طور پر پیش کیا ہے۔ مابعد نائن الیون امریکہ اور دیگر مغربی ممالک میں رہائش پذیر مسلمانوں کو جس قسم کے تعصب اور نسل پرستی کا سامنا کرنا پڑا اس ناول اس کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ ایک پاکستانی خاندان اور چند امریکی کرداروں کی مدد سے مصنفہ نے بہترین انداز میں اس کش مکش کو پیش کیا ہے جو مابعد نائن الیون ظہور پذیر ہوئی یا جو صدیوں سے انگریزوں کے دماغوں میں مسلمانوں کے خلاف پر سرِ پیکار رہی ہے۔

اسی طرح اکرم بریلوی کا ناول "حسرت تعمیر" نائن الیون کے بعد کے حالات و واقعات کا بیانیہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ ناول اس لیے بھی منفرد ہے کہ انہوں نے یہاں مختلف نسلوں اور اقوام کے اشتراک کو بیان کر

کے ایک عالمی اتحاد اور یگانگت پیدا کرنے کی صلح دی ہے۔ ان اشتراکات سے جنم لینے والے مسائل اور فوائد کا ذکر بھی اس ناول کے اندر پایا جاتا ہے۔ آج کا اردو ناول پہلے کی نسبت ایک جدید بیانیے کا آئینہ دار ہے جس میں عصرِ حاضر کے عمومی اور خصوصی موضوعات شامل ہیں۔

i۔ گلوبلائزیشن اور اردو ناول کا بیانیہ

اردو ادب میں عالم گیریت (Globalization) ایک مقبول اصطلاح کے طور پر رائج ہے۔ یہ اپنی نوعیت میں ایک دلچسپ سرگرمی ہے۔ ایک طرف تو گلوبلائزیشن کی وجہ سے ساری دنیا ایک گاوں کی مانند طہور پذیر ہوئی ہے اور عالمی انسانی معاشرت کو فروغ دے چکی ہے۔ یہ عالمی انسانی معاشرت نیے منظر نامے میں بہت پیچیدہ صورتِ حال اختیار کر چکی ہے۔ اس قربت نے جہاں انسانوں کو بہت سے فائدے دئے ہیں وہیں اس کے بے شمار مضر اثرات بھی عالمی سماج پر مرتب ہو رہے ہیں۔ تیسری دنیا کے ممالک کو اس عالم گیریت نے عجیب دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔ ایک طرف یہ ممالک اس تحریک کی وجہ سے عالمی معاشی دھارے میں شامل ہو رہے ہیں، آئے روز نئی ایجادات پر تصرف حاصل کر رہے ہیں، ٹیکنالوجی سے واقف ہو رہے ہیں، جدید زرعی آلات کو استعمال کرنا سیکھ رہے ہیں، علوم کی نئی اقسام اور استعمال سے بہرہ مند ہو رہے ہیں، وباؤں کی صورت میں دنیا بھر کے تعاون سے مستفید ہو رہے ہیں وہی عالمی طاقتوں میں طاقت کے حصول کی جنگ میں بری طرح پسے بھی جا رہے ہیں۔ ان ممالک کا انفراسٹرکچر چوں کہ بہت کم زور ہوتا ہے اس لیے یہ بڑی طاقتوں کے مفادت کے تحفظ میں چاہتے ہوے اور نہ چاہتے ہوے بھی استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ گلوبلائزیشن کے اسباب پر اگر غور کیا جائے تو اس کے اسباب میں دو اہم محرکات نظر آتے ہیں۔

1۔ انسانی علوم و فنون میں ترقی اور جدید سائنسی ایجادت اور تیکنالوجی میں بے پناہ اضافہ کائنات پر دسترس کی کوششیں اور عالمی میڈیا کی جدت ساری دنیا کو ایک پیج پر لا چکی ہیں۔ ساری دنیا کو یہ اکٹھ عالم گیریت کو فروغ دیتا رہا ہے۔

2۔ بڑے ممالک کے درمیان طاقت کے حصول اور اپنے معاشی حالت کو مستحکم کرنے کی کوششوں نے بھی گلوبلائزیشن کو فروغ دیا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کو اپنی مصنوعات (ٹیکنالوجی، الیکٹرونکس، اسلحہ وغیرہ) کی فروخت کے منڈیوں کی ضرورت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ سفارتی طریقے سے یا زبردستی دوسرے ممالک کو اپنے زیرِ اثر کر کے اپنی مصنوعات کو فروخت کرتے ہیں۔ دنیا کی صورت حال پر اگر نظر کی جائے تو یہ

دوسری وجہ ہمیں زیادہ مستعمل دکھتی ہے۔ عالمی معاشی نظاموں کی چپکلش نے بھی عالم گیریت کو تیزی سے فروغ دیا ہے۔

کوئی شک نہیں کہ عالم گیریت گزشتہ چار دہائیوں سے ایک مقبول تحریک کے طور پر بھی رائج ہے جس نے دنیا بھر میں سیاست، تہذیب، ثقافت، سماج اور معیشت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ عالم گیریت کو ایک ایسا وسیع تصور کہا جا سکتا ہے جو جغرافیائی حد بندیاں ختم کر کے دنیا بھر کے لوگوں کو سماجی، ثقافتی اور سیاسی نظام کی بدولت ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔ عالم گیریت کی ابتداء تو انسانی زندگی کے آغاز سے ہی ہوئی مگر عالم گیریت کے قدیم اور جدید تصورات میں واضح فرق نظر آتا ہے۔ عالم گیریت کا قدیم تصور اقتدار اور دوسری قوموں پر تسلط کا تصور ہے جس میں سمیری تہذیب، سلطنت مقدونیہ، سلطنت روم اور عرب سلطنت شامل ہیں جنہوں نے دوسری قوموں پر جنگیں مسلط کر کے اقتدار کے حصول کو یقینی بنایا۔ جبکہ عالم گیریت کے جدید تصورات میں سرد جنگ سے کام لیا جاتا ہے۔ اس تصور میں نئی ٹیکنالوجی، نئی ایجادات اور نئی معاشی پالیسیوں کے تحت کمزور ممالک کو معاشی لحاظ سے اپنے زیر اثر کیا جاتا ہے اور طاقتور ملک اس نظام کے ذریعے اپنے آپ کو برتر محسوس کرواتے ہیں۔ عالم گیریت کا ہدف ایک ایسا سرمایہ دارانہ نظام قائم کرنا بھی ہے جس میں مختلف اقسام کی اشیاے ضرورت بنا کر پوری دنیا میں اس کے صارفین پیدا کیے جا سکیں۔ سرمایہ کار اپنے اس مقصد کے لیے مختلف مصنوعات بنا کر میڈیا کے ذریعے ایک زبردست تشہیری مہم چلاتے ہیں جس سے دنیا کے ہر ملک کے لوگوں کا ذہن بنایا جاتا ہے کہ وہ ان اشیاء کی خریداری کر سکیں۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں نائن الیون کے حملے کے بعد عالم گیریت کے تصور میں ایک اور تبدیلی آئی جس میں پوری دنیا اور بالخصوص ہندوستان اور پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں پر دہشت گردی کا لیبل لگا کر ان سے جانبدارانہ سلوک کیا گیا اور طرح طرح کے عتاب کا نشانہ بنایا گیا۔

اکیسویں صدی کے اردو ناول میں عالم گیریت کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں اس صدی میں لکھے جانے والے ناولوں میں محمد عاصم بٹ کا ناول دائرہ اہم ہے جس میں عالم گیر سطح پر انسان کی شناخت کے مسئلے کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس ناول میں انسان کی شناخت کے مسئلے کو عالم گیر ثقافتی تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ خالدہ حسین کا کاغذی گھاٹ ۲۰۰۲ میں منظر عام پر آیا۔ اس ناول میں نئی صدی کی سائنسی ایجادات کے عام فرد کی زندگی پر اثرات کی نقش گری کی گئی ہے۔ نئی صدی کا انسان طب، سائنس، ٹیکنالوجی غرض کسی

بھی شعبہ ایجادات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے علاوہ انہوں نے عالم گیریت کی نئی معاشی پالیسیوں سے استحصال شدہ کمزور اور متوسط طبقے کے حالات و واقعات کی عکاسی کی ہے۔

بانو قدسیہ کے ناول حاصل گھاٹ میں عالم گیریت کے تہذیبی پہلو کا اجاگر کیا گیا ہے۔ فلیش بیک تکنیک میں لکھے گئے اس ناول کا بنیادی موضوع دو تہذیبوں کا تصادم ہے۔ بہتر مستقبل اور بہتر طرز معاشرت کی تلاش میں پاکستان سے ہجرت کرنے والے خاندان خواہ امریکہ میں بستے ہیں یا کسی اور یورپی ملک میں، وہ نئی تہذیب کو اپنی زندگی کا پوری طرح حصہ بنانے میں ناکام رہتے ہیں اور یوں انہیں ان کی زندگی میں داخلی سطح پر کرب اور اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مرزا اطہر بیگ کا ناول "غلام باغ" ۲۰۰۲ میں منظر عام پر آنے والا ناول ہے جس میں عالم گیریت کے ایک اہم تصور غلبہ اور اقتدار کی نفسیات کو بیان کیا گیا ہے۔ اکیسویں صدی میں ایک فرد دوسرے فرد پر اور ایک ملک دوسرے ملک پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ ناول میں دکھایا گیا ہے کہ پوری دنیا میں اسلام اور مسلمان دہشت گرد اور شدت پسند سمجھا جاتا ہے۔ مسلمان اکیسویں صدی میں ایک تحقیر آمیز حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مختلف تکنیک میں لکھا گیا یہ ایک دلچسپ ناول ہے جس کے متعلق عبداللہ حسین ناول کی طبع ثانی کا دیباچہ لکھتے ہوئے بیان کرتے ہیں۔

> "غلام باغ اپنے مقام میں اُردو ناول کی روایت سے قطعی ہٹ کے واقع ہے، بلکہ انگریزی ناول میں بھی یہ تکنیک ناپید ہے۔ اس کے ڈانڈے یورپی ناول خاص طور پر فرانسیسی پوسٹ ماڈرن ناول سے ملتے ہیں۔"[23]

خس و خاشاک زمانے مستنصر حسین تارڑ کے قلم سے نکلا ایک شاہکار ناول ہے۔ یہ ناول تقسیم سے قبل کے حالات، تقسیم کے وقت خون ریز فسادات، پاکستانی سیاست کا اتار چڑھاؤ اور سقوط ڈھاکہ کی داستان ہے جو ۱۹۳۰ سے لیکر ۲۰۰۱ تک کے عرصے میں تین نسلوں کی کہانی کو بیان کرتا ہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک، مستنصر حسین تارڑ کی فنکارانہ بصیرت کے حوالے سے لکھتے ہیں جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ

> " مستنصر حسین تارڑ کا نوعِ انسان کے ساتھ تعلق بہت گہرا اور عملی ہے۔ ان کی پیش بینی نہایت شفاف اور واضح ہے جن کا بنیادی مرکز برصغیر کے مسلمانوں کے حقوق ہے۔ دوسری طرف اس کے ہاں اس اشرافیہ کا بھی ذکر ہے جو مغربی نو آبادیاتی عناصر کے زیرِ اثر ہے اور سیاسی سماجی بحرانوں سے فراریت کی راہ تلاشتی رہتی ہے۔ فراریت

کی اس فکر کے زیرِ اثر لوگ معروضی حقائق کو صحیح معنوں میں سمجھ سکتے ہیں نہ ہی ان سے کوئی سبق سیکھ سکتے ہیں۔"[24]

عالم گیریت کے زیرِ اثر یہ ناول ہندوستان میں بسنے والے سکھوں اور مسلمانوں کے ان حالات کی عکاسی کرتا ہے جن میں انہیں مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ انگریزی ذہن سے سوچیں اور اپنی روزمرہ زندگی میں انگریزی مصنوعات کا استعمال کریں۔ انگریز قوم کس طرح دوسری قوموں کو اپنا دست نگر رکھنا چاہتی ہے اور کس طرح اپنی ہوس اقتدار میں ان کا معاشی و سماجی استحصال کرتی ہے یہ ناول اس صورتحال کی خوب عکاسی کرتا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان نے اپنے ایک مضمون میں "خس وخاشاک زمانے کو گیبرئل گارشیا مارکیز کے شہرہ آفاق ناول "تنہائی کے سو سال (One hundred years of solitude) " کے ہم پلہ قرار دیا۔"[25]

ناول میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر ہونے والے حملے کے بعد اس کے مسلم اقوام پر اثرات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ نائن الیون کے بعد عالمی طاقتوں نے اپنے مفادات کے حصول کے لیے میڈیا کا غیر منصفانہ استعمال کر کے اہل یورپ کے دلوں میں مسلمانوں کے لیے نفرت کا بیج بو دیا اور یوں ان کے لیے اسلام اور دہشت گردی ایک ہی سکے کے دو رخ نظر آنے لگے۔

عالم گیریت کے تناظر میں آمنہ مفتی کا ناول " آخری زمانہ " ایک اہم حوالہ ہے۔ آمنہ مفتی کا یہ ضخیم ناول اپنے اندر وسیع موضوعات رکھتا ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے یہ اپنے انداز کا واحد ناول ہے جس میں مذہب، سیاست، سماج، تہذیب، ثقافت، انسانی رویئے، انسانی نفسیات، مذہبی شدت پسندی، اخلاقی راہ روی، عشق و محبت کی رومانوی کیفیات اور عالمگیر عصری منظر نامے کا خوبصورتی سے احاطہ کیا گیا ہے۔ اس ناول میں عالمگیر سطح کے سیاسی، سماجی اور مذہبی پہلوؤں کا کامیاب بیان ملتا ہے۔ آمنہ مفتی نے اپنے ناول " آخری زمانہ " میں عالم گیری مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کا ناول گویا ایک ایسا مرقع ہے جس میں ہر صفحہ پر پوری دنیا میں ہونے والے سیاسی، سماجی اور تاریخی حقائق بکھرے پڑے ہیں۔ انہوں نے حال کے رشتے کو ماضی سے جوڑنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب بھی رہی ہیں۔ موجودہ زمانہ جو کہ اکیسویں صدی کا زمانہ ہے اور اس میں پوری دنیا کے ممالک میں امریکہ بہادر کے اثرات ہیں۔ امریکی اشرافیہ براہِ راست اور بالواسطہ طور پر ہر ملک کی سیاسی اور عسکری طاقتوں کو اپنے زیر اثر رکھتی ہے اس ناول میں بھی نائن الیون کے بعد ہونے

والے ان مسائل کا بیان کیا گیا ہے جن کا تعلق عالم گیر مسائل سے ہے۔ ناول میں آمنہ مفتی نے خاص طور پر ریاست مدینہ کی عالم گیر توسیع کو بھی بیان کیا ہے کہ جس طرح ایک بے آب و گیاہ ریگستان سے ایک گروہ اٹھا اور اپنے ولولہ ایمان سے اور ارادہ کی پختگی سے انہوں نے آہستہ آہستہ پوری دنیا کے اکثر ممالک کو اپنے زیر نگیں کر لیا۔

> "مسلمان کہاں سے اٹھے ؟، سعودی عرب سے، پھر ان کی فتوحات رکی نہیں۔ کیوں کہ یہ سب بری سرحدیں تھیں۔ اور جہاں سمندر آئے ان کو بھی پار کر لیا گیا۔ پاکستان بحیرہ عرب کی بندر گاہ اور شام میڈی ٹرینئین کی، درمیان میں افغانستان، ایران، عراق ادھر نیچے کویت اور پھر سعودی عرب، دنیا کا قلب، اگر امریکہ یہاں پنجے گاڑھ لیتا ہے تو سارا یورپ، سارا افریقہ اور سارا ایشیاء براہِ راست اس کی زد میں آ جائیں گے۔" [26]

مندرجہ بالا اقتباس میں ناول نگار نے ایک مثال کے ذریعے یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ مسلمانوں کے پاس ابتداء میں کوئی جنگی ٹیکنالوجی یا عسکری ساز و سامان نہیں تھا اور نہ ہی آج کے دور کی طرح بحری و بری راستے تھے مگر پھر بھی وہ ایک جذبے کے تحت اٹھے اور دنیا کو اپنے زیر نگیں کرنے کا خواب شرمندہ تعبیر کیا۔ اسی طرح امریکہ جس نے سعودی عرب میں اپنا اثر و رسوخ جمایا ہے۔ اگر وہ سعودی عرب کی اشرافیہ کو اپنے جذبہ اقتدار سے مغلوب کر لیتا ہے تو اس سے مراد یہی ہے کہ آہستہ آہستہ امریکہ پورے یورپ، افریقہ اور ایشیاء پر قبضہ کر لے گا کیوں کہ سعودی عرب دنیا کا مرکز ہے اور مرکز کو اپنا قلعہ بنا کر دنیا کی چاروں سمت سے کے ممالک کو معاشی و سیاسی لحاظ سے فتح کرنا امریکہ کے لیے کچھ مشکل نہیں۔

ناول میں ایک اور جگہ مصنفہ نے معاشرے کو سمندر سے تشبیہ دیتے ہوئے عالم گیری تصورات کی توجیہ کی ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح سب دریا سمندر میں آ کر ملتے ہیں اور ایک ہو جاتے ہیں اسی طرح آج کے دور کا معاشرہ ایک ایسا سمندر بن چکا ہے جس میں تمام دنیا کے معاشروں کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے گویا اکیسویں صدی کا معاشرہ ایک ایسا سمندر بن چکا ہے جو میں دنیا کے تمام معاشرے ضم ہو چکے ہیں۔

> "بیٹے معاشرہ ایک سمندر کی طرح ہے۔ اِدھر کی روئیں ادھر کی روئیں، اس میں آ آ کر ملتی رہتی ہیں۔ اگر پیچھے جاؤ تو تمہارے بڑے بھی کہیں سے تاشقند آئے تھے۔ پھر

ہندوستان آنا، تاریخ ایسی باتوں سے ہی تو عبارت ہے اور پھر دیکھو معاشرے کے رسوم ورواج، سب کچھ اس ہجرت، تجارت، سفر پر ہی منحصر ہیں۔" [27]

آمنہ مفتی کے ناول "آخری زمانہ" کا مطالعہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی اور حال کی سیاست پر انہیں مکمل عبور حاصل ہے۔ وہ تاریخ سے مکمل واقفیت بہم پہنچاتی ہیں۔ تاریخ سے سبق حاصل کرنے کا شعور مصنفہ نے جابجا اپنے ناول میں بکھیرا ہے اور اکیسویں صدی کے قاری کو دعوت دی ہے کہ وہ ماضی کے آئینے میں اگر حال کے تناظر کو دیکھے تو اس کے لیے ان کے دور کا انتشار سمجھنا کوئی ناممکن بات نہیں۔ اقوام متحدہ اور دوسرے عالمی ادارے جس عالم گیریت کی تحریک کو فروغ دے رہے ہیں آمنہ مفتی نے اس کے اہداف کا بھی مکمل احاطہ کیا ہے۔ انہوں نے عصری منظر نامے پر موجود دنیا کے بڑے ممالک کی عالم گیریت کی تحریک میں وابستگی کو بھی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ مختلف ممالک کا عالمگیری اداروں کا ممبر ہونا اور نا ہونا اقوام عالم پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے اس کی ایک جھلک ناول نگار نے یوں بیان کی ہے۔

"اگر روس لینڈ لاکڈ نہ ہوتا، اگر ترکی NATO کا ممبر نہ ہوتا تو دنیا کی سیاست میں بہت فرق ہوتا۔ عربوں اور ترکوں کا دور گزر گیا کیوں؟ کیوں کہ ان کے دماغ جہاں تک ترقی کر چکے تھے اس کا پھل انہوں نے کھالیا تھا۔ They have regained that blessed seat . اب انگریز کی باری تھی۔ سفید فام اور ایک خوبصورت نسل کی بازی۔ روس میں جو کچھ ہوا وہ اس کے جغرافیے کا بڑا منطقی انجام تھا اور اب کچھ جو ہمارے ہاں ہونے جا رہا ہے وہ ہمارے جغرافیے کا منطقی انجام ہے۔" [28]

ماضی میں ایک ملک جب اپنی برتری کا احساس دلانا چاہتا تھا تو اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ دوسرے کمزور ملکوں پر اپنا تسلط جمانے کے لیے اور پر جنگ مسلط کرے اور یوں ان پر قبضہ کر لے۔ پھر قابض ملک مفتوح ملکوں کو ایسی سیاسی، معاشی اور سماجی گورکھ دھندوں میں سلجھاتے ہیں کہ کمزور ممالک کا مستقبل ایک غیر یقینی فضا اور عدم تحفظ کی حالت میں پروان چڑھتا ہے اور پھر وہ دنیا کے منظر نامے پر تیزی سے ترقی کرتے ہوئے دوسرے ممالک کے ساتھ قدم سے قدم نہیں ملا پاتے اور یوں وہ پیچھے رہ جاتے ہیں اور دوسرے ملکوں کے زیر احسان اپنے مستقبل کی سمت کا تعین کرتے ہیں۔ ناول میں یہی دکھایا گیا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ ایک بڑی عالمگیر تحریک کا بنیادی ہدف ہے اور اس ہدف کے حصول کے لیے کمزور ممالک پر جنگیں مسلط کر کے ان کو مفتوح بنانا ماضی کی روایت کا حصہ رہا ہے۔

ناول میں گلوبلائزیشن کے اس ہدف کو بیان کیا گیا ہے جس میں امریکہ بہادر کا مقصد ہے کہ وہ پوری دنیا پر اپنی برتری جمائے۔ امریکی اشرافیہ اپنے اہداف کی تکمیل کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہے۔ اسے اس بات سے غرض نہیں کہ دنیا کے پسے ہوئے ممالک میں متوسط طبقے کی زندگیاں کس الجھن اور کس عذاب کا شکار ہیں۔ اسے غرض ہے تو صرف اپنی برتری اور اپنے اقتدار سے اسی لیے وہ طرح طرح کی حکمت عملیوں سے اپنے مقاصد کے حصول کی جتن کرتا رہتا ہے۔

> "ارے امریکہ بہادر کو کیوں بھولتے ہو؟ سب اس کی پلاننگ ہے۔ مجاہدین بھی تو اسی کے لڑکے ہیں اور وہ خفیہ والے بھی، پروگرام یہ تھا کہ وہاں ایک کنٹرولڈ ورلڈ وار ہو گئی۔ مختصر جنگ، اقوامِ متحدہ بیچ میں کود ے گا۔ کشمیر کے تین حصے کیے جائیں گے۔ ایک انڈیا کا، ایک ہمارا اور تیسرا حصہ جو وسطی ایشیاء کو راستہ دے گا، آزاد رکھا جائے گا۔ پھر افغانستان میں جو مرضی ہو اس بائی پاس سے سیدھے تاجکستان اور پھر آگے۔۔۔"[29]

ایک اور اہم ناول بھارت سے تعلق رکھنے والے مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار عبدالصمد کا ناول " جہاں تیرا ہے یا میرا " گلوبلائزیشن کے حوالے سے اہم ہے۔ اس ناول میں انہوں نے خاص طور پر اکیسویں صدی کے معاصر منظر نامے کو موضوع بنایا ہے جس میں عالم گیر سطح پر مسلمانوں سے ہونے والے جانب دارانہ سلوک کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ناول میں انہوں نے پوری دنیا کے مسلمانوں اور بالخصوص ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کی سیاسی و سماجی صورتحال کو منعکس کیا ہے۔ ناول میں جہاں نائن الیون اور اس کے تناظر میں ہونے والی سیاسی کش مکش کو بیان کیا گیا ہے وہاں اس ناول میں عالم گیریت کی تحریک کے مقاصد کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ عالم گیریت جو بیسویں اور اکیسویں صدی کی سب سے جاندار تحریک ہے، نئی ٹیکنالوجی کی آمد سے یہ تیز رفتاری سے سب ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ اس ناول میں عالمی سیاسی و سماجی پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کس طرح اپنی مصنوعات پیدا کر کے دوسرے ملکوں میں میڈیا کے ذریعے ایک تشہیری مہم چلاتے ہیں جس سے دوسرے ملکوں میں خریدار پیدا ہوتے ہیں اور یوں اس تحریک کے معاشی مقاصد کا حصول ہوتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار راشد ہے۔ جس کا تعلق ہندوستان کے ایک زیریں متوسط طبقے سے ہے۔ وہ روزگار کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے کہ اچانک اس کی قسمت کی کنجی کھلتی ہے اور اسے امریکہ کا ویزا مل جاتا ہے۔ وہ امریکہ جاتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ تو ایک الگ ہی دنیا ہے جس نے تمام انسانوں کو اپنے اندر سمویا ہوا ہے۔ وہ امریکہ کی معیشت اور سیاست سے بہت متاثر ہوتا ہے لیکن اس کے

ساتھ ساتھ اسے ہندوستانی مسلمان ہونے کی وجہ سے جانبدارانہ سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ متعصبانہ سلوک ہر شاہراہ اور ہر مقام پر ہوتا ہے۔ امریکی سیکیورٹی اور امریکی عوام بھی اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ناول میں دکھایا گیا ہے عالم گیریت کی تحریک جس کے سب سے بڑے علم بردار یورپ اور امریکہ ہیں وہ کس طرح اپنی پالیسیوں کے تحت پوری دنیا کے نظام کو اپنے ہاتھ میں لینے کا خواب رکھتے ہیں اور اسے روز بروز شرمندہ تعبیر بھی کر رہے ہیں۔

> "اس ملک کے احسان کو بھی ہمیشہ ذہن میں رکھیئے کہ اس نے لاکھوں ایسے آدمیوں کو اپنی بانہوں میں جکڑ رکھا ہے جن کی وجہ سے آپ کے ملک میں بے شمار لوگ دنیا کی آسائشوں سے معمور ہو رہے ہیں." [30]

ناول نگار نے بیان کیا ہے کہ روزگار کی تلاش میں لوگ جب دوسرے ملکوں بالخصوص امریکہ کا رخ کرتے ہیں تو انہیں اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ ایک ایسی سرزمین ہے جس نے تمام لوگوں کو یہ دعوت دے رکھی ہے کہ وہ اپنی اپنی شناخت کے مطابق یہاں زندگی بسر کریں لیکن ساتھ ہی اس کا منافقانہ رویہ تب سامنے آتا ہے جب وہ ان لوگوں کی انفرادی شناخت مٹانے کے درپے ہوتا ہے۔ امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں پر یہ منظر کھلتا ہے کہ وہ امریکہ کی ایسی سازشوں کا شکار ہیں جو بظاہر تو بڑی خوش آئیند لگتی ہیں لیکن حقیقت میں اندر ہی اندر مسلمانوں کے وجود اور ان کی شناخت کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہیں۔

> "وہ زمانہ اور تھا، یہ زمانہ اور ہے۔ ہم نے سینکڑوں برس دنیا کے ایک بڑے حصے پر حکومت کی ہے، ہمارا عہد مثالی اور تاریخی رہا ہے۔ ہم ان باتوں کو کیسے بھول سکتے ہیں۔ آج جو لوگ ہمیں جھکانا چاہتے ہیں، ہمیں غلام بنانا چاہتے ہیں، وہ دراصل ہماری تاریخ سے واقف نہیں ہیں اور اسے جھٹلانا چاہتے ہیں۔" [31]

ناول میں بیان کیا گیا ہے کہ امریکہ کی پالیسیاں دنیا کے تمام ممالک پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ امریکہ اپنے مفاد کے حصول کے لیے کمزور ممالک کو معاشی طور پر اپنی زیر نگیں کر کے ایسی پالیسیاں بناتا ہے کہ دوسرے ممالک کی قومیں امریکہ بہادر کے خلاف ایک ناپسندیدگی کا رویہ رکھتی ہیں۔ امریکہ کا اثر ورسوخ قومی حکومتوں پر اس قدر ہوتا ہے کہ کوئی حکومت صرف اپنی مرضی اور اپنے اختیار سے اپنی پالیسیوں کی تشکیل نہیں کر

سکتی۔ اس کے پس پشت ہمیشہ عالمی طاقتوں کا ہاتھ رہتا ہے اور یہ بڑی عالمی طاقتیں ہی عالم گیریت کی تحریک کی پشت پناہی کرتی ہیں۔

"ہم یہاں کی حکومت کے تعلق سے امریکہ اور اس کی عوام کو سمجھنا چاہتے ہیں جو زیادہ تر صحیح نہیں ہوتا۔۔۔ ہماری حکومت جس قدر عالمی پالیسی کو پکڑتی ہے قومی پالیسی کو اتنی اہمیت نہیں دیتی۔ دنیا میں امریکہ کے بارے جو بھی غلط فہمی ہے وہ صرف اس کی عالمی پالیسی کے سبب۔ " [32]

ناول سے ماخوذ مندرجہ بالا اقتباس عالم گیریت کے تناظر میں تشکیل دی جانے والی پالیسیوں کے مقاصد و اہداف کو بیان کرتا ہے۔ یہ پالیسیاں عالم گیریت کے جدید تصورات کی توسیع کا کردار ادا کرتی ہیں جس میں اقوام عالم کے باہمی تعلقات کو وسعت دینا ایک بنیادی ہدف ہے۔ عالم گیریت کے جدید تصور میں زرائع نقل و حمل اور بین الاقوامی مصنوعات نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ تجارت اور سرمایہ دارانہ نظام عالم گیریت کو مہمیز بخشتا ہے۔ عالم گیریت نے سرمایہ دارانہ نظام کے ذریعے سرمایہ دار طبقے میں اضافہ کیا اور آزاد منڈیوں کا راستہ بنا کر ایک عالمی منڈی کی بنیاد رکھی جس کی مصنوعات دنیا کے ایک ایک کونے میں پہنچائی گئیں۔ اس ناول میں بھی عالم گیریت کے سیاسی و سماجی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کی معاشی پالیسیوں کو بھی بیان کیا گیا ہے جس کا اظہار ناول کا مندرجہ زیل اقتباس کرتا ہے جس میں ایک امریکی فرد جو سائنس کا پروفیسر رہا ہے وہ ان حقائق کا ادراک کر کے آخر کار اپنی وائلن میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔

"وہ سائنس کا ایک ریٹائرڈ پروفیسر تھا۔۔۔ اسے کئی قومی اور بین الاقوامی انعامات سے نوازا گیا تھا۔ اب اس کا جی ان چیزوں سے دب گیا تھا کیوں کہ اسے شدت سے محسوس ہوا تھا کہ نئی ایجادات، ریسرچ، تعلیمات اور فتوحات کا استعمال صحیح نہیں ہو رہا ہے۔ ان کا بنیادی مقصد بنی نوع انسان کی بھلائی اور خدمت تھا مگر انہیں انسان ہی کے خلاف استعمال کرنے کی سازش ہوتی رہتی ہے۔" [33]

بھارت سے تعلق رکھنے والے تخلیق کار عبد الصمد کا یہ ناول جہاں نائن الیون کے واقعات اور اس کے بعد ہونے والی تبدیلی حیات کی مختلف جہتوں کو بیان کرتا ہے وہاں یہ ناول عالم گیر سطح کے سیاسی و سماجی پہلوؤں کا بھی مکمل بیان ہے۔ محمد شیراز دستی کا ناول "ساسا" بھی عالم گیریت کے چند پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس ناول میں ڈیرہ غازی خان کے ایک گاؤں سے تعلق رکھنے والے سلیم کو ناول کا مرکزی کردار بنایا گیا ہے اور اس

کی تلاشِ محبت کی داستان کے ساتھ ساتھ چند دیگر پہلوؤں کا بھی احاطہ کیا گیا ہے جس میں عالم گیریت کی متنوع جہات بھی شامل ہیں۔ ناول کی کہانی گاؤں سے شروع ہوتی ہے جس میں سلیم دوسرے مرکزی کردار منزہ سے محبت کرتا ہے اور پھر اپنے تعلیمی سفر کی تکمیل کے لیے امریکہ کا رخ اختیار کرتا ہے جہاں اس کی زندگی میں کلوراڈو یونی ورسٹی امریکہ کی طالبات اینی اور جینا بھی شامل ہو جاتی ہیں لیکن بالآخر سلیم کی منزل اس کے گاؤں کی منزہ ہی بنتی ہے۔ ایک رومانوی کہانی کے ساتھ ساتھ ناول نگار نے معاصر عصری مسائل اور سیاسی اور سماجی کشمکش کو بیان کیا ہے۔ اس ناول میں عالم گیریت کے کئی پہلو ملتے ہیں جس میں عالم گیریت کا معاشی پہلو سب سے نمایاں ہے۔ ناول میں بیان کیا گیا ہے کہ طاقتور اقوام دوسرے ملکوں پر جنگیں مسلط کرتے ہیں اور بعد میں مرنے والوں اور زخمیوں اور بے گھروں کے لیے فنڈز بھی خود ہی دیتے ہیں۔ ان کی یہ مدد بھی اس منافقت کو آشکار کرتی ہے کہ ان کی جنگوں کا مقصد بھی دوسرے ملکوں کو اپنے زیر تسلط کرنا ہوتا ہے تاکہ طاقتور ملکوں کی برتری ہمیشہ قائم رہے اور دوسرے ملک ہاتھ پھیلا کر ان سے بھیک مانگتے رہیں۔

> " کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ امریکہ کی حکمت عملی ساز اداروں میں انسان نہیں شیطان بھرتی ہوتے ہیں۔ حاضرین میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرے اور آپ کے پیسوں سے بھیجے گئے ان ڈرونوں میں مارے جانے والے نوے فیصد لوگوں کو امریکہ کا نام تک معلوم نہیں۔ نہ ہی انہیں یہ معلوم ہے کہ جنگیں کیوں ہوتی ہیں۔ اگر آپ میں سے بھی کسی کے ذہن میں یہ سوال ہو تو میں آپ کو بتاتا چلوں کہ جنگوں کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ ہے مال بنانا۔ چاہے وہ گن اور گولی بیچ کر بنایا جائے یا مالِ غنیمت لوٹ کر سرمایہ داریت کا حصہ بنایا جائے۔ " [34]

ناول کے مندرجہ بالا اقتباس میں بڑے دو ٹوک انداز سے ناول نگار نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ اصل میں جنگوں کا مقصد بھی پیسہ بنانا ہوتا ہے۔ یہ جنگیں سرمایہ دارانہ نظام کو تقویت دینے کے لیے لڑی جاتی ہیں۔ کمزور ممالک تو پہلے ہی اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو پاتے اوپر سے ان پر جنگیں مسلط کر کے ان کا معاشی استحصال کیا جاتا ہے اور انہیں زندگی کی بنیادی ضروریات اور اپنے دفاع کے لیے عسکری ضروریات سے محروم کر دیا جاتا ہے اور بعد میں اپنی ہی مصنوعات بیچ کر ان کو معاشی سطح پر کمزور جبکہ خود کو مضبوط کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ناول نگار نے فرد کی شناخت اور اعلیٰ طرز زیست سے محرومی کی بنیادی وجہ بھی استعماری طاقتوں اور سرمایہ دارانہ نظام کو بتایا ہے جس کی تصدیق مندرجہ زیل اقتباس سے ہوتی ہے۔

"ہم جب ایک بچہ پیدا کرتے ہیں تو دراصل ہم استعمار کو ایک اور غلام عطا کر دیتے ہیں
۔ سرمایہ داروں کو ایک اور خریدار دے دیتے ہیں۔ اس عالم میں راج کرتی بیماریوں کو،
یہاں کے وائرسوں کو ان کے آسان شکار دیتے ہیں۔"[35]

اسی طرح اس ناول میں ناول نگار نے استعماریت اور سرمایہ دارانہ نظام پر چوٹ کی ہے کہ وہ کس طرح معاشرے کو اپنی مصنوعات کی خریداری کے لیے مجبور کر دیتے ہیں اور یوں عالمگیر کا معاشی ہدف آسانی سے حاصل ہو جاتا ہے۔

اردو ناول کے اپنے پلاٹ، قصہ پن کہانی، کردار، اسلوب اور فن پر گلوبلائیزیشن کے اثرات مرتب ہوے ہیں۔ آج کے ناول میں تمام فلسفیانہ نظریات کو بھی پیش کیا جارہا ہے۔ ناول کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ اس کے کرداروں اور کہانی میں اتنا تنوع ہے کہ ساری دنیا ان کے اندر سمٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ناول کے ایک کردار کا تعلق اگر پاکستان سے ہے تو دوسرا کردار امریکا یا کسی یورپی ملک کا ہو سکتا ہے۔ ان کرداروں کی آپس کی گفتگو ایک عالمی مکالماتی منظر نامہ فروغ دیتا ہے۔

ii۔ اسلاموفوبیا فکر کا ابلاغ اور اردو ناول

اسلاموفوبیا انگریزی زبان کا لفظ ہے جس سے مراد ایسا ڈر ہے جو لوگوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور تعصب کے جذبات ابھارتا ہے۔ اس سے مراد اسلام یا مسلمانوں کے خلاف غیر معقول بات اور اشتعال انگیز جذبات بھڑکانا بھی ہو سکتا ہے۔ اسلام جس کا لفظی مطلب سلامتی اور امن ہے۔ غیر مسلم اقوام میں اسلاموفوبیا کے علمبرداروں نے اسلامی تہذیب کو مغربی تہذیب کی حریف سمجھا ہے اور مغربی افکار و نظریات کے سامنے ایک رکاوٹ سمجھا ہے اسی لیے اسلاموفوبیائی فکر مغرب میں فروغ پانے والی جدید فکروں میں تیزی سے پھیلنے والی فکر ہے۔ اسلاموفوبیا کے علم بردار اکثر و بیشتر اسلام کی واضح شناخت رکھنے والے مسلمانوں کو زچ کرتے ہیں مثلاً داڑھی رکھنے والے مسلمانوں کو تضحیک کا نشانہ بنانا ان سے متعصبانہ سلوک کرنا اور حجاب اور پردے میں رہنے والی خواتین کے ساتھ ناروا سلوک کرنا شامل ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی تہذیب سے خائف مغربی مفکرین اور عوام اسلام کی مقدس کتاب قرآن مجید کی حرمت کا مذاق اڑاتے ہیں اور اکثر و بیشتر قرآن کے مقدس اوراق جلا کر مسلم اقوام میں بسنے والے لوگوں کو اشتعال دلاتے ہیں۔

پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاکے بنا کر انہیں نعوذ باللہ تضحیک کا نشانہ بنانا اور مسلمانوں کے مقدس جذبات کی استہزاء بھی ان کے لیے باعثِ تفریح و آسودگی ہوتی ہے اس لیے اسلاموفوبیائی فکر کے حامل لوگ اس طرح کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اسلام اور اسلامی تعلیمات کے خلاف اٹھنے والی یہ بڑی تحریک دراصل اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے خائف ہے۔ ستمبر ۲۰۰۱ میں ہونے والے ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملوں کے بعد اسلاموفوبیا کی اصطلاح ادب میں بھی رائج ہوئی اور اسلاموفوبیائی فکر نے سماجی سطح پر بھی فروغ پایا۔ سانحہ نائن الیون کے بعد مختلف مغربی ممالک میں قرآن پاک کی بے حرمتی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخانہ خاکوں کی اشاعت فروغ پانے لگی اس کے ساتھ ساتھ عالم اسلام اور مسلمانوں کے مقدس جذبات کو ٹھیس پہنچائی گئی اور غیر مسلم ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کے ساتھ طرح طرح کے ظلم ڈھائے گئے اور ان سے ناروا سلوک کیا گیا۔ تمام مسلم اقوام میں اس طرح کے لٹریچر کے شائع ہونے کے بعد احتجاجی مظاہرے اور عالمی سطح پر کانفرنسیں منعقد کی گئیں مگر ۲۰۲۲ میں حکومت پاکستان کی کوششوں سے اقوام متحدہ کی جانب سے ۱۵ مارچ کو "اسلاموفوبیا کے خلاف عالمی دن" کے طور پر مختص کیا گیا۔ اس طرح عالمی سطح پر اسلاموفوبیائی فکر میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ اس تعصب کی جڑیں دراصل اسلام کے آغاز اور اسلام کے تیزی سے پھیلنے اور عیسائی علاقوں میں اسلام کی فتح اور اسلامی نظام کے فروغ اور انگریزوں کی شکستوں سے جڑی ہوئی ہیں۔

ادب زندگی کا عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات و واقعات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اردو ادب کی بات کریں تو اردو ناول نگاروں نے ہمیشہ اپنے معاصر منظر نامے کو اپنی تخلیقات میں سمویا ہے۔ اردو ناولوں میں جہاں دیگر موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے وہیں آج کے دور میں بڑھتے ہوئے اسلاموفوبیائی فکر کو بھی اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو آمنہ مفتی کا ناول "آخری زمانہ" عصر حاضر میں اسلام سے بڑھتی ہوئی مخالفت کو بھرپور بیان کرتا ہے۔ یہ ناول حال کا رشتہ ماضی سے جوڑ کر ایک مکمل نظام فکر اور طرز حیات کا بیان کرتا ہے۔ ناول میں اسلاموفوبیائی فکر کے برعکس اسلام کی صحیح تعلیمات کا عکس بیان کیا گیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ اسلام کے خلاف پروپیگنڈا در اصل حقیقت سے منہ موڑنا ہے۔

> "اسلام ایک طرز حکومت، طرز سیاست اور طرز معاشرت کا نام ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں اسلام نافذ ہونا ہی اصلی انقلاب ہے۔ اسلامی انداز گفتگو کسی شخص کو دوسرے

کا دشمن نہیں بناتا۔ مجلس کے آداب، ملنے جلنے کے آداب، معاملات، لین دین، کس جگہ اسلام میں جارحیت ہے؟ ایک دن صرف ایک دن اگر وہ ایک فیصد لوگ اسلام کے مطابق زندگی گزار لیں ۔۔ اگلے دن ہی لوگ اسلامی نظام کے حامل ہو جائیں گے۔"[36]

اس اقتباس میں مصنفہ نے اسلاموفوبیائی فکر کے حاملین کے سامنے ایک دعوت عام رکھی ہے۔ وہ جس طرح پوری دنیا میں اسلام کے خلاف لٹریچر شائع کر کے دنیا کو اسلام کے خلاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسلام ویسے ہی دھیمے دھیمے ان کے دلوں میں اپنی جگہ بناتا ہے۔ ناول نگار نے ان لوگوں کو ایک دعوت عام اور ایک کھلا چیلنج دیا ہے کہ اسلام کے مخالفین اگر ایک دن بھی اسلام کے مطابق زندگی گزار لیں تو وہ خود اسلامی نظام کی حمایت کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ ناول نگار نے ناول میں اس المیے کو بیان کیا ہے کہ جب بھی اسلامی تہذیب کا تصادم کسی دوسری تہذیب سے ہوا ہے تو اسلامی تہذیب کا مطالعہ کیے بغیر اسلام کو تعصب کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ہمیشہ اسے ہی غلط کہا گیا ہے اور اس کے نظریات کو ہی باطل قرار دیا گیا ہے۔ دنیا میں عام طور پر اسلام کی تشریح وہی کی جاتی ہے جو مغرب چاہتا ہے۔ اپنی من مانی تشریح سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جذبات کا پیدا ہونا پھر ایک فطری عمل بن جاتا ہے جو ہر غیر مسلم ممالک میں بسنے والے لوگوں کے دلوں میں جاری رہتا ہے۔

"جب یہ تصادم اسلام اور کسی بھی غیر مسلم نظام کے خلاف ہو تو اسلامی سوچ کو غلط اور اسلامی نظام کو تسلیم کرنے سے انکار اور مسلمانوں کو سرے سے کوئی قوت نہیں مانا جاتا ہے۔۔۔۔ اسلامی احکامات کو ایک چیستان بنا کر رکھ دیا گیا۔ اسلام کی تشریح وہ ہی کی گئ جو مغرب کرنا چاہتا تھا کہ یہ صحرائے عرب سے اٹھا ہوا ایک وحشی، نیم متمدن مذہب ہے۔۔ وہ یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ یونان کے عظیم مفکروں کے سامنے عرب کے ایک بھیڑ بکریاں چرانے والے شخص کا نظریہ حکومت برتر ثابت ہو جائے۔"[37]

آمنہ مفتی کے ناول " آخری زمانہ " سے ماخوز مندرجہ بالا اقتباس اسلاموفوبیائی فکر کے علمبرداروں کے مقاصد اور ان کی نیت کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ مفکرین سچائی کا سامنا کرنے کی جرات نہیں رکھتے اسی لیے وہ اسلام کی سچائی اور اس کی عظمت کے معترف ہونے کی بجائے اس کی قدر و منزلت کم کروانے کی خاطر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بھارت کے معروف ناول نگار عبدالصمد کا ناول " جہاں تیرا ہے یا میرا " میں بھی اسلاموفوبیائی

فوبیائی فکر کے عناصر موجود ہیں۔ ناول ایک وسیع کینوس پر مشتمل ہے جس کا ایک بڑا حصہ امریکہ کی سیاسی و سماجی صورتحال کو بیان کرتا ہے۔ اسی وجہ سے امریکہ میں مقیم مسلمانوں کے ساتھ ناروا سلوک کے واقعات کو بیان کیا گیا ہے اور اسلام کے مخالفین کے ارادوں اور ان کے مقاصد سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار راشد جب امریکہ میں روزگار کی تلاش میں جاتا ہے تو اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعات اور وہاں مقیم دیگر ہندوستانی مسلمانوں کے حالات اسلاموفوبیائی فکر کو مزید واضح کرتے ہیں۔

> "زرا دیکھ لو ان لوگوں نے ہمیں کتنی مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ حالانکہ اس ملک میں سوئی بھی گرتی ہے تو اس کی آواز اونچے ایوانوں میں سنی جاتی ہے۔ در اصل یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے مذہبی امور تک محدود رہیں۔ اس سے آگے نہ جائیں۔"[38]

ناول سے ماخوذ مندرجہ بالا اقتباس یہ ظاہر کرتا ہے کہ امریکی اشرافیہ اور امریکی عوام میں برداشت نہیں کہ وہ مسلمانوں کو تھوڑی سی آزادی دے سکیں تاکہ وہ آسانی سے اپنی زندگی گزار سکیں۔ مغربی معاشرہ اسلام کے پیروکاروں سے اتنا خائف ہے کہ وہ انہیں ان کے بنیادی حقوق سے بھی محروم کر دینا چاہتا ہے۔ ناول میں ایک اور جگہ مسلمانوں سے ہونے والے ناروا سلوک کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے۔

> "ایسی خبریں تو برابر آتی رہتی ہیں، جب انہوں نے موقع دیکھ کر کسی مسلمان کو مار ڈالا یا اسے پیٹ دیا۔ پیچھا کرنا اور مار پیٹ کرنا تو بہت عام بات ہے۔۔۔۔ انہوں نے تو چند سکھوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ صرف اس وجہ سے کہ سکھ بھی داڑھی رکھتے ہیں۔ ان کی بیوقوفی دیکھیے کہ انہیں سکھ اور مسلمان کا فرق بھی نہیں معلوم۔"[39]

عبدالصمد اپنے ناول " جہاں تیرا ہے یا میرا " میں اسلام مخالفین کے رویئے اور ان کے مقاصد کی حقیقت کی قلعی کھولتے ہیں اور دوٹوک الفاظ میں اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ اسلاموفوبیائی فکر کا حامل گروہ در اصل اس تصور کو برداشت ہی نہیں کر سکتا کہ مسلمان بھی اس دنیا میں اعلیٰ طرز معاشرت میں زندگی گزار سکتے ہیں اور دنیا کی ضمامِ اقتدار ان کے ہاتھوں میں بھی ہو سکتی ہے۔

محسنہ جیلانی کا ناول " میں دہشت گرد ہوں " اپنے نام سے ہی اپنے موضوع کے متعلق بنیادی اطلاع بہم پہنچاتا ہے۔ اس ناول میں دہشت گردی کو خاص طور موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نائن الیون کے تناظر میں سیاسی و سماجی صورتحال کی عکاسی کا حق بھی بخوبی ادا کیا گیا ہے۔ نائن الیون کے واقعے کے بعد پوری دنیا میں اسلام مخالف جذبات پروان چڑھنے لگے اور مسلمانوں اور دہشت گردی کو لازم و ملزوم قرار دیا گیا۔ اسلام اور دہشت گردی آپس میں مترادف جانے لگے اسی وجہ سے نائن الیون کے بعد آج تک غیر مسلم اقوام کے دلوں میں مسلمانوں کے لیے نفرت باقی ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کے زمہ داران کوئی اور تھے لیکن اس کا خمیازہ ہر مسلمان کو بھگتنا پڑا۔ نائن الیون کے بعد امریکہ اور مغربی ملکوں میں اسلام مخالف مہم چلائی گئ۔ امریکہ اور یورپ کے ہر خاص و عام کو یہ باور کرایا گیا کہ اسلام سے تعلق رکھنے والا ہر شخص دہشت گرد ہے اور ساتھ ساتھ انہیں یہ بھی باور کرایا گیا کہ مغربی ممالک میں مسلمانوں کا وجود ان کی معاشرتی ترقی کے لیے ایک خطرہ ہے۔ یورپی ممالک میں چلنے والی یہ اسلام مخالف مہم دراصل سامراجی طاقتوں کی حامی اور امریکہ نواز مہم ہے جس کے ذریعے طاقتور ملکوں کے اہداف کا حصول یقینی بناتا ہے۔

> "حجاب پہننے والی لڑکیاں نسل پرستوں کا نشانہ بن رہی ہیں۔ اسلاموفوبیا تیزی سے پھیل رہا ہے۔ نفرتیں بڑھ رہی ہیں۔ جان پہچان والے بہت سے لوگوں نے اپنے نام بدل لیے ہیں۔۔۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کس قدر ڈر رہے ہیں۔ خوف زدہ ہیں ۔ ساری دنیا جیسے اجنبی ہو گئ ہو۔ مسجدوں پر حملے ہو رہے تھے۔ مسلمان قبرستانوں میں توڑ پھوڑ ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب ایک منظم طریقے سے مسلمانوں کے خلاف مہم چلائی جا رہی ہے۔ ہر روز ایک نئ خبر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سنائی جاتی۔ ایک لوکل اردو اخبار میں زرینہ نے ایک چھوٹی سی خبر پڑھی۔ شمالی لندن کے ایک نرسری اسکول میں ایک پانچ سالہ بچے نے لکھا :
>
> Please do not kill me because I am a Muslim--"[40]

محسنہ جیلانی کا ناوٹ " میں دہشت گرد ہوں " میں اسلام اور اسلام سے جڑے لوگوں کے مسائل کا بیان ملتا ہے۔ خاص طور پر یورپ اور امریکہ میں بسنے والے مسلمان افراد کن مصیبتوں کا شکار ہیں اور کن آلام میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس کا مختصر سا بیان اس ناول میں ملتا ہے۔ محسنہ جیلانی نے جدید یورپی افکار میں اسلاموفوبیائی فکر کی تہہ میں چھپے مذموم مقاصد کو کامیابی سے بیان کیا ہے۔

"طاوس فقط رنگ" نیلم احمد بشیر کا ناول ہے جو امریکا کی سرزمیں اور کرداروں سے متعلق ہے۔ اس ناول کے بیانیے میں بھی مغربی اقوام کی اسلام اور مسلمان دشمنی کو شامل کیا گیا ہے۔ مراد جو ایک پاکستانی ماں باپ کا بیٹا ہوتا ہے، کو نائن الیون کے بعد نسلی تعصب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی کے بعد مراد کو ملازمت کے حصول میں اس لیے دقت اٹھانا پڑتی ہے کہ وہ مسلمان ہے اور اس کے ماں باپ کا تعلق پاکستان سے ہے۔ اسے ہر جگہ شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اس کے باوجود کہ وہ امریکی شہری ہی ہوتا ہے۔ ملازمت کے حوالے سے اسے کہیں بھی مثبت جواب نہیں ملتا اس لیے وہ مالی پریشانیوں کا سامنا بھی کرتا ہے۔ نسل پرست گورے اسے اسلامی دہشت گرد کہہ کر بلاتے ہیں یہاں تک کہ جیل میں اسے زدوکوپ بھی کیا جاتا ہے۔ ناول کا یہ حصہ مغرب میں اسلاموفوبیا کی عکاسی کرتا ہے مام یہاں کچھ قیدیوں نے مجھے دہشت گرد پکار کر چھیڑا ہے، مذاق اڑانا شروع کر دیا ہے۔ آتے جاتے مجھے مسلم ٹیرریسٹ کہہ کر تھپڑ جڑ دیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں امریکن بارن تو انھوں نے مجھے مارنا شروع کر دیا پھر گارڈ نے مجھے آکر چھڑوایا" [41]

بعد از نائن الیون یہ تعصب کھل کر سامنے آیا تھا ورنہ یہ تعصب مغربی افراد کے دل و دماغ میں ہمیشہ سے موجود تھا۔ نیم احمد بشیر خود بھی امریکا ہی میں قیام پذیر ہیں اس لیے اس حوالے سے ان کا مشاہدہ اور تجربہ زیادہ ہے۔ اسلاموفوبیا ایک بیماری کی صورت مغربی ممالک کے اندر موجود ہے۔ ناول میں ایک اور جگہ اس فکر کو پیش کیا گیا ہے جب مراد کے ماں باپ اس کی بیل کرانے اور اس سے ملنے جیل میں آتے ہیں تو ان کو بھی سخت جملوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

"مراد ننھے بچے کی مانند خوف زدہ تھا۔ اسی وقت دو اور ملزم پولیس کے ہم راہ مراد کے قریب سے گزرے اور اسے چھیڑ کر کہنے لگے "دیکھو مسلم ٹیرریسٹ کی ماں بھی آئی ہوئی ہے۔ تم لوگ اپنے ملک کیوں واپس نہیں چلے جاتے۔"Hey we hate you" [42]

نیلم احمد بشیر نے اپنے مشاہدے کے مطابق اس اہم ترین مسلے کو بھی اپنے ناول کے ذریعے پیش کیا ہے۔

شیراز دستی کے ناول " ساسا" میں کسی حد تک اسلاموفوبیائی فکر کو پیش کیا گیا ہے۔ جب اسامہ بن لادن کے خلاف ایبٹ آباد میں آپریشن ہوا اور امریکی فوج نے اسے وہاں سے برآمد کرایا تو پاکستانی کردار سلیم کو حیران کن طور پر اپنے کالج اور دوستوں کی طرف سے سرد مہری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے قریبی دوست بھی اس سے بات کرنے سے کترانے لگتے ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ اسامہ پاکستان سے برآمد ہوا اور سلیم چوں کہ پاکستانی مسلمان ہے اس لیے اس سے نفرت کے طور پر بات چیت ختم کر دی جاتی ہے۔

ایم اختر کا ناول "ایک لوسٹوری ایک ایٹمی قیامت" ناول میں ایک ہندو وکرم کے کردار سے اسلام او مسلمان دشمنی کو ظاہر کیا گیا ہے۔ وکرم ایک شدت پسند تنظیم شیو سینا کا رکن ہوتا ہے اور مسلمانوں کے وجود کا سخت دشمن ہوتا ہے۔ پاکستانی لڑکے کے ساتھ فیس بک پر اس کی گفتگو انتہائی شدت پسندانہ اور اسلام مخالفانہ ہوتی ہے۔ وہ ہر صورت میں پاکستان اور مسلمانوں کو مٹا دینے کا نظریہ رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک پاکستان ایک ناجائز ملک ہے جسے بھارت ماتا ہے وجود کو تقسیم کر کے بنایا گیا ہے۔ یہی وکرم کا کردار بعد میں برطانیہ میں مسلم کش تحریک میں پیش پیش ہوتا ہے اور بلآخر گرفتار ہو جاتا ہے۔

دورِ جدید کے اس اہم ترین مسلے پر تقریباً ہر اردو ناول نگار نے مؤثر انداز میں قلم فرسائی کی ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ دنیا کو اس غیر منصفانہ سوچ کا ادراک کرایا جائے۔

iii۔ دہشت گردی، مذہبی انتہا پسندی اور شدت پسندی

دہشت گردی اصطلاحاً خوف و ہراس پھیلانے کا نام ہے۔ کسی انسان کو ڈرانا دھمکانا، اسے تلوار اور بندوق کے زور پر اپنے حکم کا غلام بنانا، اس کی جائیداد و املاک پر قتل و غارت کے ذریعے قبضہ کرنا، معاشرے میں تباہی و بگاڑ پیدا کرنا اور معاشرے میں امن پسند لوگوں کو شخصی تحفظ سے محروم کرنا دہشت گردی ہی ہے زمرے میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی سیاسی مقصد کے حصول کے لیے چھوٹے گروہ کی طرف سے بڑے گروہ کو دھمکی دینا یا تشدد کرنا بھی دہشت گردی ہے۔ یہ خوف و ہراس کی وہ قسم ہے جس میں کمزور طاقتور کے دل میں خوف پیدا کرنے کی سعی و جہد کرتا ہے اور بسا اوقات اس میں کامیاب بھی ہوتا ہے۔ دہشت گردی کی کوئی مخصوص وجہ نہیں ہے اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں جن میں کسی ریاست کے حصول کے لیے مسلح جدوجہد کر کے اس پر دھاوا بولنا، کسی حکومت کے معاشی تسلط اور اجارہ داری کو بزور قوت ختم کرنا اور مذہبی انتہا پسندی بھی دہشت گردی کی وجوہات میں شامل ہے۔ اسی طرح دہشت گردی کی کئی اور اقسام بھی ہو سکتی ہیں جن میں سیاسی دہشت گردی، معاشی دہشت گردی، مذہبی دہشت گردی اور ریاستی دہشت گردی شامل

ہیں۔ سیاسی دہشت گردی میں ملک دشمن عناصر قوم کے سیاسی راہنماؤں کو قتل کر کے سیاست و جمہوریت میں عدم توازن پیدا کرتے ہیں اور عوام میں افراتفری اور انتشار پھیلا کر اپنے مذموم مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ امریکہ میں ابراہام لنکن، جان ایف کینیڈی، ہندوستان میں مہاتما گاندھی اور اندھرا گاندھی جبکہ پاکستان میں نواب زادہ لیاقت علی خان، بینظیر بھٹو جیسے راہنماؤں کا قتل سیاسی دہشت گردی کی واضح ترین مثال ہے۔ معاشی دہشت گردی میں اعلا سرکاری طبقہ، حکمران اور بیوروکریٹ اور دوسرے اعلا سرکاری عہدوں پر فائز لوگ کرپشن کر کے اور غیر قانونی طور پر دولت حاصل کر کے منی لانڈرنگ کے ذریعے دولت بیرون ممالک بھیجتے ہیں جس کے نتیجے میں ملک کی معیشت کو نقصان پہنچتا ہے اور پھر ملک کو آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک جیسے عالمی اداروں سے قرضوں کی بھیک مانگنا پڑتی ہے۔ مذہبی دہشت گردی سے مراد کسی مذہب کو دہشت گردی سے جوڑنا نہیں یا اپنے مسلک کو زبردستی دوسرے پر بہ زورِ بازو مسلط کرنا ہے۔

اہل فکر و دانش اور عقل سلیم رکھنے والے عوام کا یہ خیال ہے کہ دہشت گردی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور یہ بات بالکل درست ہے کیوں کہ دنیا کا کوئی مذہب بھی دہشت گردی کا درس نہیں دیتا۔ کچھ شر پسند عناصر ایسے ضرور پائے جاتے ہیں جو دہشت گردی کو کسی مخصوص مذہب سے جوڑ دیتے ہیں۔ جیسا کہ ہمیشہ غیر مسلم اقوام نے اسلام کے پیروکاروں کو دہشت گرد سمجھا ہے اور اسلام پر دہشت گردی کا لیبل لگایا ہے جو بالکل متعصبانہ نظریہ ہے۔ ریاستی دہشت گردی سے مراد کسی ریاست کا اپنے زیر قبضہ رہنے والے پر امن لوگوں پر ظلم و تشدد، مار پیٹ، لاٹھی چارج اور انہیں زبردستی ریاست سے بے دخل کرنا شامل ہے۔

ادب زندگی کا عکاس ہوتا ہے اور ہر ادیب اپنی تخلیقات میں اپنے عہد میں ہونے والی سیاسی و سماجی کشمکش کو اپنے ادب کا موضوع بناتا ہے۔ اردو ناول کی روایت میں ہر ناول نگار نے اپنے زمانے کے مخصوص سماجی و فکری نظریات اور خارجی سطح پر ہونے والی سیاسی و معاشرتی کشمکش کو بیان کیا ہے۔ معاصر اردو ادب میں عصری مسائل کی عکاسی زیادہ تر ناول میں ہی نظر آتی ہے۔ معاصر اردو ناول میں آمنہ مفتی نے اپنے ناول " آخری زمانہ " میں اسلام کے ماضی کی عظمت، نشاط ثانیہ اور حال کی ابتری و انتشار کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے اس کے علاوہ عالم گیر سطح کے سیاسی منظر نامے کو بھی ناول کا حصہ بنایا۔ انہوں نے اس ناول میں دور حاضر میں ہونے والی دہشت گردی، مذہبی انتہاء پسندی اور شدت پسندی جیسے موضوعات بھی نظر انداز نہیں کئے۔ ناول " آخری زمانہ " میں آمنہ مفتی رقم طراز ہیں

"انسان ظالم ہے۔ خون بہانے کا شوقین۔ یہ شوق اس کی فطرت میں ہے۔ بس وہ سوچ لیتا ہے۔ ایک مجمع جو حاوی آجائے فیصلہ کر لیتا ہے کہ کچھ لوگوں نے مرنا ہے اور بس۔ پھر خون کی ندیاں بہادی جاتی ہیں۔ شہر کے شہر کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ بستیاں اجاڑ دی جاتی ہیں۔ کچھ لوگ فاتح کہلاتے ہیں کچھ مفتوح، کسی کو تخت ملتا ہے اور کسی کو تختہ."[43]

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ آمنہ مفتی کے نزدیک ظلم انسان کی سرشت میں رکھا ہے اور اس کی جبلت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ کسی پر ظلم ڈھا کر اپنی جبلت کی تسکین کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ وجدل کی روایت ابتدائے کائنات سے چلی آرہی ہے اور اس قسم کی جنگ دہشت گردی ہی کا دوسرا نام ہے۔

آمنہ مفتی نے ناول میں شدت پسندی اور مذہبی انتہاء پسندی کے واقعات کو بھی قلم بند کیا ہے۔ برصغیر میں ہندووں اور مسلمانوں نے ایک ہزار سال تک مل کر زندگی گزاری مگر اس کے باوجود بھی وہ آپس میں شیر و شکر نہ ہو سکے۔ ان کی مذہبی انتہاء پسندی ایک دوسرے کے خلاف تشدد کرنے پر ہمیشہ اکساتی رہی جس کے بھیانک نتائج کا سامنا دونوں مذہب کے پیروکاروں کو کرنا پڑا۔ آمنہ مفتی ناول میں بابری مسجد کے شہید ہونے کے واقعے اور اس پر مسلمانوں کے ردِ عمل کو یوں بیان کرتی ہیں

"پھر دسمبر کی سرد اور بھیگی ہوئی صبح ٹھیکے دار کا لڑکا خبر لایا کہ بابری مسجد شہید کر دی گئی۔ سارے گاؤں میں برقی رو دوڑ گئی۔ سوئے ہوئے خالد کو جگایا گیا۔ آس پاس کے گاؤں کے لڑکے جو جس کے ہاتھ آیا، کسی، ہتھوڑا، کلہاڑا، ڈنڈا لے کر چل پڑے۔ ان کے نقوش غیض و غضب کی شدت سے بگڑے ہوئے تھے۔ خالد کے ہاتھ میں خود بخود کمان آگئی۔ وہ نعرے لگوا رہا تھا، چلا رہا تھا۔ چیخ چیخ کے ہندوؤں کے خلاف اپنے عزائم کا اظہار کر رہا تھا."[44]

مندرجہ بالا اقتباس ہندوؤں اور مسلمانوں کی مذہبی انتہاء پسندی کی شدت کو بخوبی ظاہر کرتا ہے۔ مسلمانوں کو اذیت دینے کی پہل ہمیشہ ہندوؤں کی طرف سے ہوئی جس کے رد عمل میں مسلمانوں نے بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور یوں فتنہ وفسا، قتل وغارت اور دہشت گردی کے واقعات کا تسلسل قائم رہا۔

محمد شیراز دستی کے ناول "ساسا" میں بھی دہشت گردی، شدت پسندی اور مذہبی انتہا پسندی کے موضوعات در آئے ہیں۔ "ساسا" ناول بنیادی طور پر نائن الیون کے تناظر میں میڈیائی حقیقتوں کو بیان کرتا ہے کہ کس طرح نائن الیون کے واقعے کے بعد میڈیا نے مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرنے میں اہم کردار ادا

کیا۔ ناول میں شیر از دستی سکول اور مدرسے پر ہونے والے دہشت گرد حملے کے دو واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"میرے شہر کے ایک سکول پر خود کش حملہ ہوا تھا اور ایک قبائلی شہر کے ایک مدرسے پر ڈرون حملہ۔ دونوں میں مارے جانے والوں میں سے زیادہ تر کی زیادہ سے زیادہ عمریں تیرہ چودہ برس کی تھیں۔ نامہ نگار نے بموں کے حجم اور شدت کا موازنہ چھوٹے چھوٹے بچوں کے جسموں سے کرتے ہوئے لکھا کہ لواحقین نے ہر بچے کے نام کی قبریں تو کھود لیں مگر ان میں لے جانے کے لیے ان کے پاس بم کے کچھ ٹکڑوں پر لگے گلابی گوشت کے لوتھڑوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔"[45]

شیر از دستی نے دہشت گرد حملوں کے بعد ہونے والے بھیانک نتائج کی ایک جھلک دکھائی ہے۔ کوئی مذہب کسی کو دہشت گردی کا سبق نہیں سکھاتا مگر اس کے باوجود دہشت گردوں کا تعلق کسی نہ کسی مذہب سے ہوتا ہے اور بعض اوقات وہ اپنے ہم مذہبوں کو ہی دہشت گردی کا نشانہ بناتے ہیں۔ اور معصوم جانوں کو اس طرح کا تشدد اور اذیت دیتے ہیں کہ انسانی روح کانپ اٹھتی ہے کہ ان معصوم جانوں کا کیا قصور تھا جو انہیں لقمہ اجل بنا دیا گیا۔ ناول میں ایک اور جگہ شیر از دستی دہشت گردی اور جنگ و جدل کے ہول ناک نتائج کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔

"جب سے ہوش سنبھالا جنگیں دیکھیں، دھماکوں کی دھول دیکھی، کشت وخون کا بازار گرم دیکھا۔ میرے ارد گرد بیسیوں دفعہ صفِ ماتم بچھی۔ کڑیل جوانوں کے جنازے اٹھتے تو میری بستی کے لوگ غم وغصے سے اپنے بال نوچ ڈالتے، بہنیں آہیں بھرتیں تو سارا عالم رونے لگتا۔ مائیں ایسے بین کرتیں کہ عرش تک ہل جاتا مگر میں ہمیشہ ایک طمانیت سے آگے بڑھتا رہا۔ خواتین و حضرات، میرے شعور کی تختی سرد جنگوں، سٹنگر اور کروز میزائلوں، کارپٹ بمبنگ، خود کش دھماکوں اور ٹارگٹ کلنگ سے عبارت ہے۔۔ میں ایک ایسا کھوجی ہوں جو دہشت کے موسم میں محبت کی فصل اگانے کے خواب دیکھتا ہے۔"[46]

ناول سے ماخوذ یہ پیراگراف جنگ و جدل، دہشت گردی اور خود کش دھماکوں کے ہول ناک نتائج کا منظر کامیابی سے دکھاتا ہے۔ یہ منظر اتنا ہول ناک اور دردناک ہے کہ اس سے بڑھ کر درد و غم کی گھڑی کوئی

اور نہیں ہو سکتی۔ شیراز دستی کا یہ ناول گویا ایک ایسا مرقع ہے جس میں ہر طرف دہشت گردی اور مذہبی انتہا پسندی کے دردناک نتائج بکھرے پڑے ہیں۔

محسنہ جیلانی کا ناولٹ " میں دہشت گرد ہوں " اپنے نام سے ہی موضوع کے بارے میں آگاہ کرتا ہے۔ محسنہ جیلانی نے اس ناولٹ میں ہندوستان اور پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں کے ان حالات کی عکاسی کی ہے جو انہیں امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے حادثے کے بعد پیش آئے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کا یہ حادثہ اگرچہ امریکہ میں ہوا اور اس حادثے کے ذمہ داران کا تعلق افغانستان سے تھا۔ اس کے باوجود اس واقعے کے نتائج ہندوستان اور پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں کو بھگتنا پڑے۔ یہ ناولٹ مسلمانوں کے ساتھ متعصبانہ سلوک اور رویئے کی کامیاب عکاسی کرتا ہے۔ ناولٹ جہاں سیاسی و سماجی موضوعات اور فرد کے رویئے اور مخصوص رجحانات کا احاطہ کرتا ہے وہیں اس ناولٹ میں دہشت گردی، مذہبی انتہاء پسندی اور شدت پسندی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ناولٹ میں محسنہ جیلانی نے خاص طور پر دہشت گردی کے موضوع کو کامیابی سے برتا کے اور دکھایا ہے کہ کس طرح مخصوص سیاسی جماعتیں معاشرے میں خوف و ہراس پھیلا کر اپنے مخصوص نظریات کے اہداف حاصل کرتی ہیں۔

> "یہ سن ساٹھ کی دہائی تھی ویت نام میں ہولناک جنگ جاری تھی۔ ٹیلی ویژن کی بدولت یہ جنگ ہر گھر میں در آئی تھی۔ بجلیوں کی کڑک کے ساتھ بم پھینکے جارہے تھے۔ ننھے بچے سڑکوں پر بدحواس بھاگ رہے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ جیسے آگ کے شعلوں میں لپٹے ہوئے ہوں۔ جلتے ہوئے چیختے چلاتے ہوئے، کٹے ہوئے ہاتھ، زخمی پیروں کے ساتھ ، ہر طرف خون ہی خون، کوئی جائے امان نہیں۔ کہاں جائیں گھر زمین میں دھنس رہے ہیں اور لوگ زندہ قبروں میں دفن ہو رہے ہیں۔ ایسی قیامت اور ایسی وحشت ناک جنگ۔"[47]

محسنہ جیلانی نے مندرجہ بالا اقتباس میں ویت نام میں جاری سیاسی وریاستی دہشت گردی کی ہولناکیوں اور تباہیوں کو بیان کیا ہے۔ ویت نام میں ریاستی دہشت گردی اور جنگ وجدل نے معصوم جانوں کا جینا حرام کیا ۔ لوگوں پر ہر نفس حیات دشوار ہو گیا۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے لقمہ اجل بنے۔ عورتوں کا سہاگ اجڑا۔ ماؤں نے بچے کھوئے اور بچوں نے اپنے ماں باپ۔ جنگ و جدل اور دہشت گردی کتنی تباہی کا سبب بنتی ہے، محسنہ جیلانی نے اس ناول میں اس کا بھرپور نقشہ کھینچا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا ناول " قلعہ جنگی امریکی دہشت

گردی کی عمدہ مثال ہے۔ ناول نگار نے نہتے مجاہدین کی موت کا نقشہ پیش کر کے دہشت گردی کے اصلی کردار کو واضح کیا ہے۔ بغیر کسی تصدیق اور ثبوت کے ایک کم زور اور پہلے سے ہر لحاظ سے تباہ ملک افغانستان پر امریکا جیسے ملک کا حملہ ایک کھلی اور ظالمانہ دہشت گردی ہے۔ ہزاروں بے گناہوں کو موت کی نیند سلا دیا گیا، مہلک ترین بموں سے شہروں کے شہر اجاڑ دیے پورے ملک کو پتھر کے زمانے میں دھکیل دیا گیا۔ قلعہ جنگی میں دہشت گردی کے اس پہلو کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔

د۔ معاصر اردو ناول پر فنی اثرات کا جائزہ

ہر دور میں ناول کے مزاج اور فن پر جدید آثار و احوال کے اثرات مرتب ہوتے رہے ہیں۔ اکیسویں صدی کے اردو ناول میں جہاں بے شمار موضوعاتی اضافے ہوئے ہیں وہیں فنی لحاظ سے بھی کچھ نئے طریقہ ہائے اظہار کو اپنایا گیا ہے۔ ناول کے روایتی طریقوں کے استعمال کے ساتھ اس دور کے ناول نگار نے جدید مشینی زندگی کے زیر اثر نئے اسلوب اور طریقوں کا استعمال بھی کیا ہے۔ اس صدی کے ناول نے اس پیچیدہ ترین منظر نامے کو اپنے اندر نئے مزاج کے ساتھ پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ یعنی فکشن کا سفر حقیقت کی پیش کش سے آگے نکل کر حقیقت کی دریافت تک پہنچ چکا ہے۔ قاسم یعقوب اس حوالے سے لکھتے ہیں

> "ناول نئے انسان کے نئے سوالوں کو سامنے لایا ہے نئے سوال پیچیدہ اور پرانے سوالوں پر نئے سوال قائم کر رہے ہیں موضوع کی سطح پر ناول کے سب سے پہلے ان نئے سوالوں کو کنٹینٹ کا حصہ بنایا ہے جو 21 کیسویں صدی میں انسانی زندگی کا لازمی حصہ سمجھے جا رہے ہیں"[48]

ناول کے فن کے حوالے سے درج ذیل نئے رجحانات کو اہم سمجھا جا سکتا ہے۔

i۔ کریٹی فکشن:

آج ناول محض کہانی، پلاٹ، قصہ بن اور دیگر لوازم ہی کے ساتھ پیش نہیں کیا جا رہا بل کہ اس میں جدید انسان کے پر تجسس ذہن کے مطابق ناول کی کہانی اور اس میں پیش کردہ فلسفے یا نظریے کے درمیان استدلالی مطابق بھی پیش کی جاتی ہے۔ بذات خود کہانی کی فلسفیانہ ضرورت کی وضاحت بھی ناول میں کی جا رہی

ہے۔ناول نگار یہ اہتمام کرتا ہے کہ وہ بتا سکے کہ کہانی کن ضرورتوں اور حالات کی وجہ سے تعمیر کی گئی اور کن فلسفہ ہائے زندگی کو لے کر پیش کی گئی ہے۔ کریٹی فکشن جیسا کہ اپنی اصطلاحی میں واضح ہے کہ اس طرز کے فکشن میں ناول نگار ان امور اور نکات کی تشریح و توضیح بھی کرتا ہے جو کہانی کے جواز سے متعلق ہوں۔ یہ وہ دور نہیں کہ سیدھے سادے طریقے سے کہانی کو جس مرضی طور بیان کیا جائے۔ محض رومانوی قصے اور طرزِ بیان سے آج کام نہیں چل سکتا،ناول نگار کو اپنے کانٹینٹ کو پیش کرنے اور جدید ذہنیت کے پُر تجسس مادے کی تسلی کے لیے ایک نقادانہ اسلوب اختیار کرنا پڑ رہا ہے جس میں وہ اپنے پیش کردہ کانٹینٹ کا اصولی، منطقی اور نظریاتی جواز پیش کرتا ہے۔ اس طریقہ بیان میں ایک دقت ضرور آئی ہے کہ کہانی کو سمجھنے اور اس کا فہم حاصل کرنے کے لیے قاری کو اسے سطحی انداز سے پڑھنے کی بجائے پوری گہرائی سے پڑھنا پڑتا ہے کریٹی فیکشن کے حوالے سے ڈاکٹر قاسم یعقوب کا کہنا ہے۔

> "ناول کا ایک نیا رجحان کریٹی فکشن میں بھی آیا ہے کریٹی فیکشن، کہانی کا ایسا تصور ہے جس میں ناول نگار کہانی کی پیش کش اور کہانی کے فلسفیانہ جواز کی اپنے انداز میں توضیح و تشریح کرتا ہے "[49]

یہ انداز تحریر اگرچہ تنقیدی اور وضاحتی ہے مگر اس میں ایک نقصان ہو سکتا ہے کہ قاری کو ناول کی سمجھ کے لیے مشقت کرنا پڑ سکتی ہے

iiاینٹی ناول:

اینٹی ناول کا لفظ ہی اس بات کی وضاحت کر دیتا ہے کہ اس طرز کا ناول روایتی ناول کا الٹ ہے۔ روایتی ناول کی پیش کش کے لیے جن عناصر کو لازمی سمجھا جاتا ہے اور جس ترتیب سے انہیں ملایا جاتا ہے یہ ناول ان سب کی تردید کرتا ہے اور نیا انوکھا اور منفرد اسلوبِ بیان اور فن اختیار کرتا ہے۔ جیسا کہ روایتی ناول میں پلاٹ اور کہانی کا تعلق کرداروں کے قصے کے ساتھ اصولی جڑت وغیرہ ہم سمجھے جاتے ہیں مگر اینٹی ناول ان سب لوازم سے ہٹ کر نئے انداز کو اپناتا ہے۔ اس میں پلاٹ، کہانی، قصہ پن، منظر نگاری اور مکالمہ نگاری وغیرہ کی وہ روایتی ترتیب نہیں ملتی جو پہلے مروج رہی ہے۔ دراصل ہر روز نئے انقلاب اور تصورات کو فروغ

دیتی اس جدید دنیا میں جدید طریقہ اظہار کے ساتھ ساتھ چلنا ضروری ہے ورنہ کوئی بھی فن یا صنفِ ادب اس سرعت سے بدلتی دنیا میں گم ہو سکتی ہے۔ اس لیے ناول نگار اینٹی ناول کے طریقے کو بھی آزمارہے ہیں ۔

iii مخلوط زبانی اسلوب:

دنیا گلوبل ویلج بن چکی ہے، دنیا بھر کے ادب اور زبان ایک دوسرے کو متاثر کر رہے ہیں، بڑی زبانیں چھوٹی زبانوں پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ پھر عالمی قربت نے لوگوں کو بہت زیادہ قریب کر دیا ہوا ہے، میڈیا ہاؤسز کی کثرت نے بھی انسان کے مزاج اور زبان پر اثر ڈالا ہے۔ اس سب کا نتیجا یہ نکلا کہ اردو ناول میں مخلوط زبانی اسلوب ترتیب پا چکا ہے۔ اردو زبان کے اندر انگریزی یا دیگر زبانوں کے اثرات نے اردو ناول میں مخلوط زبانی اسلوب کو فروغ دیا ہے۔ اس تحقیق میں منتخب اردو ناولوں میں بے شمار جگہ اس ترکیب کو استعمال کیا گیا ہے ۔

iv تشکیلی اسلوب:

کسی شے کی حقیقت یا موجودگی سے زیادہ اس کا تصور زیادہ حسین لگتا ہے اج کے انسان اشیاء میں وہ لطف نہیں ملتا جو انہیں ان اشیاء کی تشکیلی صورت میں ملتا ہے۔ اشیا سے زیادہ اسن کی پیش کرنے کا خوب صورت طریقہ زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ لباس کی اپنی ضرورت ہے مگر آج لباس کی تشکیل کا تشکیلی تصور انسان کو زیادہ کشش کرتا ہے۔ لباس کا جمالیاتی پہلو لباس کی ضرورت سے زیادہ اہم سمجھا جا رہا ہے۔ تشکیلی صورت سے مراد کسی شے، رشتے ناطے یا کہانی کا وہ پہلو ہے جس کو انسان کے اپنے تصورات کی مدد سے بنا گیا ہو۔ معاصر ناول نگار بھی اس تشکیلی طریقہ بیان کو استعمال کر کے ناول کو پیش کر رہا ہے۔ قاسم یعقوب اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

> قابلِ صرف اشیاء میں وہ لطف موجود نہیں جو اس شے کی تشکیلی طاقت یا افادیت میں نظر آتا ہے۔ کھانا کھانے سے زیادہ کھانا کھانے کی جگہ یا اس کی پیش کش اہمیت اختیار کر چکی ہے۔ فن کار کے فن کی اصلی حالت سے زیادہ فن کی تشکیلی اہمیت زیادہ اثر انداز ہوتی جا رہی ہے۔ زندگی کی تمام شکلیں اپنی اصلی حالت کے بجائے اپنی تشکیلی حالت میں زیادہ پر کشش اور موثر دکھائی دینے لگی ہیں۔[50]

v۔ علامات کے تجربے

اردو ادب کی بات کریں تو غزل واحد صنف ہے جو ابتداء سے ہی ہمارے علامتی نظام کی امین چلی آ رہی ہے۔ غزل میں ہر عہد کے علامتی نظام کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔ یہ علامتیں مخصوص سیاسی و سماجی نظام کو بیان کرتی ہیں۔ غزل کے بعد علامتی افسانہ کا دور شروع ہوا جس میں ایک بڑا نام انتظار حسین ہیں۔ علامتی افسانہ نگاروں معاشرے کے مخصوص اقدار، رویئوں اور سیاسی و سماجی چپقلش کو علامتوں میں ڈھالا اور اس طرح انہیں ادب کا حصہ بنایا۔ پاکستانی تاریخ میں ضیاء الحق کا دور ایسا دور ہے جس میں پاکستانی تخلیق کاروں نے علامت ہی کے ذریعے اپنے خیالات کو قلمبند کیا اور اپنے فکر کا اظہار علامتوں کے پیرائے میں کیا۔ معاصر اردو ناول کی روایت میں نیلم احمد بشیر نے افسانوی ادب میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت اپنا نام بنایا اور اردو فکشن میں گراں قدر اضافہ کیا۔ نیلم احمد بشیر کا ناول "طاؤس فقط رنگ" کا عنوان علامتی رنگ لیے ہوے ہے۔ اس ناول میں نائن الیون کے بعد امریکہ کی معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس تہذیب کی خوش رنگی اور کھوکھلے پن کو بھی مصنفہ نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ اس ناول میں "طاؤس فقط رنگ" امریکہ کے خوش رنگ مگر کھوکھلے معاشرے کی علامت ہے۔ طاؤس امریکہ کی علامت ہے جبکہ فقط رنگ سے مراد اس ملک کا معاشرہ ہے۔

نیلم احمد بشیر نے اس ناول میں حقیقی واقعات اور حالات کو فرضی کرداروں اور فرضی علامتوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ اس ناول کے بیشتر کردار الگ الگ معاشروں سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ اپنے معاشرے کے نمائندہ کردار بن جاتے ہیں۔ ناول میں امریکہ کو طاؤس کے کردار کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ امریکہ وہ خوب صورت طاؤس ہے جس کی خوش رنگی میں اقوام عالم کے تمام معاشرے گرفتار ہیں۔ تمام معاشروں اور اقوام کو لگتا ہے کہ اس دنیا میں امریکہ ہی واحد ملک ہے جو ان کے خوابوں کی تعبیر ہو سکتا ہے اسی طرح بالخصوص پاکستان اور ہندوستان میں بسنے والے عام افراد بھی اپنے روزگار کے لیے امریکہ کی جانب کھنچتے چلے جاتے ہیں اور سیاسی جماعتیں اپنے ملک میں اقتدار کے حصول کے لیے امریکہ کی طرف التجائی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس خوب صورت طاؤس کے رنگوں کی خوشنودی میں ساری قومیں خود کو گرفتار پاتی ہیں۔ ایک زمانے میں برصغیر پاک وہند کو سونے کی چڑیا کیا جاتا تھا۔ یہ سونے کی چڑیا اپنے دور عروج میں ایسی سنہری و چمکتی

چڑیا تھی جس کی دلکشی سمندروں پار کی انگریز اقوام کو بھی اپنی طرف متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔ لیکن جب یہ انگریز اقوام برصغیر پر قابض ہو گئے تو اس سونے کی چڑیا کے پر چھین لیے اور اسے صرف مٹی کی مورت بنا دیا۔ ناول " طاؤس فقط رنگ " میں مرکزی کردار مراد کے نزدیک امریکہ کی وہی حیثیت ہے جو ایک ماں کی ہوتی ہے۔ اس ناول کا مندرجہ ذیل اقتباس علامت کے تجربے کو واضح کرتا ہے۔

> " مجھے امریکا سے بہت پیار ہے۔ امریکا میری ماں ہے۔ یہ میرا ملک ہے میں یہاں ہی پیدا ہوا ہوں۔ مجھے اس سے بڑی امیدیں ہیں۔ یہ مجھے ضرور اپنی وسیع آغوش میں پناہ دے گا۔ ہم سب امریکن ہیں " [51]

مندرجہ بالا اقتباس میں امریکہ مختلف کرداروں کے لیے ماں کی علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ امریکی معاشرہ ماں کی آغوش ہے جہاں مراد محبت اور انس کا طلب گار ہے۔ مراد امریکا سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی اولاد اپنی ماں سے محبت کرتی ہے۔ امریکہ ایک ایسا طاؤس ہے جس کے معاشرے میں طلسماتی قوت ہے یہ طلسماتی قوت ہی در اصل دوسرے ممالک کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ لیکن یہ امریکی معاشرہ در حقیقت ایسا طاؤس ہے جو فقط رنگ ہی رنگ ہے۔ اس میں فقط خوش رنگی ہی پائی جاتی ہے۔ بظاہر یہ خوش رنگ معاشرہ حقیقت میں کھوکھلا ہے۔

" نائن الیون " امریکا میں ہونے والے ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے جڑواں ٹاوروں پر حملے کی ایک علامت بن گیا ہے۔ قاری جب اس علامت کو پڑھتا ہے تو اس کے ذہن میں امریکہ کے جڑواں ٹاوروں پر ٹکرانے والے جہاز کا منظر پیدا ہوتا ہے اور وہ ان ٹاوروں کے جلنے کے نتیجے میں سینکڑوں افراد کو لقمہ اجل بنتے ہوئے تصور کرتا ہے۔ اس طرح نائن الیون ایک کامیاب علامت کے طور پر سانحہ ستمبر کی نمائندگی کرتا ہے۔ نائن الیون کے بعد دہشت گردی کا لفظ ایک ایسی علامت بن گئی جو مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے جوڑ دی گئی۔ نائن الیون سے پہلے بھی دنیا میں ہر قسم کی دہشت گردی ہوتی رہی ہے۔ لوگوں پر ظلم و تشدد کیا جاتا رہا ہے ،ان کے حقوق چھینے جاتے رہے اور قتل و غارت ہوتی رہی لیکن نائن الیون کے بعد دہشت گردی اور مسلمان لازم و ملزوم کر دیئے گئے۔ جہاں جہاں بھی دہشت گردی کا لفظ آیا ساتھ مذہب اسلام کا نام ضرور لیا گیا۔ گویا اسلام اور دہشت گردی کو ناگزیر قرار دیا گیا حالاں کہ دہشت گردی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا لیکن ہر مذہب میں دہشت گرد ضرور ہوتے ہیں۔ نائن الیون کے بعد اسلاموفوبیا ایک ایسی علامت کے طور پر ابھرا جس سے مراد غیر مسلم مفکرین اور عوام کا وہ گروہ تھا جو اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے سخت خوف زدہ تھا۔ اسلاموفوبیا

فوبیائی فکر سے تعلق رکھنے والے مفکرین کے نزدیک مسلمانوں کی تہذیب اور غیر مسلم اقوام کی تہذیب میں خاصا بعد ہے۔ مسلمان امریکی تہذیب کے بڑھنے اور پھلنے پھولنے میں ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔ اس طرح اس ناول میں اسلاموفوبیا کو بھی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

ناول "برف" محمد الیاس کی تخلیق ہے۔ محمد الیاس زود نویسی ہیں۔ ان کے نو افسانوی مجموعے منظر عام پر آ گئے ہیں جبکہ یکے بعد دیگرے چھ ناول بھی شائع ہوئے۔ ان کے ناولوں میں "برف" اپنے موضوع اور اسلوب بیان کی وجہ سے ایک اہم ناول ہے۔ اس ناول میں مرکزی کردار فخر النساء المعروف بی جان کا ہے جو کپڑے کے متمول تاجر شیخ نور الاسلام کی بیٹی ہے۔ ناول فخر النساء اور ظفر کے بے مثل پیار کے ساتھ ساتھ دیگر مذہبی اور سماجی مسائل کو بیان کرتا ہے۔ اس ناول میں "برف" دو محبت کرنے والوں کے درمیان سرد مہری کی علامت ہے۔ یہ ان تعلقات کی علامت ہے جو جمود کا شکار ہو چکے ہیں ان میں آتش عشق کی تابناکی مفقود رہی۔ اس ناول میں انہوں نے برف کو کئی جگہ علامت کے طور پر استعمال کیا۔

> "ہجر کے دنوں میں ریگزاروں اور برف زاروں سے آنے والی ندا کا راز اس پر کھل گیا مگر کچھ خوابوں کی تعبیر حقیقت کے برعکس بھی رونما ہوئی۔ خواب میں وہ فخر النساء کو سینے میں سمو لینا چاہتا تھا تاکہ وہ یخ بستہ ہونے سے محفوظ رہ سکے جبکہ بہت سے آلام اور اور خارج سے ہونے والے صدمے اب اس پر اثر انداز ہی نہ ہوتے۔"[52]

اس ناول میں اور کئی جگہ پر علامتوں کے استعمال سے ناول کو خوبصورت بنایا گیا ہے۔ یہ علامتیں ایک خاص پس منظر کے تحت استعمال کی گئی ہیں جو مخصوص معانی کو بیان کرتی ہیں۔

> "ملاں دانش مند کی عمر چالیس برس ہو گی۔ اپنے وطن پر سرخ یلغار کے خلاف جہاد کرتے ہوئے یہ مجاہد سب کچھ لٹا بیٹھا تو صرف ایک بیٹی زرمینہ کو لے کر پاکستان آ گیا"
>
> 53

مندرجہ بالا اقتباس میں "سرخ یلغار" کو بطور علامت استعمال کیا گیا ہے۔ سرخ یلغار سے مراد روس کی وہ جنگ ہے جو افغانیوں پر مسلط کی گئی، لیکن افغانی اپنے جذبہ ہمت اور بہادری سے اس جنگ میں غالب رہے اور دشمن قوتوں کو منھ کی کھانا پڑی۔ اسی طرح ایک اور جگہ پر "ڈاکو" کی علامت کو انہوں نے ملک پر حکومت کرنے والے راہنماؤں کے لیے استعمال کیا ہے جس کی تصدیق مندرجہ ذیل اقتباس کرتا ہے۔

"یہاں کوئی ڈاکو نہیں، اصل ڈاکو تو حکومتی ایوانوں میں رہتے ہیں۔ مہاڈاکو دارالحکومت میں بڑے طنطنے سے براجمان ہے۔ اللہ کو حاضر ناظر جان کر اٹھایا ہوا حلف بڑی ڈھٹائی سے توڑ ڈالا اور شب خون مار کر کروڑوں عوام کی منشاء کے خلاف ان کے سروں پر مسلط ہو گیا۔ قومی خزانے پر قابض ہوا اور بے رحمی سے اپنے گینگ کے ساتھی ڈاکوؤں میں لٹا رہا ہے۔ کمر توڑ مہنگائی پر بیان دیتا ہے " آٹا مہنگا ہو گیا تو کیا ہوا، مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی " [54]

مندرجہ بالا اقتباس میں محمد الیاس نے ڈاکو کی علامت تخلیق کر کے ملک کے حکمرانوں کو طنز و تعریض کا نشانہ بنایا ہے اور یہ حقیقت واضح کی ہے کہ کروڑوں عوام کے منشاء کے خلاف منتخب ہونے والے حکمران خدا تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر حلف لیتے ہیں۔ مگر جب اقتدار کی کرسی پر بیٹھتے ہیں تو اسی حلف اور اسی عہد کو توڑ دیتے ہیں جو انہوں نے خدا سے کیا ہوتا ہے۔ اقتدار حاصل کر کے وہ خود بھی ڈاکو بن جاتے ہیں اور اپنے رفیق سیاستدان بھی ڈاکو بنا لیتے ہیں اور پھر مل کر قومی خزانے کو لوٹتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور جگہ پر محمد الیاس نے پوری قوم کو ممولوں کی علامت بخش کر طنز کیا ہے۔

"ہم دنیا کی نرالی قوم ہیں۔ ممولے کو شہباز سے لڑا دینے والی۔ حالانکہ ہم خود ممولے کی قدرت بھی نہیں رکھتے جو اتنی پرواز تو کر سکتا ہے کہ اپنے بچاؤ کے لیے کسی گھنے درخت کی شاخوں میں پناہ لے سکے۔ جا طرح یہ گنجی چوہیاء بلی سے نہیں لڑ سکتی خواہ کتنی ہی تندرست کیوں نہ ہو جائے۔"[55]

مندرجہ بالا اقتباس میں ناول نگار نے پوری قوم کو ممولے کی علامت میں سمویا ہے جس سے مراد ایسی قوم ہے جو اندرونی طور پر خلفشار کا شکار ہے۔ اس کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا ہے۔ وہ آپس میں ایک مٹھی کی طرح متحد نہیں رہی۔ اس منتشر قوم کے دشمن بڑی طاقتیں ہیں اور ان بڑی طاقتوں سے مقابلہ کرنا اپنے وجود کو عدم وجود میں تبدیل کرنے کے کی مترادف ہے۔

اسی طرح ناول جاگنگ پارک میں " جاگنگ پارک " کو بھی ایک علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جاگنگ پارک ایک معاشرے کی علامت ہے۔ ایسے معاشرے کی جس میں مختلف قسم کے لوگ بستے ہیں اور یہ لوگ پس میں گفت و شنید کے ذریعے قومی مسائل پر آواز اٹھاتے ہیں۔ زیر نظر اقتباس میں جاگنگ پارک کے متعلق ناول نگار کا نقطہ نظر بیان کیا گیا ہے۔

"جاگنگ پارک کہنے کو تو پارک تھا اور جو لوگ یہاں آتے تھے ان کا بنیادی مقصد بھی واک ہی تھا مگر یہ واقعتاً ایک جہاں نما تھا۔ قسم قسم کے لوگ ایک بین الاقوامی اجتماع۔ ایک ایسی جگہ جہاں ہر شخص نے فکری اور آزادی سے چلتا تھا، بولتا تھا، کھاتا تھا، ہنستا تھا، یعنی جو دل چاہے وہ کر سکتا تھا۔ بین الاقوامی مسائل ہوں یا اندرونی، اسٹاک ایکسچینج میں مندی کا رجحان ہو یا تیزی کا، ڈالر کی قیمت گرے یا بڑھے اور روپیہ۔۔۔۔ باپ بڑا نہ بھیا !

56"

ناول جاگنگ پارک سے ماخوذ مندرجہ بالا اقتباس میں جاگنگ پارک کی علامت کی تشریح کی گئی ہے۔ جاگنگ پارک نام سے بظاہر ایک پارک ہے لیکن درحقیقت اس کے اندر ایک وسیع دنیا بستی ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں ہر قوم اور ہر معاشرے سے وابستہ انسان آتے ہیں۔ ہنستے کھیلتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں۔ یہ پارک ایک ایسی سوسائٹی ہے جہاں دنیا میں ہونے والے ملال انگیز واقعات گفتگو کا موضوع نہیں بنتے۔ اس سوسائٹی میں ہر ایک کو اپنی اور دوسروں کی خوشی عزیز ہے۔ اس سوسائٹی کا بنیادی وصف آزادی اور آزاد فکری ہے۔ انڈیا کے ناول نگار کا ناول "بادل" بھی ایک علامت ہے۔ مابعد نائن الیون جس طرح سے ساری دنیا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہوئی اور مسلمانوں پر سخت ترین حالات کا نزول ہوا تو یہ ایسے ہی نقشہ پیش کرتا ہے جیسے کسی علاقے پر طوفانی بادل آئے ہوے ہوں اور سارا علاقہ ہی شدید طوفان کی زد میں آچکا ہو۔ کوئی شک نہیں نائن الیون کے بعد مسلمانوں پر مصائب نے بادلوں کی طرح گھیراؤ کیا ہے۔ ناول کا نام بادل پوری ایک علامت بن کر اس سارے منظر نامے کو واضح کرتا ہے۔ آمنہ مفتی کا ناول "آخری زمانہ" دراصل زمانے کے اختتامی احوال کا بیان ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ ساری دنیا جلدی سے اپنے منطقی اور حتمی انجام کی طرف دوڑ رہی ہے۔ جس طرح کوئی چراغ گل ہونے سے قبل ایک روشن شعلہ دیتا ہے اور بجھ جاتا ہے۔ اسی طرح سارا نظامِ عالم تیزی سے آخری چمک لینے کی حالت میں ہے جس کے بعد ایک دائمی خاموشی ہے۔ ناول میں اگرچہ بہت سے موضوعات کو پیش کیا گیا ہے مگر اس کو بہ طور آخری زمانے کی علامت کے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ایم اختر کا ناول "ایک لوسٹوری ایک ایٹمی قیامت" بھی ایک علامت ہے جس کا مطلب ایسی تباہ کن ایٹمی جنگ ہے جو ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ جس طرح قیامت ساری کائنات پر برپا ہو گی اسی طرح مصنف نے ایٹمی جنگ کو بھی ایک قیامت قرار دیا ہے اور فرضی ایٹمی جنگ پاکستان اور بھارت کے درمیان کرا کر اس کے ساری دنیا پر مضر اثرات کو بیان کیا ہے۔ لہذا یہاں ایٹمی قیامت سے مراد ایٹم بم کے استعمال کے بھیانک نتائج ہیں۔

vi۔ ناول کی تیکنیک اور ہئیت

تکنیک ناولٹ کی فنی خوبیوں میں ایک اہم خوبی ہے۔ اصطلاحاً تکنیک سے مراد وہ طریقہ کار ہے جس سے مصنف اپنے تجربات و مشاہدات کو مختلف اسالیب بیان میں ظاہر کرتا ہے۔ لغت میں تکنیک کی تعریف یوں درج ہے۔

> "تکنیک ایک یونانی لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہے "فن یا طریقہ کار"۔ ادب میں لفظ تکنیک کو عموماً طرز تحریر یا قدرت بیان کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔"[57]

تکنیک ایک ایسا طریقہ کار ہے جو خیال کو وجود میں لانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ نائن الیون کے تناظر میں لکھے گئے ناولوں کا جائزہ لیا جائے تو طاؤس فقط رنگ، بادل، برف، جاگنگ پارک ایسے ناول ہیں جن میں بیانیہ تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔ بیانیہ تکنیک کے ساتھ ساتھ انہوں نے مکالمے کی تکنیک کا بھی استعمال کیا ہے۔ ان ناولوں میں مکالمے کی تکنیک کہانی کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ آمنہ مفتی نے اپنے ناول " آخری زمانہ " میں واحد متکلم کے ذریعے کہانی کو ترتیب دیا ہے۔ اس ناول میں آمنہ مفتی نے بیانیہ تکنیک کے ساتھ ساتھ جس تکنیک کا استعمال کیا ہے وہ فلیش بیک تکنیک ہے۔ ان ناولٹ میں انہوں نے موجودہ زندگی یعنی عصری زمانے کے مسائل کو ماضی کے زمانے بالخصوص عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے حالات و واقعات کو بیان کیا ہے۔

> "اموی، عباسی، عثمانی، صفوی خلافتیوں کے قصے سن لو۔ عباسیوں نے امویوں کے سروں کے دستر خوان سجائے یا عثمانیوں نے عباسیوں کو کھدیڑا تو وہ ہندوستان میں بہاولپور تک آ چھپے۔ لارنس آف عریبیہ کہاں سے آیا؟ اور اسپین میں مسلمانوں کی رواداری نے ایسے کیا گل کھلائے کہ واللہ کا اولی کا نعرہ بنانے والے آج بھی نصرانی ہیں اور الحمراء اور غرناطہ کے ویرانوں، اشبیلیہ کے نخلستانوں میں عربوں کے سے ناک نقشے کے لوگ یسوع مسیح کے پیروکار ہیں۔"[58]

اسی طرح پورے ناول میں کبھی بیانیہ تکنیک اور کبھی فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کر کے کہانی کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ فلیش بیک کی تکنیک کے استعمال سے قاری ماضی کے واقعات کو دیکھتا ہے۔ اس کی نظر مسلمانوں کے قرون اولیٰ کا نظارہ کرتی ہے تو اس کے باطن میں المیاتی تاثر جاگزیں ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے

باطن میں مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ کے اوراق پڑھ کر ملال انگیز رویہ اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح دیگر ناول طاؤس فقط رنگ، جاگنگ پارک، بادل اور برف بھی بیانیہ تکنیک اور فلیش بیک تکنیک کا حسین امتزاج ہیں۔ جاگنگ پارک، بادل اور برف میں مسلمانوں کا گزشتہ ماضی، جنگ عظیم کے کچھ حالات وواقعات، تقسیم ہند کے فسادات، نائن الیون کا حادثہ، مغرب کا جانبدارانہ رویہ، مسلمانوں کے ساتھ یک طرفہ سلوک اور ان پر تشدد کے واقعات فلیش بیک وقت بیانیہ ہر دو تکنیکوں کی مدد سے بیان کیے گئے ہیں۔ چاروں ناولوں میں فلیش بیک تکنیک کا استعمال بڑی خوبی سے کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بیانیہ تکنیک، مکالمے کی تکنیک اور واحد متکلم کی تکنیک کا استعمال بڑی مہارت سے کیا گیا ہے۔ نائن الیون سے متاثرہ یہ ناول موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

بھارت سے تعلق رکھنے والے تخلیق کار "شفق" کے تین ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے یہ ناول "کانچ کا بازیگر"، "بادل" اور "کابوس" کے نام سے شائع ہوئے۔ ان کا ناول "بادل" جدید بیانیہ فکشن کی ایک اہم مثال ہے۔ اس ناول میں انہوں نے اپنے تمثیلی بیان میں بیانیہ کی طوالت کو انگیز کیا ہے۔ ناول "بادل" ان کا دوسرا ناول ہے جو ۲۰۰۲ میں شائع ہوا۔ اس ناول میں انہوں نے عہد حاضر کے مسلمانوں کے عدم تحفظ، اضطراب، بے چینی، خوف ہو ہراس اور جنگ وجدل کے موضوعات کو بہترین ڈھنگ میں پیش کیا ہے۔ اس ناول میں خالد اور سلمی کی عشقیہ کہانی کے ذریعے جنگ و جدل، خوف و ہراس، فسادات اور کشیدگی کے موضوعات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس ناول میں سلمٰی کا کردار ایک غمزدہ لیکن مضبوط اعصاب کی حامل لڑکی کے کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ وہ بہن کے قتل اور باپ کی موت کے بعد دفتر میں کام کر کے اپنا گھر چلاتی ہے اس غمزدہ صورت حال میں خالد کی محبت اس کا واحد سہارا بنتی ہے اور وہ اس کی محبت میں پوری طرح ڈوب جاتی ہے۔ خالد اور سلمی کی کہانی کے ساتھ ساتھ اس ناول میں افغانستان کی جنگ اور پاکستان کے شہریوں کے عدم تحفظ کی داستان کو بھی سمیٹا گیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ناول ایک محبت کی کہانی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ افغانستان کی جنگ، اقوام عالم کے مسلمانوں کے عدم تحفظ اور بے چینی کو بھی ناول کا موضوع بنا کر اسے خوبصورت اور دلچسپ بنایا گیا ہے۔ ناول اپنے فکری اور فنی اعتبار سے کامیاب ہے۔ اس ناول میں شفق نے جذبات نگاری اور اور فضا بندی پر خاص پور پر توجہ دی ہے اور اس کے ذریعے ناول کی دلچسپی میں اضافہ کیا ہے۔ کرداروں کے جذبات تو ناول کا حصہ ہیں ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ناول نگار نے عام مسلمانوں کے

جذبات کو بھی خاص طور پر بیان کیا ہے۔ یہ جذبات مسلمانوں کے حالات و واقعات اور ان کی فطری زندگی کی کامیابی سے نمائندگی کرتے ہیں۔

اقبال حسن آزاد ناول کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"شفق کا یہ ناول کرداری نہیں۔ دراصل یہ ایک موضوعاتی ناول ہے اور موضوع ہی اس کی طاقت ہے اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ اردو کا پہلا ناول ہے لیکن چوں کہ یہ ناول بہت عجلت میں لکھا گیا ہے اس لئے ناول کے مرکزی واقعے یعنی ۱۱ ستمبر کے واقعات کو اس کے ذیلی قصے سے پورے طور پر نہیں جوڑا جاسکا اور فلمی انداز میں تمام کرداروں کو ملا کر روایت کے باسی پن کو برقرار رکھا گیا جس سے ناول کے اختتام پر ہلکے پن کا احساس ہوتا ہے پھر بھی خوف و دہشت کی فضا پورے ناول میں جاری و ساری ہے اور غالباً ناول نگار کا مقصد یہی ہے کہ آج مسلمانان عالم جس خوف و دہشت سے دوچار ہیں اس کی تصویر کشی کی جائے۔ اور ناول نگار اپنے اس مقصد میں پوری طرح کامیاب نظر آتا ہے۔"[59]

ناول نگار نے اس ناول میں بیانیہ تکنیک سے جنگ۔، فساد اور کشیدگی کی فضا کو اس کامیابی سے برتا ہے کہ ناول کی پوری فضا ایک ڈراؤنی صورت اختیار کر لیتی ہے اور ناول کا قاری خود کو اس ڈراؤنی فضا کا حصہ بنا لیتا ہے اور ناول ختم کرنے کے بعد بھی جنگ اور فساد کے مسئلے اور المیے پر غور و فکر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

شفق کا ایک ناول تکنیک کے تجربے کے لحاظ سے اہم ہے۔ اس ناول میں انہوں نے بیانیہ تکنیک سے کام لیا ہے۔ بیانیہ تکنیک میں لکھے اس ناول کا انجام طربیہ ہے لیکن یہ طربیہ انجام بھی قاری کو کئی سوالات اٹھانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ناول کی سب سے بڑی خوبی اس کا اختصار ہے۔ جنگ اور فساد پر مبنی اس ناول کی کہانی ایسی ہے کہ اگر اسے طوالت بخشی جاتی تو یہ ناول ایک خبر نامہ بن سکتا تھا لیکن یہ شفق کا کمال ہے کہ انہوں نے اختصار کے ساتھ جزئیات کو سمیٹا ہے اور کہانی کو ناول کی کہانی تک ہی محدود رکھا۔ اس ناول میں شفق نے شعور کی پختگی اور فن کاری سے کام لیا ہے۔ ناول کا اسلوب بے تکلفانہ ہے۔ ایک بے تکلف اسلوب کے ذریعے ناول نگار نے محبت کی کہانی اور جنگ و فساد کی فضا کو کامیابی سے صفحہ قرطاس پر مکمل کیا ہے ناول نگار نے اس ناول میں سادہ اور آسان الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ اس ناول کا اسلوب، انتخاب الفاظ اور ڈراؤنی فضا اس ناول کی تین نمایاں خوبیاں ہیں جو قاری کے لیے دلچسپی کا موجب بنتی ہیں۔

محمد الیاس کے ناول "برف" میں بھی بیانیہ تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے جس کا راوی واحد غائب ہے۔ اس ناول کا بیانیہ قدرت سادہ اور قدرے شاعرانہ ہے۔ اس ناول میں محمد الیاس نے انتخاب الفاظ اور ترتیب الفاظ میں فن کاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ انہوں نے دیہات کی سادگی کے حوالے سے بھی اسلوب کو چنا اور اس میں رنگینی کو بھی شامل کیا۔ محمد الیاس نے اس ناول میں مناسب الفاظ و تراکیب کا اس طرح استعمال کیا ہے کہ وہ قاری کے دل میں تاثرات پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ناول کی ہئیت ایک سادہ پلاٹ پر مبنی ہے۔ پلاٹ میں واقعات کی ترتیب کو منطقی انداز میں جوڑا گیا ہے۔ ناول کے پلاٹ میں تمام واقعات آپس میں گٹھے ہوئے ہیں۔ کہیں کسی واقعے میں کوئی جھول پیدا نہیں ہوتا۔ پلاٹ کے واقعات زنجیر کی کڑیوں کی طرح آپس میں مربوط و مضبوط ہیں۔ انہوں نے ناول میں واقعات کو اس طرح بیان کیا ہے جیسے قاری انہیں صفحات پر نہیں پڑھ رہا بلکہ اپنے سامنے رونما ہوتا دیکھ رہا ہے۔

vii۔ تراکیب اور ذخیرہ الفاظ

نائن الیون سے متاثرہ ان تمام ناولوں میں بہت سی نئی تراکیب اور نئے الفاظ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ تراکیب ناول نگار کے قلم کی جدت طرازی اور مشاقی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ناول "جاگنگ پارک"، "برف"، "بادل" اور "طاؤس فقط رنگ" میں عمدہ تراکیب اور زخیرہ الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ ان ناولوں میں سادہ و پیچیدہ دونوں قسم کے الفاظ کا چناؤ ملتا ہے۔ ان ناولوں میں چوں کہ موضوعات کی یکسانیت ہے اسی لیے ان میں اسلوب کی حد تک بھی کئی چیزیں مشترک پائی جاتی ہیں۔ ناول میں مشکل موضوع کا سادگی سے اظہار بظاہر سادہ لیکن در حقیقت ایک مشکل امر ہے۔ بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ سادہ اسلوب کوئی بھی تحریر کر سکتا ہے لیکن در حقیقت یہ ایک مشکل امر ہے کیوں کہ سادہ الفاظ کا انتخاب کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ سادہ الفاظ کے انتخاب کے لیے بھی کڑی محنت درکار ہے اور پھر ان سادہ لفظوں کو جملوں کا روپ دے کر موضوع کی مناسبت سے ڈھالنا مصنف کی مشاقی اور ہنر مندی پر منحصر ہوتا ہے۔ زیر جائزہ ناولوں میں انتخاب الفاظ میں خاص احتیاط برتی گئی ہے۔ ناولوں میں ایسے الفاظ کو بیان نہیں کیا گیا جن کی وجہ سے ناول کی قرات ہے دوران قاری کو کوئی مشکل پیش آئے یا وہ بار بار لغت کی طرف لپکتا رہے۔ ان ناول میں ایسا بیانیہ انداز اپنایا گیا ہے جس میں قاری کی ذہنی سطح کو مد نظر رکھ کر الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے اور ان میں سادگی اور حسن سے کہانی پیش کی گئی ہے۔ چاروں ناولوں کی کہانیوں کی بنیاد ایک محبت سے اٹھتی ہے۔ محبت کی کہانی بیان کرتے ہوئے دنیا میں وقوع

پذیر ہونے والے بڑے واقعات اور حادثات اس ناول کا موضوع بنتے چلے جاتے ہیں۔ ناول " جاگنگ پارک " میں ایسے زخیرہ الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے جن کا تعلق جنگ سے اور فتنہ و فساد سے ہے۔ ناول نگار نے انتخاب الفاظ میں بھرپور احتیاط کا دامن تھامے رکھا ہے اور موضوع کی مناسبت سے الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔ پیار، محبت اور رومانوی موضوع کے وقت انہوں نے شاعرانہ الفاظ کا انتخاب کیا اور تشبیہ و استعارہ سے مدد لی اور اس کے ذریعے ناول کو خوبصورت بنایا جبکہ جنگ، فساد اور مسلمانوں کے عدم تحفظ کیسے موضوعات پر انہوں نے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا جو موضوع کی تشریح و تعبیر میں مددگار ثابت ہوں۔

> " دہشت ، وحشت ، زنابالجبر ، سنگسار ، کاروکاری ، خود کش حملے ، بارودی سرنگیں ، دھماکے ، دہشت گردی ، جبر ، ظلم ، تشدد ، غربت ، فاقہ ، جہالت ، قتل ، المجاہد ، القاعدہ ، اسامہ بن لادن ، صدام حسین ، عراق اور بھی جانے کیا کیا۔ "[60]

ناول سے ماخوذ مندرجہ بالا اقتباس ناول نگار کے اسلوب کی خاصیت کو مکمل طور پر بیان کرتا ہے۔ انہوں نے موضوع سے متعلق الفاظ کا انتخاب کر کے نہ صرف الفاظ اور معنی کے رشتے کو مضبوط بنایا بلکہ قاری کے لیے بھی دلچسپی کا سامان پیدا کیا۔ انہوں نے منفرد الفاظ کے استعمال سے دوسرے ناول نگاروں میں امتیاز حاصل کیا اور یہی خوبی ان کی انفرادیت کی وجہ بنی۔ اسی طرح ایک اور جگہ انہوں نے معاشرے کے ایک عام کردار دھوبی کو جب بیان کیا تو اسے ایسے لفظوں کے ساتھ بیان کیا جو مقامی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ضرورت کے مطابق عوامیت کے نمائندہ الفاظ کو بھی ناول کی زبان کا حصہ بنایا اسی وجہ سے ان کا ناول ہر خاص و عام کے لیے توجہ کا مرکز بنا۔

> " دھوبی آیا، دھوبی آیا، کپڑے صاف، کپڑے صاف، کتنے کپڑے لایا، ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، دس اور بس۔ دھوبی کی افادیت کسی بھی زمانے میں ختم نہیں ہوتی۔ پھر آخر ہم سب دھوبی کے کپڑے کیوں نہیں لکھتے۔ " [61]

اسی طرح اس ناول میں سادگی سے جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ سادہ الفاظ کا اتار چڑھاؤ اور معاشرے میں ہونے والی عام باتوں کا بیان بھی ملتا ہے جس میں انہوں نے ایک عام فرد کی زندگی کے مکالمے اور اس کے جذبات کو عام الفاظ میں ہی بیان کیا ہے۔ وہ اپنے ناول میں جہاں جہاں بھی عام الفاظ کا استعمال کرتے ہیں وہاں وہاں ناول کی زبان میں سادگی جھلکتی ہے۔ اسی طرح سادہ اور، شستہ زبان کا استعمال ان کے ہاں بڑی خوبصورتی

سے ملتا ہے۔ ان کے ہاں جہاں سادہ الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے وہیں ان سادہ الفاظ سے چھوٹے چھوٹے جملے بنائے گئے ہیں اور حتی الامکان طویل جملوں سے گریز اختیار کیا گیا ہے۔

محمد الیاس کا ناول "برف" تراکیب کے استعمال اور الفاظ کے انتخاب کے لحاظ سے ایک اہم ناول ہے۔ اس ناول میں انہوں نے سادگی کے ساتھ ساتھ کچھ انتخاب الفاظ میں کچھ رنگ آمیزی بھی کی ہے۔ انہوں نے ناول "برف" میں شاعرانہ اسلوب کا استعمال کیا ہے۔ ایسے الفاظ کا استعمال کیا ہے جن کی شعریت بھری ہوئی ہے وہ اپنے فن کی لطافتوں کو الفاظ کے بیان کے ذریعے قاری کے سامنے لاتے ہیں اور اسی طرح یہ لطافت قاری کے رگ وپے میں سرایت کر جاتی ہے اور قاری ایک خوشی و مسرت کی لہر میں ڈوب جاتا ہے اور ناول کی قرات میں ہی اپنے لیے خوشی کا سامان ڈھونڈتا ہے۔ وہ ایسے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں جو لطف کا باعث بنتے ہیں اور کہانی میں رس گھولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے لفظوں کی رنگین بیانی سے ناول میں کئ رنگ بھر دیئے ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقتباس ان کے خوبصورت انتخاب الفاظ کو واضح کرتا ہے۔

> "تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔ دل موہ لینے والی باتیں۔ میں تو بہت پہلے بھی کم سن تھی تو تیرے پیار میں لٹ گئی۔ بڑے کشٹ بھوگ کر اس سطح سے اٹھی ہوں۔ دل لبھانے کی باتیں نہیں کرو گے۔ میری عمر بھر کی کمائی لٹ جائے گی۔۔۔ ایسے عاشق دلدار کی راحت بھری آغوش سے وداع ہو کر اگلی منزل کی جانب چل پڑنا کوئی کھیل نہیں" [62]

مندرجہ بالا اقتباس میں ناول نگار نے انتخاب الفاظ میں کمال احتیاط سے کام لے کر موضوع کی مناسبت سے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ انہوں نے محبت جیسے رومانوی موضوع کو رومانوی الفاظ کا جامہ پہنایا اور قاری کے لیے دلچسپ بنا کر پیش کیا۔ اس اقتباس میں انہوں نے "کشٹ بھوگ" کے نامانوس لفظ کا استعمال بھی کیا جو کسی طرح قاری کے لیے اس لفظ سے اجنبیت کا احساس دلاتا ہے۔ لیکن دوسری طرف دیکھیں تو اس ایک لفظ کے علاوہ ناول کا یہ پورا پیراگراف مکمل شاعرانہ سادگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس اقتباس میں خیال کو ایسے الفاظ کے ذریعے وجود دیا گیا ہے جن میں شعریت ہے، لطافت ہے اور جاذبیت ہے۔ ان کے شاعرانہ اسلوب کی ایک اہم خصوصیت تشبیہ ہے۔ تشبیہ کا استعمال کر کے انہوں نے ناول کو مزید دلچسپ بنایا ہے۔ تشبیہ کا بیان اور الفاظ کی خوبصورتی اس ناول میں واضح طور پر محسوس ہوتی ہے اور ناول کی دلکشی اور دلچسپی میں مزید اضافہ کرتی ہے۔

> "بی بی جان سرکار کا ظرف سمندر کی طرح وسیع ہے۔ وہ پاکیزہ چشمے کی مانند فیض رساں ہیں۔" [63]

اس دو سطری اقتباس میں ناول نگار نے دو مرتبہ تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔ بی بی جان سرکار کے ظرف کو سمندر کی وسعت سے تشبیہ دی ہے جبکہ ان کی تعلیمات اور ان کے فیض کو ایک پاکیزہ چشمے کی طرح ٹھہرایا ہے۔ اسی سطح تشبیہات اور استعارات کا نظام ان کے پورے ناول میں بکھرا پڑا ہے۔ ناول گویا ایک ایسا مرقع ہے جس میں انہوں نے تشبیہہ اور استعارہ سمیت طرح طرح کے رنگ بھرے ہیں۔ اور رنگوں کی مدد سے قاری کی توجہ حاصل کی ہے۔

اسی طرح انہوں نے ناول میں مقامی الفاظ اور مقامی زبان کے جملوں کو بھی ناول کا حصہ بنایا ہے۔ مقامی زبان نے الفاظ کا استعمال اس طرح کیا ہے کہ ناول کے مطالعے کے دوران ایسے الفاظ پڑھنے سے قاری فرط و انبساط کی لہر میں ڈوب جاتا ہے اور غیر متوقع طور پر خوشی کی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ ناول میں ایک کردار کی زبانی توتلی زبان میں ادا کئے گئے مکالمے کو ناول نگار نے یوں بیان کیا ہے۔

"بھوکاں لگ گئی تھیں۔ رات کو چولی چولی چھالن روٹی کھُوب کھاپی کے پھر نینیاں کرلی تھیں۔ جب چھے ہنّی مّنی چھرو کی نمازیں پڑھنا بھول گئی تھیں ۔۔۔۔ چلو کوئی بات نہیں۔ اچھی اچھی ہنّی مّنی ہو جائے ناں تو پھر دبا دب نماز پڑھ لیں گے۔"۔[64]

نیلم احمد بشیر نے اپنی تخلیقی خدمات کی بدولت اردو فکشن کے دامن کو مزید وسعت عطا کیں اور اس کے ذخیرے میں قابل قدر اضافہ کیا۔ نیلم احمد بشیر نے دس برس کی عمر میں اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا جو تاحال جاری ہے اور بڑی کامیابی سے جاری ہے۔ اس سفر میں نیلم کو کامیابی ملی ہے اسی وجہ سے وہ آج اردو ادب کے ہر حلقے میں انتہائی محترم شخصیت کے طور پر جانی جاتی ہیں۔ ان کا ناول "طاؤس فقط رنگ" سانحہ ستمبر ۲۰۰۱ کے تناظر میں لکھا جانے والا ناول ہے۔ یہ ناول ۲۰۱۷ میں سنگ میل پبلی کیشنز سے شائع ہوا۔ اس ناول میں انہوں نے سانحہ ستمبر ۲۰۰۱ کے بعد امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں کے ساتھ ناروا سلوک کی تصویر کشی کی ہے۔ امریکہ جو خود کو ساری دنیا کا خیر خواہ اور مددگار مانتا ہے اس نے اپنے ملک میں رہنے والے اقلیتی مسلمانوں کو تحفظ نہ دیا اور امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں کے ساتھ طرح طرح کا غیر منصفانہ سلوک کیا اور انہیں ظلم و جبر کا نشانہ بنایا۔ پچاس ابواب اور ۲۹۶ صفحات ہر مشتمل اس ناول کا نام علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل شعر سے اخذ کیا گیا ہے

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ

بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

اس ناول میں نیلم احمد بشیر نے مغرب اور مشرق کے معاشروں کے درمیان اقدار کے تضادات کو اپنا موضوع بنایا جس میں بدلتے ہوئے معاشرے کے افراد اور تعلقات کو سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی مسائل کے ساتھ متعلق کر کے ناول میں بیان کیا۔ نیلم احمد بشیر کا ناول "طاؤس فقط رنگ" میں زخیرہ الفاظ اور تراکیب کا اچھوتا استعمال ملتا ہے۔ انہوں نے جس طرح ناول کے عنوان کو خوبصورت الفاظ میں قلم بند کیا ہے اسی طرح ان کے ناول میں ہر جگہ خوبصورت الفاظ کا انتخاب سامنے آتا ہے۔ مابعد نائن الیون ایک اور رجحان بھی ناول نگاروں کے ہاں پایا گیا ہے کہ انھوں نے انگریزی زبان کے بہت سے الفاظ کو استعمال کیا ہے اور بہت سی ایسی اصطلاحات وضع کی ہیں جو اب معروف بھی ہو چکی ہیں۔ ٹیرر ازم، گلوبلائزیشن، اسلاموفوبیا، نائن الیون، ٹوین ٹاور، فیس بک، میسنجر، واٹس ایپ، وغیرہ۔ اس کے علاوہ بھی بہت س انگریزی الفاظ ان ناولوں کی صورت استعمال کیے گے ہیں۔

viii۔ مکالمہ نگاری

ناول میں مکالمہ کرداروں کے جذبات، احساسات اور خیالات کا ترجمان ہوتا ہے۔ کہانی کے ارتقاء میں مکالمے بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ ناول کے مرکزی موضوع کو آگے بڑھانے کے ساتھ ساتھ مکالمے واقعات اور حادثات کی تشریح کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ نائن الیوین کے تناظر میں لکھے جانے والے ناولوں کے تمام مکالمے اس مخصوص پس منظر اور کرداروں کی نفسیات کے عین مطابق ہیں۔ ناول نگاروں نے بہترین مکالموں کا استعمال کر کے ناولوں کی کہانیوں میں ایک روشنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مکالمے اتنے جازب اور دلچسپ ہیں کہ قاری خود بہ خود ان کو پڑھنے کی طرف راغب ہوتا ہے اور ان سے لطف کشید کرتا ہے۔ ان تمام ناولوں کے مکالموں میں حقیقی رنگ جھلکتا ہے۔ ناول "برف" میں بحث و مباحثہ اور سوالیہ انداز کا مکالماتی رنگ خوبصورتی کا باعث بنا ہے۔ ناول میں جملوں کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس سے قاری کے لیے بات کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ انہوں نے مکالماتی لب و لہجے میں جملوں کو سادگی کے ساتھ صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ نالوں کا مطالعہ کرتے ہوئے مناسب الفاظ، مناسب جملے، لب و لہجے کی خوبصورتی واضح ہوتی ہے اور عام زندگی میں پیش آنے والے مسائل اور بات چیت کا انداز ملتا ہے۔ ناول میں بعض جگہ خوبصورت محاورات کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ یہ محاورات اسلوب میں خوبصورتی اور دل کشی کا باعث

بنتے ہیں۔ اس محاوراتی انداز سے ناول کے حسن و خوبی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کے مکالموں میں مقامی رنگ بھی ملتا ہے اور بسا اوقات ایسے الفاظ کا استعمال ملتا ہے جو قاری کے لیے لطف کا باعث بنتے ہیں۔

"اکیلے اکیلے چولی چسکیاں لگالیں۔ یہ پھر یاری تو نہ ہوئی نا۔ اتنی چھلدی ہو گئی ہے۔ پاری پاری جوجہ رانی بمار ہو گئی تو زبیر بئی مان کیا کرے گا۔ اتنی شاندار محبوبہ کہاں سے ڈھونڈے گا۔۔۔ ڈھونڈوں میں گلی گلی جوگن بن کے۔" "فخری فخری پکاروں میں بن میں، پیاری فخری بسے مورے من میں۔"[65]

ix۔ منظر نگاری

ناول میں منظر نگاری کے فن کا بھی کامیابی سے استعمال کیا گیا ہے۔ منظر نگاری ناول میں دلکشی کا سبب بنتی ہے اور اس سے کہانی کے حسن و خوبی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کامیاب منظر نگاری کے ذریعے قاری بھی خود کو ناول کا ایک حصہ بنالیتا ہے اور یہ منظر بالواسطہ طور پر قاری کے مشاہدے کا حصہ بن جاتا ہے۔ منظر نگاری ناول کے زمان و مکان کے یقین میں اضافے کا سبب بنتی ہے اس کے ساتھ ساتھ پلاٹ کے ارتقاء اور کردار کی نشو نما میں بھی اہم ثابت ہوتی ہے۔ ناول نگار نے منظر نگاری کو بڑی کامیابی سے برتا ہے۔ ان ناولوں کے مطالعہ کے دوران قاری منظر سے اس طرح لطف اٹھاتا ہے کہ وہ خود کو اس منظر میں موجود پاتا ہے اور یوں مصنف کا مشاہدہ اور تجربہ قاری کا اپنا تجربہ بن جاتا ہے۔

"آج تیسرے روز بھی برف کے گالے آسمان سے اترتے رہے۔ عصر کے قریب مغرب کی سمت جھکے سورج نے ایک بار بادلوں کی اوٹ سے جھانک کر انہیں دیکھا۔ وہ سرخ نارنجی ہو رہا تھا اور نشیمن پر برسنے والے گالے سنہری ہو گئے تھے۔ چوٹی برف سے ڈھک گئی اور درختوں کی شاخیں برف کے بوجھ سے جھک گئیں۔ یخ بستہ جھیل کا پانی دودھیا بلور بن چکا۔"[66]

x۔ جذبات نگاری

ناول یا کہانی میں جذبات کا تعلق کرداروں سے ہوتا ہے۔ قصے کہانی کی عموماً دو اقسام ہوتی ہیں۔ طربیہ اور حزنیہ۔ طربیہ قصے میں کردار خوشی کے جذبات ظاہر کرتے ہیں اور قاری ان کے جذبات سے لطف کشید کرتا ہے اور خوشی و مسرت کی فضا محسوس کرتا ہے۔ جبکہ حزنیہ قصہ میں کرداروں کے جذبات غم انگیز اور درد

و ملال بھرے ہوتے ہیں۔ قاری ان کے دکھ بھرے جذبات کی رو میں بہہ کر خود کو بھی دکھی محسوس کرتا ہے اور یوں کرداروں کے اپنے جذبات قاری کی طبیعت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ نائن الیوین سے متاثر ناولوں میں جذبات نگاری زیادہ تر حزنیہ جذبات نگاری ہے۔ جنگ و جدل کے واقعات، جگہ جگہ لاشوں کا بکھرنا، قتل و غارت، ماؤں بہنوں کے اپنے عزیزوں کی موت پر بین کرنا، رونا اور غم کی کیفیت میں رہنا ناول کی کہانی میں حزنیہ جذبات پیدا کرتا ہے۔ طاؤس فقط رنگ، برف، پسِ آئینہ اور جاگنگ پارک میں مجموعی طور پر فطرت کے مطابق جذبات نگاری سے کام لیا گیا ہے۔ ان ناولوں کی کامیاب جذبات نگاری کی دلیل یہ ہے کہ ان کو پڑھتے ہوئے قاری ان کے کرداروں کی خوشی میں خوش اور ان کے غم میں غمگین ہو جاتے ہیں۔

xi ۔اسلوب بیان

اسلوب کو انگریزی میں style کہا جاتا ہے۔ اسلوب میں چوں کہ لفظوں کی کانٹ چھانٹ، کتر بیونت ہوتی ہے اور لفظوں کی تصحیح پر زور دیا جاتا ہے اور ان کو خوب احتیاط کے ساتھ برتا جاتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اسے انگریزی میں اسٹائل کا نام دیا گیا ہے۔ اسلوب میں کسی طرح کے منتخب الفاظ کو تحریر کا حصہ بنایا جاتا ہے۔ بلکہ انہی منتخب اور خوبصورت لفظوں کے ذریعے ہی خیال کو الفاظ کا جامہ پہنایا جاتا ہے۔ نائن الیوین سے متاثرہ ناولوں میں جاگنگ پارک، برف، بادل، اور طاؤس فقط رنگ میں اسلوب کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ان ناولوں میں الفاظ کو خوش اسلوبی کے ساتھ برتا گیا ہے۔ شیر جائزہ چاروں ناول چوں کہ موضوع کے لحاظ سے مناسبت رکھتے ہیں اسی وجہ سے ان نالوں میں اسلوب کی حد تک بھی مطابقت و اشتراک پایا جاتا ہے۔ چاروں ناول آسان نثر میں لکھے گئے ہیں اسی وجہ سے ان ناولوں میں منفرد صاحب اسلوب کا امتیاز کرنا قدرے مشکل ہے تاہم قاری اگر ان ناولوں کا دقت نظر سے مطالعہ کرے تو ناول " طاؤس فقط رنگ " اور " برف " کا اسلوب دیگر ناولوں سے مختلف ہے اور ان کے مصنفین صاحب طرز اور صاحب اسلوب کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

زیر جائزہ ناولوں کا اسلوب ناول نگاروں کی قوت مشاہدہ، وسعت مطالعہ اور زبان و بیان پر ان کے مکمل عبور کی دلیل ہے۔ ناول نگار جملوں کی نشست و برخاست پر مکمل عبور رکھتے ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان ناولوں کا اسلوب سادہ و شستہ ہے۔ زبان عام فہم ہے اور کسی گنجلک اور پیچیدگی سے مبرّا ہے۔ "برف " کے ناول نگار محمد الیاس نے اپنے اسلوب بیان میں مقامی الفاظ سے گریز نہیں برتا بلکہ انہیں خوبصورتی سے ناول کا حصہ بنایا ہے۔ انہوں نے بڑی روانی کے ساتھ مقامی زبان کے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ ان کے ہاں زیادہ تر تشبیہیں، استعارے اور تمثیلیں بھی مقامی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ جبکہ مثالیں، اقوال، کہاوتیں اور محاورے

بھی مقامی رنگ میں لکھے گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی زبان کو ہر طرح سے مقامی رنگ اور عوامیت سے بھرپور لکھا ہے۔ ان کے ناول میں بعض اوقات پنجابی زبان کا خاص طور پر استعمال کیا گیا ہے جس سے ایک مخصوص اردو قاری کی طبیعت پر گرانی بھی گزرتی ہے لیکن پنجابی زبان سے واقف قاری اس سے پوری طرح لطف لیتا ہے۔ ان ناولوں میں اسلوبی سطح پر بے پناہ تاثیر موجود ہے جس سے قاری لطف اندوز ہوتا ہے۔ ان ناولوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے مصنفین کی شخصیتیں ان کے اسلوب میں در آئی ہیں۔

ناول "برف" کے مصنف محمد الیاس کی بات کی جائے تو ناول کی قرات کے دوران ان کا منفرد اسلوب بیان سامنے آتا ہے۔ ان کے ہاں شاعرانہ لب و لہجہ اور سادہ الفاظ کا انتخاب ملتا ہے۔ انہوں نے تشبیہہ و استعارات کا استعمال کرتے ہوئے عمدہ الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔

> "پیار کی یہ سوغات قرنوں کے انتظار کا حاصل تھی۔ یہ دل نشیں مناظر، جن میں فخر النساء اپنے مادی وجود کے ساتھ موجود تھی۔ پوری رعنائیوں سمیت قلب و ذہن میں محفوظ ہو رہے تھے۔ چشمِ تصور سے ان وسیع و عریض ریگزاروں اور برف زاروں کو دیکھتا، جن سے ہجر کے دنوں میں ندا سنائی دیا کرتی تھی۔ سینے پر محوِ استراحت دل آرام ہستی کی جانب ذہن مبذول ہو جاتا تو خیال گزرتا کہ ساڑھے تین ہزار برس کی مسافت پر محیط ریگزاروں اور برف زاروں کا لامتناہی سلسلہ عبور کر کے آنے سے مسافر پر تھکن غالب آ گئی ہے۔"[67]

ناول کا اسلوب ابہام اور پیچیدگی سے یکسر خالی ہے۔ اسلوب بھرپور تاثرات کا حامل ہونے کی وجہ سے قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ناول کے سادہ اور سپاٹ بیانیے کو مختلف تشبیہوں، استعاروں اور تمثیلوں سے سجانے کی کوشش کامیاب رہی ہے۔ ناول کے اسلوب کی سادگی اور سلاست قاری کو اپنی گرفت میں رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ہر صدی نت نئے واقعات کی غماز رہی ہے لیکن اکیسویں صدی میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر امریکہ پر ہونے والے حملوں نے برصغیر سمیت ساری دنیا کو متاثر کیا۔ خاص طور پر مسلمانوں کی زندگیاں بری طرح متاثر ہوئیں۔ اسلام کے نام پر مسلمانوں کو سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی سطح پر بے جا پابندیوں میں جکڑ دیا گیا۔ اس واقعے کو اقوام عالم نے مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اور مختلف فنون کے ذریعے اس کا اظہار کیا گیا۔ مغربی ادب میں اس واقعے پر بے شمار ناول لکھے گئے۔ مسلمان ادیبوں نے بھی اس واقعے کی

شدت کو محسوس کرتے ہوئے اس پر قلم اٹھایا۔ اردو ناول کوئی شک نہیں اپنے عہد کی ایک جان دار تصویر ہے جس میں رواں زمانے کے سارے رنگ پائے جاتے ہیں۔

حوالہ جات

1. نجیبہ عارف، نائن الیون اور پاکستانی اردو افسانہ، اسلام آباد، پورب اکادمی،، ۲۰۰۰، ص ۲۲
2. احسان اکبر، ڈاکٹر، پاکستانی ناول: ہیت، رجحان، امکان، مشمولہ، ادبیات، شمارہ 22-121، اسلام آباد، 2019، ص 1
3. شبیر احمد قادری، ڈاکٹر، ناول میں کردار کی اہمیت، مشمولہ، ادبیات، شمارہ 22-121، اسلام آباد، 2019، ص 8
4. شاہد نواز، ڈاکٹر، پاکستانی اردو ناول میں عصری تاریخ، سرگودھا یونی ورسٹی، شعبہ اردو، 2018، ص 22
5. شاعر علی شاعر، جدید اردو ناول: اسلوب اور فن، عکس پبلیشرز، لاہور 2018، ص 105
6. ۔ایضاً ص 108
7. محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، اردو ناول میں کردار کی اہمیت، مشمولہ، ادبیات، شمارہ 22-121، اسلام آباد، 2019، ص 105۔۔۔۔
8. امجد طفیل ڈاکٹر، اردو ناول اکیسویں صدی میں، مشمولہ، ادبیات، شمارہ 22-121، اسلام آباد، 2019، ص 87
9. حمیرا اشفاق، جدید اُردو فکشن: عصری تقاضے اور بدلتے رجحانات، سانجھ، لاہور، 2010، ص، 87۔
10. آمنہ مفتی، فلیپ، آخری زمانہ، فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۱
11. محمد شاہد حمید، گزشتہ چند برس اور اردو ناول، مشمولہ، ادبیات، شمارہ 22-121، اسلام آباد، 2019 ، ص 21
12. بلقیس ریاض، روزنامہ نوائے وقت، فروری ۲، ۲۰۲۳

13. آمنہ مفتی، آخری زمانہ، فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۱، ص ۳۵۲
14. ایضاً، ص ۳۶۰
15. عبدالصمد، جہاں تیرا ہے یا میرا، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۱۸، ص ۱۲۶

16. ایضاً، ص۱۲۶, ۱۲۷
17. محسنہ جیلانی، میں دہشت گرد ہوں، کراچی، شہر زاد پبلی کیشنز، ۲۰۰۸، ص۴۷
18. ایضاً، ص۶۸
19. خالدہ حسین، فلیپ، "ساسا"، لاہور، عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸
20. محمد شیر از دستی، ساسا، لاہور، عکس پبلی کیشنز، اشاعت دوم، ۲۰۱۹، ص۷۵
21. ایضاً، ص۱۴۲
22. اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲
23. فتح محمد ملک، اپنی آگ کی تلاش، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور: ۹۹۹۱، ص۶۳
24. محمد سفیر اعوان، ڈاکٹر، "خس و خاشاک زمانے ایک تجزیہ"، مشمولہ معیار، شمارہ جنوری تا جون ۳۱۰۲، مدیر، ڈاکٹر رشید امجد، شعبہ اردو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
25. آمنہ مفتی، آخری زمانہ، ص۳۶۰
26. ایضاً، ص۱۹۵
27. ایضاً، ص۲۱۷
28. ایضاً، ص۲۹۱
29. عبدالصمد، جہاں تیرا ہے یا میرا، ص۲۱۶
30. ایضاً، ۲۷۲
31. ایضاً، ۲۹۷
32. ایضاً، ۳۱۴
33. حمد شیر از دستی، ساسا، ص۷۵
34. ایضاً، ۱۵۲
35. آمنہ مفتی، آخری زمانہ، ص۴۹۵
36. ایضاً، ۴۹۵
37. عبدالصمد، جہاں تیرا ہے یا میرا، ص۲۱۸، ۲۱۷
38. ایضا، 45
39. ایضاً، ص۲۳

40. محسنہ جیلانی، میں دہشت گرد ہوں، ص۴۸
41. آمنہ مفتی، آخری زمانہ، ص۱۴۳
42. ایضاً، ص۱۹۰
43. محمد شیراز دستی، ساسا، ص۱۴۰
44. ایضاً، ص۱۴۸- ۱۴۹
45. محسنہ جیلانی، میں دہشت گرد ہوں، ص۳۲
46. نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷، ص۲۲۲
47. قاسم یعقوب، ناول میں نئی تکنیک اور تجربات، مشمولہ، ادبیات، شمارہ 22-121، اسلام آباد، 2019، ص 94
48. ایضا ص98
49. ایضا ص97
50. محمد الیاس، برف، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ص۵۰۵
51. ایضاً، ص۱۶
52. ایضاً، ص۸۹
53. ایضاً، ص۹۱
54. نگہت حسن، جاگنگ پارک، کراچی، شہر زاد پبلشرز، ۲۰۱۰، ص۳۵
55. ایضا، ص37
56. ایضا، ص65
57. فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو افسانہ میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۱۰، ص۱۱
58. آمنہ مفتی، آخری زمانہ، ص۶۳
59. مباحثہ، پٹنہ، دسمبر ۲۰۰۲ء تا، جنوری ۲۰۰۳ء ج:۳-۲ ش:۹، بادل ایک تجزیاتی مطالعہ، ص: ۶۶
60. نگہت حسن، جاگنگ پارک، ص۶۵
61. ایضاً، ص۶۵
62. محمد الیاس، برف، ص۵۰۴

63. ایضاً، ص ۴۳۲

64. ایضاً، ص ۵۷

65. ایضاً، ص ۸۰

66. ایضاً، ص ۵۰۵

67. ایضاً، ص ۵۰۵

باب سوم:

وار ٹر اما، مابعد نائن الیون اردو ناول کا تجزیہ

الف۔ تمہید

انسان اپنے غور و فکر اور استدلال و تعقل کی جبلت کی وجہ سے دیگر مخلوقات میں سب سے نمایاں ایک اہم مخلوق ہے۔ اللہ نے اسے شعور اور آگاہی کے ساتھ بیان کی صفت عطا کی ہے، انسان اپنے مافی الضمیر کو بول کر یا لکھ کر بیان کرتا ہے، ہر دو صورتیں انسان کے دماغ سوچ اور فکر کے آئینہ دار ہوتی ہیں۔ انسان کا متمدن زندگی کی طرف سفر اور علوم کی تفہیم تشریح اور آغاز اس بات کا متقاضی تھا کہ سارے عمل کو تاریخی، زمانی، تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے محفوظ کیا جائے۔ چناں چہ انسان نے ہر شعبہ ہائے زندگی کی جستجو اور تلاش کے بعد سامنے آنے والے حقائق کو کتابی صورت میں محفوظ رکھنے کی روایت کا آغاز بھی متمدن حیات کے ساتھ ہی کر دیا تھا۔ انسان نے جہاں ماحول، معاشرت اور فطرت سے بہت کچھ سیکھا ہے وہیں اس نے اپنے خیال، مزاج اور مرضی کے مطابق اسے متاثر کرنے کی بھی کوششیں کی ہیں۔ انسان ایک ہی وقت میں اپنے ماضی، حال اور مستقبل کو نہ صرف سوچ سکتا ہے بل کہ اسے اپنے ادراک کی صلاحیتوں سے بیان بھی کر سکتا ہے یعنی یہ محض فطرت پر ہی انہیں انحصار نہیں کرتا بل کہ اپنے مزاج کو بھی استعمال کرتا ہے اس حوالے سے یوسف حسن لکھتے ہیں

> "انسان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے موضوعیت پر غور و فکر کر سکتا ہے اور اپنے اپ کو ماحول سے باہر نکال سکتا ہے یعنی اپنے شعور اور عمل دونوں میں اور ان کے ساتھ ارادے سے بھی وہ مخصوص زمانہ مکان سے اگے یا پیچھے بھی سوچ سکتا ہے اور یہ اس کا خصوصی امتیاز ہے"[1]

انسان نے شعور علم اور آگاہی کے ساتھ ساتھ مختلف شعبہ ہائے زندگی کو مختلف علوم اور درجوں میں تقسیم کر کے سمجھنے اور بیان کرنے کا ہنر سکھا تو اس طرح علوم کی ہزاروں شاخیں وجود میں آئیں جن کے بیان کے لیے بہر حال کتابت کی ضرورت بھی تھی یہ کتابت آگے چل کر ہر شعبے یعنی سائنس تاریخ، مذہب ،فلکیات، ریاضیات وغیرہ کا ادب یا لٹریچر کہلائی۔ یوسف حسن اس حوالے سے مزید لکھتے ہیں کہ

"اگر تاریخی حوالے سے دیکھیں تو انسان کے ساتھ ہی ادب ایک باقاعدہ خصوصی شعبے کی حیثیت سے شروع نہیں ہوا پہلے انسان نے اپنی بقا کا سامان کیا اس بقا کے کام میں رفتہ رفتہ تقسیم کی محنت کا سلسلہ بڑھتا گیا اس میں انسان نے جمالیاتی اصول سیکھے اور یوں مختلف شعبے مخصوص شکلوں میں ڈھلتے چلے گئے" [2]

انسان کی زندگی جس طرح مختلف سماجی حیثیتوں اور وحدتوں میں تقسیم ہونے کے باوجود ایک دوسرے پر انحصار کرتی ہے اسی طرح انسان، کائنات اور ان سے متعلق علوم بھی اپنے انفرادی شناخت کے باوجود ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ادب جیسا اہم ترین شعبہ اپنے دور کے حالات و واقعات سے آشنا رہے اور وقت کی آواز نہ بن سکے۔

ادب کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید بہت خوبصورت تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"ادب مذہبی عقائد، سائنسی جدت اور علمی نظریات سے براہ راست استفادہ کرتا ہے اور عامتہ الناس کو تہذیبی اور روحانی ترفع عطا کرتا ہے" [3]

یعنی وہ وسیع دنیا ہے جو ہر شعبہ ہائے زندگی کے رموز کو تشریح و توضیح کے ساتھ ادبیت کی چاشنی عطا کر کے عام لوگوں کے ذوقِ سلیم کی نہ صرف آب یاری کرتا ہے بل کہ انسان کے دماغ کی وسعت کو بڑھوتری بھی دیتا ہے۔ ادب ہے کیا اس کے حوالے سے انور سدید کا مزید یہ کہنا ہے

"ادب عربی زبان کا لفظ ہے مرور ایام کے ساتھ اس کے معنی میں مختلف تبدیلیاں واقعہ ہوئیں، قدیم عربی میں یہ لفظ دعوتِ طعام کا مترادف سمجھا جاتا تھا پھر اس کے گرد اخلاقیات کا روشن حلقہ مرتب ہوا۔ فروغ اسلام کے ابتدائی زمانے میں ادب کو تعلیم کے معنوں میں استعمال کیا گیا، عجمی تصورات میں ادب سے مراد وہ علوم عربیہ ہیں جن سے اس زبان پر پوری قدرت حاصل ہوتی ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اب یہ قیاس کرنا مناسب ہے کہ اس زمانے میں اعلی تحریروں کا مطالعہ ادب کی قلم رو میں شامل کیا گیا تو ان تحریروں کی تخلیق پر بھی ادب کا اطلاق ہونے لگا" [4]

اسی جگہ انور سدید میتھیو آرنلڈ کے حوالے سے ادب کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں

"وہ تمام علم جو کتابوں کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے ادب ہے" [5]

صلاح الدین احمد ایک انگریزی مفکر نیومین کے ادب کے حوالے سے قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں "وہ تمام افکار اور احساسات جو زبان اور لفظ کے ذریعے ادا ہوں ادب کہلاتے ہیں"[6]

کچھ اور مغربی مفکرین نے ان ادبی تخلیقات میں قاری کو شامل کر کے اس کی مسرت اور انبساط کو بھی شامل کیا ہے۔ ہر زبان کا ادب مختلف علوم و فنون کے ساتھ انسانی ذوق سلیم سے بھی تعلق رکھتا ہے اس کا یہ تعلق تاریخ، تہذیب سے بھی ہوتا ہے اور انسانی معاشرت سے بھی، یہ ادب جہاں ماحول، سماج اور حقائق سے حاصل شدہ معلومات پر مشتمل ہوتا ہے وہی انسان کا اپنا ذوق اور حسِ جمال وغیرہ بھی اس کی تخلیق میں اہم کردار ادا کرتے ہیں کسی بھی ادب کی تخلیق پر اثر انداز ہونے والے بیرونی عوامل کے حوالے سے جلیل عالی لکھتے ہیں

"میں سمجھتا ہوں کہ ہماری تخلیقات میں ہماری فکری تہذیبی روایت اپنے جملہ جہتوں کے ساتھ پوری طرح زندہ و سلامت ہوتی ہے"[7]

ادب ایک طرف معاشرتی دنیا سے وجود حاصل کرتا ہے اور پھر عصر رواں کی آواز بنتا ہے تو دوسری طرف واپس انسانوں اور معاشروں کی سوچ، فکر اور کردار پر بھی اثر انداز ہوتا ہے ڈاکٹر سائرہ ارشاد اس حوالے سے لکھتی ہیں

"دنیا کا کوئی بھی ادب اپنے عصر سے اکثر کنارہ کش نہیں ہو سکتا وہ اپنے زمانے میں جیتا اور سانس لیتا ہے روزانہ پیش آنے والے حالات و واقعات پر اس کی گہری نگاہ ہوتی ہے اور وہ اس ساری صورت حال کو تخلیق کا روپ دیتا ہے [8]

انسان کے فکری رویے ہمیشہ ارتقائی سفر جاری رکھتے ہیں لہذا یہ ادب جو انسان کے ساتھ ہی تخلیق سے آشنا ہوا تھا اس ارتقائی سفر کے تمام طرح کے احوال کو اپنے اندر محفوظ کرتا ہوا چلا آرہا ہے۔ یہ ادب ایک طرف انسانی تاریخ کی داستان ہے تو دوسری طرف قدیم تاریخ کی دستاویز بھی، قدم بہ قدم انسانی تہذیب کی ترقی کے ساتھ چلتا ہوا اور ہر دور کے آثار و عوامل کو سمیٹتا ہوا یہ ادب جدید دور میں داخل ہو چکا ہے۔ یعنی ادب کی ایک خاص صفت ہے کہ یہ فی زمانہ ہر اعتبار سے ہر زمانے کی آواز بنتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ ڈاکٹر

روبینہ سلطان اس حوالے سے لکھتی ہیں "جوں جوں انسان کی فکر ارتقا پذیر ہوتی ہے، جدید ذہنی رجحانات وجود میں آتے ہیں اور یقینی طور پر ان کا اثر ادب پر بھی پڑتا ہے"[9]

ایک اور اہم بات کہ ادب کو زندگی کا ترجمان ہونا چاہیے نہ کہ اسے کلیتاً زندگی ہی سمجھ لینا چاہیے۔ اس کی اپنی علاحدہ سے ایک شناخت اور حیثیت ہے۔ دیکھا جائے تو ادب اظہار کا وہ پیمانہ ہے جس میں زندگی کے ہر طرح کے رنگ تو پائے جاتے ہیں مگر اس کی اپنی ذاتی حدود اور تشخص بھی موجود ہے۔ ادب دراصل وہ روزن ہے جس کے ذریعے ہم ہر طرح کے موضوعات کو دیکھ، سن اور پڑھ سکتے ہیں لہذا ادب کی ادبیت، مزاج اور خصوصیات اپنی علاحدہ سے پہچان رکھتی ہیں۔ مجنوں گورکھپوری اس حوالے سے لکھتے ہیں

> "ادب کو کبھی زندگی کی تنقید بنایا گیا، کبھی زندگی کی تمہید، کسی نے اسے اس کو زندگی کا پھل پھول کہا اور کسی نے فکریاتی عمارت کی اوپری کاریگریاں، یہ سب ادھوری حقیقتیں ہیں جو ہم کو دھوکے میں ڈال دیتی ہیں۔ ادب یہ سب کچھ ہے اور اس سے بہت زیادہ بھی، یہ سب باتیں ہوتی رہیں گی مگر ادب اپنی جگہ ادب رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا"[10]

اسی بحث میں آگے چل کر مجنوں گورک اور ادب کی مزید وضاحت یوں کرتے ہیں

> "ادب انسان کے جملہ مادی اور غیر مادی موثرات کا نتیجا ہے اور اس کی عملی اور فکری حرکات و سکنات کا ماحاصل۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ادب نہ تو خارجی اسباب اور حالات سے ماورہ ہے اور نہ مقصد و غایت سے بے نیاز" [11]

مختصر لفظوں میں ادب انسانی سرگرمیوں کا محور ہے۔ تمام تر انسانی جذبات و احساسات اور کیفیات کو جب تحریری زبان ملتی ہے تو اسے ادب کی ایک صورت کہا جاتا ہے۔ یعنی ادب بنیادی طور پر انسانوں کے سماج کے تمام تر دستیاب پہلوؤں کا اظہار سمجھا جاتا ہے۔ یہ پہلو انسان کے ارد گرد کی دنیا اور اس کی نفسیاتی، جذباتی اور احساساتی کیفیات سے مرکب ہوتے ہیں۔ لہذا ادب من جملہ طور پر انسان کے تمام تر رجحانات اور تحریکات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جب سے انسان نے لکھنے لکھانے کا عمل شروع کیا ہے تو اس نے شعوری یا لاشعوری طور پر انسانوں کے رویوں اور اعمال و افعال کے مطابق تحریروں کو وجود بخشا۔ ایک ایرانی محقق نفسیات نژان حیدری زاد لکھتے ہیں

> "Considerably literature has influenced in the life of human being, it has an empowered language to display the inner

world of men. There is a space for memories, introspection retrospection, foreshadow, flashback and awful remembrances that are colored by pain, wound and trauma,"[12]

انسان یادوں کا ایک ایسا مرکب ہے کہ جس میں خود شناسی، ماضی پرستی، مستقبل کی سوچ، اچھی بری یادیں وغیرہ مختلف رنگوں کی صورت جلوہ گر رہتی ہیں اور پھر ادیبوں کے ہاتھوں ادب میں بیان ہوتی ہیں اور پھر نقاد ان کی تشریح و تعبیر کرتے ہیں۔ کسی بھی فرد یا قوم کا اپنا ایک مخصوص تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی منظر نامہ ہوتا ہے۔ اسی منظر نامے کی ذیل سے مختلف علوم ہآئے زندگی کا اغاز ہوتا ہے۔ یعنی ادب اس منظر نامے کی وہ تحریری صورت ہے جسے خود انسانوں نے محفوظ کر رکھا ہوتا ہے۔ ہر دور میں ادب کے اندر نئے رجحانات اور کیفیات کو برتا جاتا رہا ہے، ادب کی نفسیاتی تفہیم اور انسانی نفسیات کے مطابق ادب کی ترتیب بہت زیادہ پرانی بات نہیں۔ جنگ عظیم دوم کے بعد چند نفسیات دانوں نے جنگ سے متاثرہ انسانوں کے بارے میں مطالعہ شروع کیا۔ یہ مطالعہ جہاں انسان کی پیچیدہ نفسیاتی اور جذباتی کیفیات کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوا وہیں ادب کے افق پر بھی اس کی بازگشت مختلف انداز میں سنائی دی جانے لگی۔

ب۔ ادب اور ٹراما تھیوری

ادب میں ٹراما تھیوری کو باقاعدہ طور پر جنگ عظیم دوم کے بعد انسانی المیوں، صدموں اور لمحہ ہآئے اضطراب کے بیان کی ضرورتوں کے مطابق سے شروع کیا گیا۔ معروف ناول نگار اندرے کوبینہ (Andre Cobina) نے ادب میں ٹراما تھیوری کو پرکھنے اور تفہیم کرنے کا اغاز کیا۔ انہوں نے جنگ عظیم کے زیر اثر تخلیق ہونے والے ادب پر ایک تحقیقی رپورٹ

Trauma and recovery in post war literature

میں ترتیب دی جس میں جنگ کے بعد ادبی کاموں میں ٹراما کے عناصر کو تشخیص کرنے کی کوشش کی گئی۔ یعنی اس رپورٹ میں جنگ کے بعد وجود میں انے والے ادب میں ادیبوں نے کس قسم کے کرداروں ،رویوں اور کہانیوں کو وجود بخشا ہے اور ان تمام کرداروں، رویوں اور کہانیوں میں ٹراما کی کون کون سی صورت کا اظہار ملتا ہے، کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس رپورٹ کے ساتھ ہی ادب میں ٹراما کی تشخیص اور ٹراما کے موضوع

کو ادب کی دنیا میں تلاش کرنے کی روایت شروع ہوئی۔ ادب کا یہ نیا اور نفسیاتی پہلو ٹراما اور ادب کے نام سے پروان چڑھنے لگا۔ اس تحقیقاتی رپورٹ کے علاوہ سیگمنڈ فرائیڈ کا نفسیات پر کیا جانے والا کام بھی ٹراما تھیوری کے اغاز کا باعث بنا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادب میں ٹراما تھیوری کے وجود کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ وہ کون سے پیمانے ہیں جن کے تحت ادب اور ٹراما تھیوری کو ماپا جا سکتا ہے؟ میڈیکل کی دنیا میں تو ٹراما ایک شدید ذہنی صدمے کی صورت میں ایک نفسیاتی عارضے کے طور پر لیا جاتا ہے جس کی نوعیت اور کیفیت حادثے کے مطابق پرکھی جاتی ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ مریض کس طرح کے حادثے سے گزرا ہے اور اس کے دماغ پر اس کا کس قدر اثر ہوا ہے؟ حادثے کے دوران اور حادثے کے بعد کے تمام اثرات کا جائزہ میڈیکلی لیا جاتا ہے ۔ مگر ادب میں ٹراما تھیوری کا مطلب میڈیکل سے ہٹ کر ہے ٹراما تھیوری کے تجربات کی روشنی میں ادبی کاموں میں مختلف کرداروں، کہانیوں اور رویوں میں نفسیاتی اور ذہنی صورتوں کو موضوع بنایا جاتا ہے اور ان تمام بیماریوں، جنگوں ا، انقلابات اور دیگر مصائب کا بھی تجزیہ کیا جاتا ہے جو کسی بھی ذہن پر صدمے کا باعث بنے ہوتے ہیں۔ ٹراما تھیوری کے ذریعے کتابوں، ناولوں، افسانوں، ڈراموں اور شاعری میں انسانوں کے ان تجربات کی تشخیص کی جاتی ہے جن کا تعلق کسی خوف، ڈر، فرار یا صدمے سے ہوتا ہے۔

ادب میں ٹراؤما تھیوری کے وجود کی اہمیت یہ رہی ہے کہ اس کے ذریعے تجزیہ نگار مختلف ادبی کاموں میں مختلف طبقات کے افراد کی صدمآتی کیفیات اور ان کو ہونے والے تلخ تجربات کو سامنے لآتی ہے یہ کوشش جہاں ادبی نقطہ نظر سے اہم ہے وہیں اس کا فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ ایک وسیع تر انسانی سمآج کو فروغ دینے کے لیے ممد ثابت ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے جب ادب میں جنگوں، بیماریوں اور دیگر الام کے تحت وجود میں انے والے کرداروں اور کہانیوں کو بیان کیا جاتا ہے، ان کی تفہیم کی جاتی ہے اور ان کو شائع کیا جاتا ہے تو اس کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی بھی جنگ یا فتنے کی صورت میں انسانوں کو کس قسم کے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کس طرح ان جنگوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی غیر یقینی اور غیر انسانی کیفیات انسانی معاشروں کو تباہ کرتی ہیں ۔ اس تباہی کے نقشے کی پیش کش کے ساتھ ٹراما تھیوری ادب کے ذریعے اس بات کا اہتمام بھی کرتی ہے کس طرح ان صدمآتی المیوں سے بچا جا سکتا ہے۔ ٹراما تھیوری انسانی رویوں کو سمآج کے حالات کے مطابق تجزیہ کر کے گہرائیوں کے ساتھ اس کی حساسیت کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ مقامی اور زمانی سیاق وسباق کے مطابق ادبی کاموں میں ٹروما کے عناصر کی تلاش، تجزیہ اور تشخیص کی جاتی ہے۔ یعنی اس تھیوری کے فریم ورک میں متنوع ادبی اشکال یعنی شعر، ناول، ٹراما وغیرہ کے ذریعے نہ صرف ٹراما کے مختلف علامات اور کیفیات کو بیان کیا

جاتا ہے بل کہ ان کی تفہیم بھی کی جاتی ہے۔ادب میں ٹراما تھیوری کے استعمالات کی بنیاد پر ادبی دنیا میں اب تمام ادبی اصناف کے اندر ٹراما کے موضوعات اور عناصر کی تلاش اور تجزیے کی روایت میں ایک پختہ اضافہ ہوا ہے اور اس کے نتائج بہت دلچسپ اور بہترین حاصل ہوئے۔ادب کے ساتھ دلچسپی کا لیول بڑھا ہے، انسانیت کے مختلف پہلوں کو سمجھنے میں مدد ملی ہے اور غور و فکر اور استدلالی قوتوں کو فروغ ملا ہے۔ادب کو سائنسی اپروچ کے ساتھ تجزیہ اور تحقیق کے میزان پر لایا گیا ہے جو ایک طرف تو ادب عالیہ کے فروغ میں مددگار ثابت ہو رہا ہے اور دوسری طرف انسانی رویوں کی پیچیدہ ترین نفسیات کا پتا لگانے میں مددگار ثابت ہو رہا ہے۔ادب میں ٹراما تھیوری ایک کلیدی اصطلاح کے طور پر رائج ہو چکی ہے۔ ادب کی تحقیق، تفہیم اور تنقید کے لیے ٹراما تھیوری نے ایک نیا زاویہ اور نقطہ نظر دیا ہے۔تنقیدی شعور میں انسان کی نفسیات سے جڑی اس اصطلاح نے نئے تنقیدی امکانات کو روشن کیا ہے، ادب میں ٹراما تھیوری کے ابلاغ اور استعمال کے حوالے سے ایک محقق اپنے ارٹیکل ٹراما سٹڈیز میں لکھتے ہیں۔

> Psychological trauma, it's representation in language and the role of memory in shaping individual and cultural identities are the central concern that define the field of trauma studies. Psychoanalytic theories on trauma paired with additional, theoretical frameworks such as post structural, sociocultural and post-colonial theories form the basis of criticism that interprets representation of an extreme experience and its effect upon identity and memory."[13]

اسی ارٹیکل میں وہ ادب میں ٹرومے کی اہمیت کے حوالے سے لکھتے ہیں

> "Trauma studies explore the impact of trauma in literature and society by analyzing its psychological rhetorical and cultural significations"[14]

ادب میں ٹروما کا مطالعہ خود ٹراما کے مطالعے کے ساتھ ساتھ انفرادی یا قومی سطح پر افراد کے خاص نفسیاتی رویوں کی تفہیم کا باعث ہے جو افراد میں کسی نہ کسی شدید کیفیت یا صورت کے باعث نمودار ہوتے ہیں۔ ٹراما کا یہ مطالعہ ایک طرف ٹراما کی اقسام کی تفہیم کو ممکن بناتا ہے وہیں دیگر ثقافتی عوامل کو ادب اور معاشرے کے تناظر میں پرکھنے میں مدد دیتا ہے۔ کسی بھی ادب پارے میں موجود ٹراما کی ممکنہ کیفیات، کردار، کہانی، مکالمے اور یہاں تک کہ خود مصنف کی ذاتی نفسیات کو اس مطالعے کے ذریعے تجزیہ کیا جاتا ہے اور ایک نتیجا پیش کیا جاتا ہے۔ ادب میں ٹروما کے اثرات کا جائزہ ان پیمانوں پر لیا جاسکتا ہے۔

انسان بہت جلد کسی بھی سنگین صورت حال سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اس کا نفسیاتی نظام مختلف عوامل کے ساتھ ہم اہنگ ہو کر ترتیب پاتا ہے۔ پیدائش سے لے کر اپنی موت تک کے ارتقائی سفر میں انسان ہزاروں عوامل کے زیر اثر اپنے مزاج، رویے اور فکر کو ترتیب دیتا رہتا ہے۔ ان عوامل کے اثرات الگ الگ طرح کے ہوتے ہیں کچھ عوامل انسان کو مسرت، خوشی اور فرحت کا احساس دلا کر زندگی کی خوب صورتی کے پہلو کو نمایاں کرنے میں مدد دیتے ہیں اور کچھ ایسے عوامل ہوتے ہیں کہ جن کے اثرات انسان کے ذہن، دماغ، مزاج اور رویے پر بہت منفی طور پر مرتب ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسان اپنی نارمل زندگی سے نکل کر ایک غیر یقینی اور قابل رحم حالت میں چلا جاتا ہے۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہاں انسان کی داخلی جبلت، فطرت اور مزاج اس کے طرز عمل کو ترتیب دیتے ہیں وہیں بیرونی عوامل یا ماحول کے اثرات بھی اس کی زندگی پر مکمل طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انسانی نفسیات یا کردار ان دونوں طرح کے عوامل کا حاصل ہوتا ہے، یہ اندرونی اور بیرونی عوامل اگر توازن میں رہیں اور غیر معمولی صورت حال اختیار نہ کریں تو انسان بھی ایک نارمل زندگی بسر کر سکتا ہے لیکن اگر ان عوامل میں ذرا سی بھی تبدیلی رونما ہو جآئے تو انسان بھی ان سے ہر صورت میں متاثر ہوتا ہے۔ بیرونی عوامل دو طرح کے ہوتے ہیں۔ کچھ تو یہ خود انسانوں کے پیدا کردہ ہوتے ہیں اور دوسرے قدرتی عوامل جن مین بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ یعنی اندرونی اور بیرونی عوامل مل کر ہی انسان کی نفسیات کے میکنزم کو ترتیب دیتے ہیں۔ انسان ان عوامل کے رد عمل کے طور میں مختلف رویے اپناتا ہے۔ انہی رویوں کے اثرات اس کی گفتگو، تحریر اور تقریر میں بھی مرتب ہوتے ہیں۔ اگر ہم انسانی نفسیات مزاج اور رد عمل کو ایک ڈائیگرام میں پیش کریں تو وہ اس طرح ترتیب پا سکتی ہے ۔

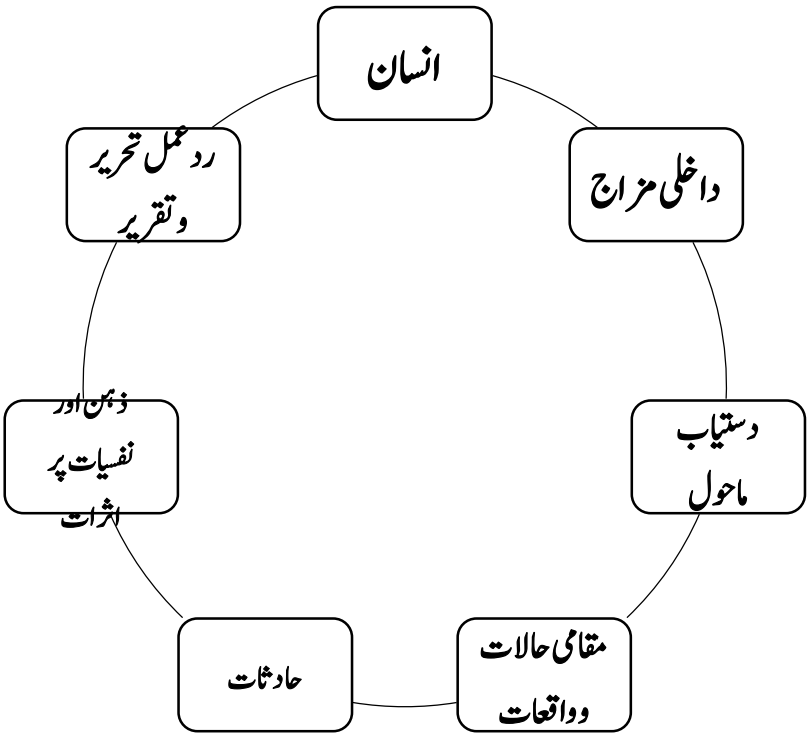

انسان اب جب ہم انسانوں کے تخلیق کردہ ادبی سرمائے کو اسی اصول کے تحت دیکھیں تو اس سے بالکل انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ادبی تخلیقات ان عوامل کے زیر اثر نہیں تخلیق ہوئی ہوں گی۔ لہذا یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان کی تمام تر تحریروں کے اندر بھی اس کے ماحول حالات اور واقعات کی نوعیت کسی نہ کسی طور پر موجود ہوتی ہے۔

کچھ ماہرین نفسیات یہ کہتے ہیں کہ انسانی نفسیات بنیادی طور پر سماجی نفسیات ہی کی ایک جھلک ہوتی ہے ۔اس سوسائٹی یا سماج میں جو کچھ رونما ہو گا بھلے وہ کوئی اچھا واقعہ ہو یا برا، کوئی تعمیری معاملہ ہو یا تخریبی وہ نہ صرف ہمارے دماغوں پر اثر انداز ہو گا بل کہ ہماری ادبی تخلیقات میں بھی اس کی جھلک ضرور ملے گی۔ بقول ریچرڈ گراس (برطانیوی ماہرِ نفسیات):

> "All psychology is social psychology: all behavior takes place within a social context and even when we are alone, our behavior continues to be influenced by others."[15]

یعنی تمام تر ادبی تخلیقات کے اندر وہ تمام حالات وواقعات نظر آجاتے ہیں جو انسان کے ارد گرد رونما ہو رہے ہوتے ہیں یا رونما ہو چکے ہوتے ہیں۔ ٹروے کا تعلق کیوں کہ خوف، صدمے، ڈر اور انسانی شناخت

کے کھو جانے سے ہے اس لیے ادب میں ٹراما تھیوری کے ذریعے ہم ادب کے اس گوشے کا مطالعہ کرتے ہیں کہ کسی بھی ادب پارے میں کن حادثاتاور واقعات کے اثرات مرتب ہوئے ہیں اور مصنف نے کن واقعات کی ذیل میں اپنے ادبی تخلیق کو چناہے اور پھر اس کو بیان کیاہے۔ ظاہر ہے ہر حادثہ یاواقعہ اپنے مخصوص اثرات رکھتاہے اور وہ دیر پاہونے کی صورت میں انسانی سماج کے اندر پرورش بھی پاتا رہتاہے۔ ادب میں ٹراما تھیوری کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم ان واقعات اور حادثات کو پرکھیں اور ان کی شدت کو دیکھیں جن کی وجہ سے کسی بھی ادب پارے میں ایسے کردار، کہانی، رویے ڈالے گے جو صدمآتی فضا قائم کر رہے ہوں۔ ٹراما تھیوری ادب میں کسی بھی متن کے جائزے کے دوران ایک نیا فریم ورک مہیا کرتی ہے جس کے ذریعے ہم ایک منظم اپروچ کے ساتھ متن کی تفہیم کر سکتے ہیں اور متن کے اوپر اثر انداز ہونے والے تمام واقعات کو ترتیب دے سکتے ہیں۔

ج۔ ٹراما تھیوری کے ممکنہ وظائف

i۔ تنقیدی امکانات اور ٹراما تھیوری

کسی بھی ادبی متن کی تفہیم، تشریح و توضیح کے لیے ماہرین یا نقادین نے بے شمار طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ اگرچہ نفسیاتی دبستانِ تنقید کسی بھی ادب پارے کا خالص نفسیاتی بنیادوں پر جائزہ لیتاہے مگر اس میں ایک چیز کی کمی رہ جاتی ہے کہ نقاد یہاں صرف متن کے اندر رہ کر کسی مصنف کے اور متن کے نفسیاتی زاویوں کی تشریح کرتاہے وہ ان عوامل اور واقعات اور حادثات کو نہیں چھیڑتا جو اصل میں کسی مصنف کے دماغ پر اثر انداز ہوئے اور جن کے تحت اس نے وہ خاص قسم کا متن ترتیب دیا جس میں ٹراما یااس کے دیگر عناصر پائے جاتے ہیں۔ لٹریچر میں ٹراما تھیوری کا ابلاغ اب اس بات کو بھی مد نظر رکھتاہے کہ متن میں ان تمام المیاتی اور صدمآتی کیفیات کا جائزہ لیا جائے جو اس متن کی تخلیق کے گارے میں شامل ہوں۔ متن کے اسلوب سے لے کر اس کے اندر پیش تمام کرداروں کا تنقیدی مطالعہ ٹراما تھیوری کے فریم ورک میں رہ کر کیا جاسکتاہے۔

ii۔ ادبی زبان پر ہونے والے اثرات کا جائزہ

جس طرح دیگر پیمانوں سے ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ وہ زبان جس میں کوئی ادبی تخلیق وجود میں ائی ہے اس پر حالات وواقعات کے کیسے اثرات مرتب ہو رہے ہیں؟ ماحول، معاشرہ مل کر وہ کون سے اضافے کرتے ہیں جن کا ابلاغ ادب پاروں کی زبان میں بھی پایا جاتاہے۔ ادب پاروں کا یہ تفہیمی مطالعہ پہلے سے مختلف

زاویوں سے کیا جاتا رہا ہے مگر ادب میں ٹراما تھیوری فریم ورک نے کسی بھی ادب پارے اس کی زبان اور اس کی تخلیق کے طریقے کو ان بنیادوں پر پرکھنے میں مدد دی ہے جہاں سے وہ شروع ہوتے ہیں یا جہاں ان کی جڑیں موجود ہوتی ہیں۔ کسی اصطلاح، مکالمے، واقعے، کہانی وغیرہ کے اندر نفسیاتی المیوں کا بیان یہ بتا رہا ہوتا ہے کہ وہ کون سے خاص عوامل تھے جنہوں نے کوئی مخصوص اصطلاح، کہانی یا کردار جنم دیا ہے۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ٹراما تھیوری نے نئے تنقیدی شعور کو بھی جنم دیا ہے۔

کسی بھی متن میں ٹراما تھیوری کے فرائض بہت سارے ہوتے ہیں یہ تھیوری دیگر اہم ترین تھیوریز سے مل کر متن کی ساخت، بناوٹ اور واقعات کی ترتیب کو بیان کرتی ہے ماہر نفسیات نصر اللہ ممبرول کہتے ہیں۔

> "Trauma theory analyses the complex psychological and social factors that influence the self's comprehensions of traumatic experience and how such experiences shapes and in shaped by language. The formal innovations of text, both print and media, that display insights in to ways that identity, the unconscious, and remembering and influence by extreme events thus remain a significant focus of the field."[16]

کوئی واقعہ کس طرح انسان کو متاثر کرتا ہے؟ اور کس طرح انسان کے مزاج اور رویے کو ترتیب دیتا ہے؟ اور پھر کس طرح وہ ادب کے اندر بیان کیا جاتا ہے؟ اس کے بیان کا کیا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے؟ اس واقعے یا حادثے نے کون سا متن ترتیب دیا ہے؟ اور زبان پر اس نے کیا اثرات مرتب کیے، ان سب کا جائزہ ادب میں ٹراما تھیوری کا اہم فرض سمجھا جاتا ہے۔ صدمے کا نظریہ یعنی ٹراما تھیوری ادبی متن میں اس بات کا جائزہ بھی لیتا ہے کہ ادب میں تکلیف دہ تجربات اور احساسات کا ابلاغ کیسے کیا جاتا ہے اور اس کو کس طرح سمجھا جا سکتا ہے؟

iii۔ ٹراما کی پیش کش یا ابلاغ کی تفہیم

ٹراما تھیوری قارعین اور نقادوں کو یہ تجزیہ کرنے میں مدد دیتی ہے کہ ادب کسی بھی تکلیف دہ سنگین یا خوفناک صورت حال اور اس سے حاصل ہونے والے تجربات اور رونما ہونے والے نتائج کی کس طرح

نمائندگی یا ابلاغ کر سکتا ہے؟ یہ اس بات کی دریافت بھی کرتی ہے کہ مصنفین کس طرح ٹراما کے، افراد اور معاشروں پر اثرات کو بیان کرنے یا پہنچانے کے لیے علامات، ٹیکنیک اور زبان کا استعمال کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں

ٹراما تھیوری نفسیات اور نفسیاتی پہلوؤں کی باریکیوں کو سمجھنے کے لیے نفسیاتی دانش فراہم کرتی ہے۔ افراد کی پیچیدہ ترین نفسیاتی صورت کو ٹرومے کی ذیل میں مطالعے کے لیے ایک بصیرت عطا کرتی ہے۔ ٹراما تھیوری ادب میں یاداشت کے کھو جانے، جبر ستم، ادب شناخت، اپنے اپ سے بیگانہ ہو جانے کے رویے اور مابعد ٹراما مینٹل ڈس ارڈر جیسے موضوعات کو تلاش کرنے میں مدد دیتی ہے۔

iv۔ تاریخی اور ثقافتی موضوعات

ٹراما تھیوری نہ صرف کسی ادب پارے میں موجود صدمآتی علامات کو تلاش کرتی ہے بل کہ یہ ان تاریخی اور ثقافتی عوامل پر بھی غور کرتی ہے جن میں کوئی ادبی کام تیار ہوا ہو اور شائع کیا گیا ہو۔ اس کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ کسی جنگ، تشدد جبر، نقل مکانی اور دیگر ہولناک حادثات جیسے تلخ معاشرتی عوامل ادب میں ٹراما کی پیشکش گنجائش اور ابلاغ کو کیسے متاثر کرتے ہیں؟ اور کس طرح ادب کی دنیا میں تحریری صورت میں اپنا ایک اثر چھوڑ سکتے ہیں؟

v۔ اخلاقی دائرہ کار

ٹراما تھیوری ادب میں سانحات اور واقعات کی موجودگی اور بیان کے حوالے سے نہ صرف اخلاقی سوالات اٹھاتی ہے بل کہ اخلاقی جواز پیدا کرنے کی بھی کوشش کرتی ہے۔ اس کے ذریعے ادب میں مصنفین کو ایک ایسا فریم ورک مہیا کیا جاتا ہے جو ان کو کسی بھی سنگین مسئلے کے نتیجے میں رونما ہونے والے اثرات کو بیان کرنے کے دوران ایک احساس ذمہ داری بھی پیدا کرتا ہے۔ یہ احساسِ ذمہ داری ان کو ان کی حدود کے اندر رہتے ہوے کسی کی نجی زندگی کو بیان کرنے کا ہنر بھی عطا کرتا ہے۔ اخلاقی دائرہ ٹراما تھیوری ادب میں متاثرہ افراد سے متعلق قارین اور عوام کے دل میں ایک ہمدردی اور دلی احساس پیدا کرنے کی بھی کوشش کرتی ہے۔ ٹراما تھیوری ادب میں حادثے سے بچ جانے والے افراد کے تجربات کو قارین اور ناقدین کے تخیل سے ہم امیز کرنے کا سامان بھی مہیا کرتی ہے۔ یعنی یہ نظریہ افراد کو نہ صرف اخلاقی جواز مہیا کرتا ہے بل کہ ادب کے اندر ایسے متاثرہ افراد کے ساتھ ہمدردی اور یکجہتی کا احساس بھی پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

vi۔ٹروما سے نجات کا راستا

ٹراما تھیوری اگرچہ صدمات کی وجہ سے ہونے والے درد، تکلیف اور دیگر غیر یقینی کیفیات کو بیان کرتی ہے۔ یہ ادب میں ایک لچک پیدا کر کے ٹراما سے بچنے اور شفایاب ہونے کے لیے بھی ایک مربوط خیال پیش کرتی ہے۔ اس کے ذریعے یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ افراد اور معاشرہ کس طرح سنگین حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ اور متاثرہ افراد کی شفایابی کے کیا ممکن حل ہو سکتے ہیں؟

vii۔ ادبی متن کی تفہیم کا نیا زاویہ

کسی بھی متن کی تفہیم کے لیے جہاں دیگر اور طریقے استعمال کیے جاتے رہے ہیں وہیں اب ادب میں متن کی درست اور مکمل نفسیاتی، جذباتی اور احساساتی بنیاد پر تفہیم کے لیے ٹراما تھیوری ماڈل کو اپنایا جاتا ہے اور اس کے ذریعے متن کے حقیقی معنوں کو اس کے پس منظر کے ساتھ بیان کرنے میں مدد ملتی ہے۔

viii۔ ادبی بیانیہ اور نمائندگی

ٹراما تھیوری اس بات کا اہتمام کرتی ہے کہ ادبی متن کس طرح تکلیف دہ تجربات اور ٹروما کو بیان کرنے جیسے چیلنجوں کے بارے میں نمائندگی اور رہبری کرتا ہے۔ ٹروما یا صدمے کے انتہائی پریشان کن اثرات کو بیان کرنے یا حاصل کرنے کے لیے مصنفین کو جدید ٹیکنیکس کو استعمال کرنا پڑتی ہیں اور ان تکنیکس سے مصنفین حادثے سے بچ جانے والوں کے نفسیاتی ڈھانچوں کی تباہی اور ان کی تفہیم کے لیے زبان اور بیان کی کیفیات کو ترتیب دیتے ہیں۔ ٹراما تھیوری ادب میں ٹروما کی سماجی حیثیتوں کو واضح کرنے میں بھی مدد دیتی ہے۔ یعنی سماج میں ٹراما کس کس حیثیت اور نوعیت سے پایا جاتا ہے۔ ٹراما تھیوری نے ادب میں کچھ نئی اصطلاحات کو بھی برتا ہے۔ مثلاً عورتوں کے ٹروما کو نسوانی ٹراما، جنگ کے اثرات کے لیے جنگلی ٹراما، نوبادیاتی نظام کے تحت نوبادیاتی ٹراما، جدید دور میں جدید ٹراما، جذباتی ٹراما، سماجی ٹراما، وغیرہ جیسی ٹروما کی سماجی اصلاحات کو بھی ٹراما تھیوری کے ذریعے واضح کیا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر ٹراما تھیوری کا نظریہ ادب میں ٹراما کی تمام تر کیفیات کی نمائندگی، تشریح اور اخلاقی مضمرات پر ایک ضابطہ پیش کر کے ٹراما کے مطالعے کو تقویت بخشتا ہے۔ یہ ادبی بیانیہ میں انسانی مصائب اور ان کے رد عمل کی شدت کو پہچاننے اور اس کا حل تلاش کرنے میں بھی مدد دیتا ہے۔

د۔ ادب میں ٹراما تھیوری کی ابتدا یا روایت کا آغاز

ادب میں ٹراما تھیوری کا مطالعہ سب سے پہلے 1990 کی دہائی میں شروع ہوا۔اس مطالعے کے لیے ٹروے کا ایک ایسا ماڈل تیار کیا گیا جس کا انحصار فرائیڈ کی تھیوریز پر تھا،اس ماڈل کے ذریعے ٹیکسٹ میں زبان و بیان اور معنی و مفہوم کی تلاش کی جاتی تھی۔بنیادی طور پر ٹروے کی ابتدا اور اثرات کے بارے میں نفسیاتی بنیاد پر مطالعہ 19 ویں صدی کے دوران شروع ہوا۔ابتدا میں یہ مطالعہ ہسٹیریا کے جائزے سے شروع ہوا تھا ۔اس مطالعہ یا تحقیق میں سگمنڈ فرائیڈ کے علاوہ جوزف بریو،، جین مارٹن چارکوٹ،ابراہم کارڈنر اور مورٹن پرنس وغیرہ شامل تھے۔ٹروے کی ابتدائی بحث تو کسی جنسی حملے اور اس کے اثرات میں پیدا ہونے والے نفسیاتی صدمے سے شروع ہوئی،بعد میں اس کو دیگر المیاتی حادثوں کی روشنی میں بھی پرکھا جانے لگا اور اخر کار ٹروے کے مطالعے کے لیے ایک مربوط اور منظم فریم ورک بنالیا گیا اور پھر اسی فریم ورک کی توسیع کے طور پر اسے ادب میں ایک تنقیدی ائینے یا زاویے کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ٹراما تھیوری بیسویں صدی میں ایک نئے تنقیدی زاویے کے طور پر وجود میں ائی اور اسے مطالعہ کا ایک اہم شعبہ قرار دیا گیا۔اگے چل کر یہ ٹراما تھیوری نفسیات، نفسیاتی تجزیے اور ادبی تنقید میں ہونے والی پیش رفت میں زیادہ ممد ثابت ہوئی۔ادب میں ٹراما کا نظریہ یہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے کہ کس طرح ٹراما انفرادی اور آجتماعی سطح پر وجود میں انے والے متن یا ٹیکسٹ میں تجربے کے بیان اور اس کی بناوٹ اور کیفیت وغیرہ کے بیان کو پیش کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فرائیڈ کے ٹراما پر تحقیقی کام نے نفسیاتی اثرات کو سمجھنے کی بنیاد رکھی۔فرائیڈ نے ٹراما کے تصور کو ایک ایسے جذبے کے طور پر متعارف کرایا جو کسی فرد کی برداشت کرنے کی صلاحیت کو ختم کر دیتا ہے اور جس کی وجہ سے ظلم و ستم،ادب شناخت،علاحدگی،فلیش بیک جیسی علامات متاثرہ انسان میں ظاہر ہوتی ہیں۔انسان کے لاشعور میں بسی باتوں اور ان کی دوبارہ واپسی کے نظریات نے مصنفین کو یہ ہنر دیا کہ وہ کیسے ادبی متن میں ٹروے کو پیش کر سکیں یا اس کا تجزیہ کر سکیں۔

ادب میں ٹراما تھیوری کے ابتدائی نقوش کا جائزہ ہم اس طرح پیش کر سکتے ہیں

i۔ابتدائی مباحث

ٹراما تھیوری کی جڑیں جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے فرائیڈ کی نفسیاتی تحقیقات سے جڑی ہیں۔فرائیڈ نے اپنے مریضوں میں صدمہ آتی تکالیف مثلاً جبر، ظلم،بے ہوشی وغیرہ کے حوالے سے پیدا ہونے والے تجربات

کے بارے میں کچھ تصورات پیش کیے جو اگے چل کر اس بات کی بنیاد بنے کہ کس طرح ٹراما کسی بھی انسان کی نفسیات میں یا ادب کے بیان میں اپنے اپ کو پیش کرتا ہے۔

ii۔ ہولوکاسٹ ادبی متن

ہولوکاسٹ لٹریچر نے بھی ادب میں ٹراما تھیوری کی پیشرفت میں ہم کردار ادا کیا ہے۔ اس دور کے اہم مصنفین نے شعوری طور پر ہولوکاسٹ کی تباہ کاریوں کی عکاسی اپنے ادبی تخلیقات میں کی۔ ان مصنفین میں ایلی ویزل اور پریمولیو اہم ہیں۔ ہالوکاسٹ کیوں کہ مغرب میں ایک تباہ کن سانحہ قرار دیا جاتا ہے تو اس کے اثرات ہر طبقہ ہآئے زندگی پر مرتب ہوئے۔ اس حادثے میں بچ جانے والے افراد کی ذہنی اور جذباتی کش مکش پر کی جانے والی تحقیق نے جہاں میڈیکل کی دنیا میں انسانی نفسیات کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کیا وہیں ادب پر اس کے اثرات اور بیانیے کو بھی ادبی ٹرامیٹک تھیوری میں اہم سمجھا جاتا ہے۔

iii۔ ویت نام کی جنگ

ویت نام کی جنگ اور اس کے نتیجے میں وقوع پذیر انسانی المیے نے بھی ٹرومے کی ادب میں تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ ٹرم اوبرین اور فلپ کے ٹیو جیسے مصنفین نے اپنی تحریروں میں جنگ کی تباہ کاریوں کے ساتھ ساتھ نفسیاتی طور پر زخمی ہونے والے افراد کے رویوں کی عکاسی کی۔ ادب میں ٹراما کے عناصر کی روایت کو اس جنگ اور اس سے نمودار ہونے والے شدید المیاتی حالات و واقعات نے بھی بڑھوتری دی۔ اس ادب کو جب تنقیدی طور پر تفہیم کی کسوٹی پر پرکھا گیا تو اس بات کا گہرا جائزہ لیا گیا کہ ادب میں صدمے کے کیا ممکنہ اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

iv۔ مابعد نو آبادیاتی ادب

مابعد نو آبادیاتی ادب کا تعلق تاج برطانیہ کے تحت دنیا کے مختلف ممالک میں ہونے والے حادثات اور سیاہ ترین مظالم کو ادب میں پوری شدت سے بیان کیا گیا ہے۔ افریقہ، جنوبی اشیاء اور دیگر علاقے جو تآج برطانیہ کے کنٹرول میں تھے ان میں جس طرح کے انسانی المیوں نے جنم لیا وہ ناقابل بیان ہیں۔ اس دور کے ادب نے اس تمام صورت حال کو اور اس صورت حال میں ہونے والے نفسیاتی تجربات کو ادب میں بیان کیا ہے ۔ ادب کے موضوعات میں ایسے کردار، کہانیاں اور مکالمات شامل ہوئے جو ٹرومے کے اثرات سے بھرپور

تھے۔ ادب نے ایک پورا گوشہ مابعد نوبادیات کے نام سے وجود میں ایا جس میں وقوع پذیر صدمات کو پیش کیا گیا۔ اس ادب نے بھی ٹراما تھیوری کی نشو نما میں ہم کردار ادا کیا۔

V۔ تانیثی نظریے کے ساتھ جڑت

خواتین ہمیشہ معاشرے میں مردوں کے مظالم کا نشانہ بنتی رہی ہیں۔ ان کا استحصال ہمیشہ سے ہوتا چلا ایا ہے۔ یہاں تک کہ ایسی مظالم کی داستانیں رقم ہوئی ہے کہ انسان کا وجود کانپ اٹھتا ہے۔ چنانچہ عورتوں کے حقوق کے لیے اٹھنے والی تحریک اور شعوری بیداری کے لیے بھی مختلف نظریات پیش کیے گئے۔ ادب میں صنف نازک کے مزاج، سوچ فکر اور اس کے رد عمل کو خصوصی طور پر موضوع بنایا گیا۔ عورتوں میں ٹرومے کی کیفیات کو تلاش کرنے کے لیے بھی ادب میں موضوعات کو شامل کیا گیا۔ کیتھی کراؤتھ اور ایلن اسکری نے ادبی متن میں عورت اور ٹرومے کے ربط اور عورتوں کے ٹرومے کے بعد کے تجربات کو نہ صرف بیان کیا بل کہ ان کی تشریح وتوضیح بھی کی۔

vi ۔ دیگر نظریات اور ٹراما تھیوری

ادب میں ٹرومے کا جائزہ لینے کے لیے بے شمار اور تھیوریز بھی استعمال کی گئی ہیں جن میں نفسیاتی تجزیہ ،ڈی کنسٹرکشن، فلیش بیک، شعور، تحت الشعور کا بیانیہ وغیرہ جیسے نظریات شامل ہیں۔ یہ نظریات ٹراما تھیوری کے ساتھ مل کر یہ پتا لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کس طرح ادب میں صدمے اور تلخ تجربات وغیرہ کو بیان کیا جا سکتا ہے اور کس ممکنہ حد تک ادبی عبارتیں ان صدمات اور ان کی کیفیات کو بیان کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ اہم یہ نہیں کہ کسی ادب پارے میں ایسے حالات و واقعات کو بیان کیا جآئے جن کا تعلق انسان کے ذہن اور نفسیات سے ہے اور کسی بھی حادثے کے بعد انسانی رد عمل کو بیان کیا جآئے بل کہ اہم یہ ہے کہ کیا کسی زبان میں الفاظ اور معنی یہ طاقت رکھتے ہیں کہ وہ کسی بھی انسان پر بیتنے والی کیفیات کا نقشہ ہو بہو پیش کر سکیں۔ یعنی ان دونوں پہلوؤں کو ٹراما تھیوری اور دیگر تھیوریز کے ساتھ جوڑ کر دیکھا جاتا ہے کہ ایا ادب انسانی المیوں کو پیش کرنے میں کامیاب ہوا ہے کہ نہیں۔ دوسرا یہ کہ زبان و بیان نے بھی اس پیشکش کو ادا کرنے میں اہم ادا کردار ادا کیا ہے یا نہیں۔ ٹراما تھیوری انسانی ثقافت اور تہذیب سے جڑی ہے۔ ہر دور میں ایسے المیاتی سانحے ہوتے رہے ہیں جنھوں نے ہر دور کے ادیب کو مجبور کیا کہ وہ اس ٹرومے کا اظہار اپنے ادب پارے میں کریں۔ لہذا فی زمانہ ٹراما کے تجربات، مشاہدات اور رد عمل کو بیان کیا جاتا رہا ہے۔ ٹراما تھیوری ادب میں ٹرومے کی تمام

ممکنہ جہتوں کے بارے میں سوال اٹھاتی ہے نیز یہ رہنمائی فراہم کرتی ہے کہ مصنفین کو کس کس طریقے سے صدمآتی کیفیات کو بیان کرنے پر قدرت حاصل کرنی چاہیے۔ ٹرومے کو ادب میں ادبی طریقے سے جانچتے ہوئے ٹراما تھیوری انسانی مصائب کی پیچیدگیوں اور ناقابل بیان کیفیات کو سمجھنے ،بیان کرنے اور تفہیم کرنے کے لیے ایک بصیرت عطا کرتی ہے۔

ایک نظریے یا تصور کے طور پر ٹرامانے ادبی مطالعے میں بہت دلچسپی پیدا کی ہے۔ ادب کے نفسیاتی تجربے کے لیے ٹراما تھیوری ایک ایسی تنقیدی اپروچ کو وضع کرتی ہے جو نئے تفہمی طریقوں کو استعمال کر کے ادب کو پڑھنے اور سمجھنے پر قدرت عطا کرتی ہے۔ ٹراما تھیوری کا ادب میں تصور دور جدید کا وہ مفید تصور ہے جو انفرادی سطح سے لے کر قومی اور ثقافتی سطح پر لاگو کیا جا سکتا ہے۔ حالیہ دہایئوں میں ٹراما کے نظریات نے ادبی تنقید کے اندر نئے نقطہ نظر کو فروغ دیا ہے ایک یورپی ماہر نفسیات کے بقول

> "Trauma theory offers an overview of Genesis and growth of literary trauma theory, recording the evolution of the concept of trauma in relation to literary studies"[17]

ادب میں ٹراما تھیوری کا مطالعہ پہلی بار باقاعدہ طور پر 1990 میں شروع ہوا۔ اور اس سے فرائیڈ کے دیے گئے ٹراما کے ماڈل سے جوڑا گیا۔ اس کی بنیاد اس ماڈل پر رکھی گئی جو سیگمنڈ فرائیڈ نے ترتیب دیا تھا۔ یہ ماڈل کسی بھی انسان کے کسی حادثے کے بعد تجربے اور زبان کے بیان کے ساتھ ساتھ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کسی بھی حادثے سے ملنے والی تکلیف ناقابل بیان ہے اور یہ بات بنیادی طور پر کسی حادثے ہی کا ردعمل ہوتی ہے کہ کوئی فرد ذہنی طور پر اتنا متاثر ہو جآئے کہ وہ کچھ بیان ہی نہ کر پآئے۔ کیتھی کروچ نے ٹراما کو ایک ساختی رجحان کے طور پر بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق ٹراما کو اس کے عمومی معنوں میں اچانک یا تباہ کن واقعات کے زبردست تجربے کی وضاحت کے طور پر سمجھا جاتا ہے جس میں واقعے کے لیے ردعمل اکثر تاخیر کا شکار ہوتا ہے اور بے قابو ہوتا ہے بقول نصراللہ مبول

> A flood of scholarship in the 1990s arose to examine the concept of trauma and its role in literature and society most prominently by Cathy crouth. This first wave of criticism

popularized the concept of trauma as an unrepresentable event that revealed the inherent contradictions within language and experience.[18]

بہر حال ٹراما کی روایت کا ادب میں اختیار کرنا انسانی نفسیات کی تفہیم کے لیے نہایت موضوع ثابت ہوا۔

ز۔ انسانی زندگی اور جنگوں کے اثرات

کرہ ارض پر انسان کی آبادی کے ساتھ ہی انسان کو جہاں بے شمار قدرتی افات سے نبرد ازما رہنا پڑا وہیں خود اپنی پیدا کردہ تکالیف نے بھی انسان اور انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو متاثر کیا ہے۔جنگ ہمیشہ پوری انسانی تاریخ میں ایک تلخ حقیقت کے طور پر موجود رہی ہے۔ انسانی زندگی پر اس کے اثرات فوری ،طویل مدتی اور کثیر جہتی ہوتے ہیں۔ جنگیں بڑے پیمانے پر افراد،خاندانوں ملکوں اور معاشروں کو تباہ کرتی ہیں۔انسان نے جب بھی اپنے حق سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کی تو یہی انسانی کوشش پوری دنیا میں افرا تفری کی ایک سیریز کو جنم دیتی رہی ہے۔ ہزاروں انسان اس کے نتیجے میں مارے جاتے ہیں اور ہزاروں بے گھر ہو جاتے ہیں۔ ہزاروں بل کہ لاکھوں بچ جانے والے افراد اپنی زندگی میں جنگ کی تباہ کاریوں کے اثرات کو سہتے رہتے ہیں۔

انسان نے جب سے متمدن تہذیب میں قدم رکھا ہے تو زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش جاری رکھی۔ انہی کوششوں کے درمیان جنگیں بھی انسانی سماج کا ایک نہایت تباہ کن مگر لازمی جز رہی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک نفسیات دان کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"Human beings specially men are inherently violent"[19]

جنگ کم از کم دو گروہوں یا قوموں کے درمیان تصادم کی وہ صورت حال ہوتی ہے جس میں فریقین ایک دوسرے کو زیر کر کے اپنے مفادات وغیرہ کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ مفادات معاشی ،معاشرتی،سیاسی یا مذہبی ہوسکتے ہیں۔ بعض اوقات محض اپنی بالادستی قائم کرنے کے لیے بھی کسی گروہ یا ملک کو جنگ کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ تاریخ میں پہلے تاج برطانیہ کا نوآبادیاتی نظام اور آج کے دور میں امریکہ کی مختلف حیلے بہانوں سے مسلمان ملکوں پر جنگ کا مسلط کرنا اسی بالادستی کے قیام کی کوششیں ہیں۔

قدرت اور فطرت سے نبرد ازما رہنے والا انسان تھوڑا متمدن ہوا تو اس کا تصادم فطرت سے زیادہ اپس میں شروع ہوا۔ انسانی تاریخ میں ہزاروں جنگوں کی کہانیاں موجود ہیں جن میں ایک ہی وقت میں لاکھوں لوگوں کو تہ تیغ کر کے رکھ دیا گیا اور بچ جانے والوں کے ساتھ نہایت غیر انسانی سلوک روا رکھا گیا۔ ایک اور اہم نکتہ جو یہاں سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جنگ کا جو عمومی تصور ہمارے ذہنوں میں موجود ہے، جنگ دراصل اس سے الگ ایک اور مفہوم بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔ جنگ کسی ایک ملک کے اندر دو گروہوں کے تصادم کو بھی کہا جا سکتا ہے، دو معاشی نظاموں کے درمیان ٹکراؤ کو جنگ کا نام دیا جاتا ہے کیوں کہ اس ٹکراؤ کے بھی وہی نتائج سامنے آتے ہیں جو دو متحارب گروہوں کے مسلح تصادم کے سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر قاسم یعقوب اپنی کتاب "اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات" میں لکھتے ہیں

> "جنگ محض مختلف قوموں کے درمیان متصادم تصور کا نام نہیں بل کہ ایک ہی ملک میں برسرپیکار گروہ بھی اسی تصور کے ماتحت ہیں۔"[20]

دور جدید میں قوموں کو یا ملکوں کو اپنی بقا کے لیے نئے قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ آج کے انسان کو جہاں اپنی بقا کے لیے دوسروں پر زیادہ انحصار کرنا پڑ رہا ہے وہی اسے اپنی بقایا کے لیے دوسروں کے ساتھ زیادہ سنگین تصادم کو بھی اختیار کرنا پڑ جاتا ہے۔ دنیا کے گلوبل ویلج کے تصور نے ساری دنیا کو ایک منڈی میں تبدیل کر دیا ہے۔ مختلف ممالک اپنی تجارت کے پھیلاؤ کے لیے دنیا بھر کے ممالک سے رابطے رکھتے ہیں۔ بڑی طاقتوں کو اپنے مالِ تجارت کی فروخت کے لیے اپس میں سخت مقابلے کی صورت حال کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے لہذا یہ طاقتیں آئے روز اپنے معاشی اور تجارتی مفاد کی خاطر ٹکر آتی رہتی ہیں۔ نئی منڈیوں کی تلاش ،قدرتی وسائل کی تلاش اور اسان تجارتی راستوں پر قبضہ آج کے دور کے اہم ترین مسائل ہیں جو جنگوں کو جنم دیتے ہیں۔ امریکہ روس ،چین اور دیگر ممالک کے اپس کے جھگڑے آج محض اس لیے ہیں کہ یہ ایک دوسرے سے ہر طرح کی مسابقت کے لیے کوشاں ہیں۔ اگر ہم معاشی نظاموں کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو بنیادی طور پر ہمیں دو نظاموں سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام معیشت کی کش مکش نظر آئے گی۔ یعنی مارکسی نظریہ اور سرمایہ دارانہ نظریہ اپس میں متصادم ہیں اور اپنی بقا کی خاطر آئے روز مختلف صورتوں میں ٹکر آتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر قاسم یعقوب ایک ماہر برنل ٹمل کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"War as a weapon in the competitive struggle between capitalist countries for the area of non-capitalist civilization.[21]

بہر حال جنگ کی وجہ کچھ بھی ہو مگر یہ انسان کے معاشرے کا ایک لازمی حصہ رہی ہے۔ اگر چہ ہر دور میں جنگ و جدل کو ناپسندیدہ عمل تصور کیا جاتا رہا ہے مگر انسان اس کے باوجود اس سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکا۔ مہابھارت، رمائن، بابل کی سلطنت کے جنگی قصے ہوں یا فارس اور روم کے تصادم، مغرب میں بادشاہت اور پاپائیت کے جھگڑے، ان تصادم نے انسانی سماج، سوچ، فکر اور طرز زندگی کو بے حد متاثر کیا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد دوسرے کو زیر کرنا غلام بنانا اور اپنے ذاتی مفاد کو محفوظ کرنا بھی رہا ہے۔

جمیل جالبی اپنی کتاب تاریخ اردو ادب میں ایک مفکر کلاسوئز کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"ہم جنگ کے کسی ایسی مشکل اور دقیق مفہوم میں الجھنا نہیں چاہتے جو ہمارے دانشوروں کے ہاں رائج ہے۔ ہم اس کے سیدھے سادے عملی معنی لیں گے کہ جنگ ایک قسم کی گتھم گتھا کشتی ہے۔ جنگ در حقیقت وسیع پیمانے پر لڑی جانے والی کئی با قاعدہ کشتیوں یا مبارزتوں کا دوسرا نام ہے۔ ہر فریق اپنی طاقت کے زور سے یہی کوشش کرے گا کہ اپنے مد مقابل کو اس طرح سے مجبور کرے کہ وہ اس کے سامنے ہار جائے۔ ہر ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش کرے گا تا کہ وہ اس طرح سے شانہ چت گرے کہ اس سے اس کی مزاحمت کی قوت بالکل ختم ہو جائے۔ جنگ ایک ایسی تشدد امیز کاروائی ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مد مقابل یعنی دشمن کو اس طرح مجبور کیا جائے کہ وہ ہمارے ارادوں کا غلام بن جائے"[22]

جنگی اسباب میں قدیم زمانے سے مذہب کو بھی اہم حیثیت حاصل رہی ہے۔ قدیم جنگوں کا محرک مذہب رہا ہے اور اس مذہب کی بنیاد پر انسانوں میں بڑی خون ریز جنگیں ہوتی رہی ہے۔ حق پرستوں اور باطل کے درمیان مذہب کی بنیاد پر ایک مستقل تنازعہ موجود رہا ہے بقول اقبال

"ستیزہ کار رہا ہے ازل تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی"[23]

اب یہ خیر و شر کا ٹکراؤ بھی جنگوں کا ایک اہم وسیلہ رہا ہے۔ قدیم بنی اسرائیلی روایات کو دیکھیں یا عرب کی تاریخ، اسلام سے قبل کا زمانہ ہو یا بعد کا، مذہب نے جنگ کے لیے ساز گار حالات مہیا کیے ہیں۔ اپنے مذہب کی بالادستی ان جنگوں کا اہم ترین مقصد رہا ہے۔

بقول قاسم یعقوب

> "جب ہم مذہب اور جنگ کی بات کرتے ہیں تو ہمارے سامنے جنگ کرنے والے دونوں یا زیادہ گروہوں کے مقاصد میں اولین مقصد مذہب کی بالادستی یا بقا ہوتی ہے۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان طویل صلیبی جنگوں کے محرکات میں مذہب ایک مرکزی مقصد بن کے سامنے نظر آتا ہے[24]"

اب اگر دورِ جدید میں دیکھا جائے تو بہر حال مذہب کی بنیاد پر جنگ کے اثار کم نظر آتے ہیں کیوں کہ اس دور کا سب سے بڑا مسئلہ معاشی اور سیاسی استحکام ہے۔ آج کے دور میں جنگوں کی وجہ معاشی، سیاسی اور تجارتی کش مکش کو سمجھا جاتا ہے۔ تمام جنگوں کے پروگرامات کو اقتصادیات کے اصولوں پر مرتب کیا جارہا ہے لہذا مذہب کے بعد جنگ کا دوسرا اہم محرک سماجی ضروریات کی تکمیل ہو سکتا ہے اور یہ سماجی ضروریات وہی ہیں جن کا اوپر ذکر کیا جاچکا ہے۔ جنگوں کے حوالے سے ڈیٹا جمع کرنے والی ایک ویب سائٹ کے مطابق

> "بیسویں صدی میں تقریباً ڈیڑھ سو سے زیادہ چھوٹی بڑی جنگیں لڑی گئیں جن میں ایک سروے کے مطابق 258 ملین انسان ہلاک ہوئے جنگوں کے اعداد و شمار رکھنے والی ویب سائٹ کے مطابق بیسویں صدی میں تمام انسانوں میں سے ہر چھٹا انسان جنگ کی وجہ سے موت کی وادی میں چلا گیا"[25]

پہلی جنگ عظیم میں 8.4 ملین فوجی اور پانچ ملین عام شہری ہلاک ہوئے جب کہ دوسری جنگ عظیم کے اندر 17 ملین فوجی اور 34 ملین عام شہریوں کی زندگی کا خاتمہ ہوا۔ جدید جنگوں کی بات کی جآئے تو ان جنگوں میں مارے جانے والے افراد کی اکثریت عام شہریوں کی ہے۔ جنگی جنون کے ایک اور اہم نقصان جو کیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان ایک دوسرے کو مارنے کے لیے جس طرح سے اپنے وسائل محنت اور وقت کو استعمال کرتا ہے اس کی مثال نہیں ملتی، جنگی جنون کے انسانوں کو درج ذیل طریقوں سے نقصان پہنچے ہیں۔ وسائل کا بڑا حصہ جنگوں کی نظر ہوا۔ انسان کی تحقیق اور علم کا فائدہ ہونے کی بجآئے انسانوں کو نقصان ہوا۔ مہلک ترین

ہتھیار وجود میں آئے جو کہ پوری دنیا کے لیے شدید ترین خطرہ ہیں۔ انسانی فلاح و بہبود کی بجآئے ممالک میں جدید اسلحے کے حصول کی دوڑ نے غربت، افلاس اور لاچارگی کو جنم دیا۔

لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ جنگ ہر لحاظ سے انسانوں سے قربانی کی متقاضی رہی ہے اور انسانوں نے یہ قربانیاں بے حساب دی ہیں۔

و۔ جنگ کے نتائج یا اثرات :

جیسے کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جنگ انسانی معاشرت کو روز اول ہی سے اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے اور اس کے بے تحاشہ اثرات انسانی سماج، نفسیات اور کردار پر مرتب ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

i۔ نفسیاتی اثرات:

جنگوں کے اثرات میں سے اگر کسی اثر کو سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے تو وہ کسی فرد پر اس کا نفسیاتی اثر ہو سکتا ہے۔ جنگ کے نتیجے میں مارے جانے والے انسان تو اپنی زندگی ہار جاتے ہیں مگر بچ جانے والے جس دکھ، تکلیف، کرب اور اذیت سے گزرتے ہیں اس کا حساب ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ کسی پُر تشدد واقعے کا مشاہدہ کرنا، کسی صدمے کا سامنا کرنا، کسی تکلیف دہ صورت حال کا سامنا کرنا، انسان کے نفسیاتی نظام کو شدید طریقے سے متاثر کرتا ہے۔ جنگ کے اندر یا جنگ کے بعد لوگ مسلسل ڈپریشن، مسلسل خوف اور جان انگیز صورت حال کا سامنا کرتے ہیں اور یہی چیز ان کی دماغی صحت کو بری طرح متاثر کرتی ہے۔ چڑچڑا پن، شناخت کا کھو جانا عدم تحفظ کا شکار ہونا وغیرہ جیسے مضر اثرات، بچ جانے والے افراد کے اندر جنم لیتے ہیں۔ یعنی جنگ نہ صرف انسانوں کو موت کے گھاٹ آتار دیتی ہے بل کہ زندہ بچ جانے والوں کو بھی اس قدر ناکارہ بنا دیتی ہے کہ خود ان کے لیے اپنی زندگی ایک بوجھ بن کر رہ جاتی ہے۔ ایک مسلسل نفسیاتی کش مکش متاثرہ فرد کے قریبی لوگوں کو بھی نفسیاتی عارضوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ یہ افراد عام لوگوں میں سے بھی ہو سکتے ہیں اور فوج کے بچ جانے والے فوجیوں میں سے بھی ہو سکتے ہیں۔ جنگ اور مینٹل ہیلتھ پر مرتبہ اپنی کتاب

"Hall to forget the long-lasting impact of war on mental health"

میں میسی ملیانو برات کہتے ہیں

"Researchers have estimated the casual effect of war exposure on soldier's mental health .Their findings suggest that development to combat zones ,exposures to enemy fire and to dead , dying or wounded people ,generally cause a decrease in mental health status and raise the risk of suffering from Post turmeric stress disorder."[26]

ایک جنگ کی تباہ کاریوں کو اپنی انکھوں سے دیکھنے والا انسان بھلے وہ فوجی ہو یا عام انسان ہر صورت میں ذہنی طور پر تناؤ کا شکار ہوتا ہے اور اگر یہ صورت حال مزید بگڑ جآئے تو یہ ٹراما کی پیچیدہ ترین صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

ii۔ جسمانی اثرات یا نقصانات

کسی بھی جنگ کا پہلا فوری اور براہ راست اثر تو انسانی جانوں کا ضیاع ہے۔ فوجی، عام شہری، خواتین، مرد، بچے، بوڑھے وغیرہ دورانِ جنگ مارے جاتے ہیں اور نسلوں کی نسلیں جنگی جنون کی بیچ چڑھ جاتی ہیں۔ آج تک کی جنگوں میں لاکھوں، کروڑوں لوگ لقمہ آجل بنے اور تہ خاک چلے گئے۔ بعض اوقات انسان کی بڑے پیمانے پر اموات ایک بہت بڑے خلا کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ بے شمار بل کہ ان گنت لوگوں کو دفن ہونا بھی نصیب نہیں ہوتا، وہ ایسے ہی کھلے میدانوں میں جنگلوں میں یا کسی بھی جگہ گل سڑ کر فنا ہو جاتے ہیں۔ خطرناک ترین بم، کیمیائی اور حیاتیاتی حملے، انسانوں کی بستیوں کو آجاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ مثلاً ہم اگر جنگ عظیم اول میں مختلف ممالک میں مارے جانے والے افراد کا گوشوارہ پیش کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ جنگ کا ایندھن صرف انسان ہی ہوا کرتے ہیں۔ جنگ عظیم اول کے حالات وواقعات پر تحقیق کرنے والے محقق سید فضل اللہ نے اپنی کتاب میں جو گوشوارہ پیش کیا ہے اس کی تفصیل یوں ہے

"جنگ عظیم دوم میں چند ملکوں میں مارے جانے والے افراد کا گوشوارہ

امریکا	10974
برطانیہ	8,39,904
جرمنی	19،9735
فرانس	154550

آسٹریا	1132500
روس	272 000,[27]"

یہ اعداد و شمار چند بڑے ممالک کے ہیں جب کہ ہلاکتوں کا دائرہ تقریبا ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ صرف بیسویں صدی میں ڈیڑھ سو سے زیادہ جنگوں میں 258 ملین انسان ہلاک ہوئے ہیں۔یورپ میں تو مرد و خواتین کا تناسب اس قدر بگڑ گیا تھا کہ ڈھونڈنے سے بھی مرد نہیں ملا کرتا تھا۔ہزاروں لاکھوں افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی جنگ کے نتیجے میں معذور ہو کر اپنی زندگی نہایت ذلت سے بسر کرتے ہیں۔

iii۔ نقل مکانی اور ہجرت

جنگ کی لپیٹ میں انے والے علاقوں کے مکین مجبور ہوتے ہیں کہ وہ کسی محفوظ مقام پر منتقل ہو جائیں تاکہ ان کی جان مال اور عزت ابرو محفوظ رہ سکے۔تاریخ بھری پڑی ہے کہ جنگوں نے لاکھوں افراد کو اپنے گھر بار، جائیداد، کاروبار چھوڑ کر بہت قابل رحم حالت میں دوسرے محفوظ علاقوں میں ہجرت کرنے پر مجبور کیا اور پناہ گزین کیمپوں میں بہت ابتر حالت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔ہجرت کا یہ عمل جہاں اپنے اپ میں ایک اعصاب شکن مرحلہ ہوتا ہے وہی اپنے علاقے ،وطن اور ثقافت سے جدائی بھی لوگوں کے لیے ایک ٹروما سے کم نہیں ہوتی۔پناہ گزین کیمپوں میں جن مسائل کا سامنا ان لوگوں کو کرنا پڑتا ہے وہ بھی ناقابل بیان ہیں۔روس کے افغانستان پر حملے کی وجہ سے 28 سے 30 لاکھ افغان مہاجر سرزمین پاکستان آئے۔یہ تاریخ کی ایک بہت بڑی ہجرت تھی جس میں لاکھوں لوگ ایک بہت بڑے المیہ سے دوچار ہوئے۔خود پاکستان کے لیے بھی اتنی تعداد میں ہجرت کر کے انے والے افراد کے لیے کوئی مناسب انتظام موجود نہ تھا اسی لیے پاکستان کے اندر بھی وہ شدید بد انتظامی کے حالات پیدا ہوئے جو آج تک قابو میں انے کا نام نہیں لے رہے ہیں۔نائن الیون کے بعد امریکہ کا افغانستان پر حملہ اور پاکستان کے قبائلی علاقوں میں دہشت گردی کے فروغ نے لاکھوں افراد کو اپنے گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا۔پاکستان کی سکیورٹی فورسز کا وزیرستان اور دیگر ایجنسیز میں دہشت گردی کے خلاف اپریشن شروع ہوا تو ملک کے اندر بھی ان علاقوں سے بڑی تعداد میں ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک بڑی تعداد میں انسانوں کو سنگین ترین حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

iv۔ معاشی ابتری

جنگ کے معاشی اثرات دور رس اور دیر پا ہوتے ہیں۔ انفراسٹرکچر تباہ، کاروبار بند، زرخیز زمینیں بنجر ہو جاتی ہیں۔ فوجی اخراجات کی طرف وسائل کا رخ کر دینے کی وجہ سے عوامی سطح پر شدید معاشی اور مالی بحران پیدا ہو جاتا ہے۔ رفعہ عامہ کے تمام کام ٹھپ ہو جاتے ہیں اور فلاح و بہبود کے تمام پروگرام بند کرنے پڑ جاتے ہیں۔ یہ معاشی ابتری جہاں ملک کو عدم استحکام کا شکار کرتی ہے وہی لوگوں میں غربت افلاس بھوک ننگ اور پیاس کو فروغ دیتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجا یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں صحت کے بھی شدید مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ معاشی اور مالی بحران انسانوں کو سالوں تک اپنے خونی پنجوں میں دبوچے رکھتا ہے۔ افغانستان کے خلاف جنگ میں روس کی معاشی صورت حال کے ابتر ہونے نے اس کو بے شمار ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور جس کے اثرات آج بھی اس خطے میں پوری طرح دیکھے جاسکتے ہیں۔

V۔ صحت، تعلیم اور سماجی مسائل

جنگ زدہ علاقوں میں مسائل ایسے رخ ایسے رخ کرتے ہیں جیسے بادلوں سے بارش کے قطروں کا زمین کی طرف رخ۔ ان علاقوں میں ہر طرح کی ابتری رقص کرتی ہے مال و منال ختم ہو جاتے ہیں، غربت منڈلانے لگتی ہے۔ ہسپتال ختم ہو جاتے ہیں، صحت عامہ کے وسائل تباہ ہو جاتے ہیں اور تعلیمی ادارے اپنا درس و تدریس کا کام روک دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سماجی لحاظ سے ایک مکمل تباہ اور منتشر معاشرہ وجود میں آتا ہے جس کی نہ کوئی منزل ہوتی ہے اور نہ کوئی ٹھکانہ۔ اعتماد اور ہم اہنگی کا فقدان ہو جاتا ہے، سماجی بندھن ٹوٹ جاتے ہیں، لوگ مذہبی، نسلی اور نظریاتی تقسیم کا شکار ہو کر مزید ناکامیوں کی طرف چلے جاتے ہیں۔ انتقام کی اگ بھڑک اٹھتی ہے اور سارے نظام کو مکمل طور پر برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔ لایعنی قسم کا معاشرہ وجود میں آتا ہے جس میں اصلاحِ کار کی کوششیں عموما اس لیے ناکام ہو جاتی ہیں کہ یہاں کے لوگ شدید عدم اعتمادی کا شکار ہوتے ہیں، مشتعل ہوتے ہیں، انہیں معاشی، تعلیمی اور دیگر لحاظ سے شدید صدمے پہنچے ہوتے ہیں۔ لہذا ایک وسیع ترین معاشرتی المیہ یا ٹراما وجود میں آتا ہے جس کی بہتری کے لیے ایک طویل عرصے تک پوری جاں فشانی کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

vi ۔ اخلاقی اور ماحولیاتی تباہی

وسیع پیمانے پر مہلک ہتھیاروں اور گولا بارود کے استعمال سے صرف انسان اور انسانی سماج ہی متاثر نہیں ہوتے بل کہ اس سے ماحولیاتی شکست و ریخت بھی ہوتی ہے۔ جنگلوں کے جنگل تباہ کر دیے جاتے ہیں ۔پانی کے اکثر ذرائع الودہ ہو جاتے ہیں، کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیاروں کا استعمال تمام تر بنیادی ڈھانچے کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ جنگلی حیات تک ان جنگوں کی لپیٹ میں آتی ہے۔یعنی فطرت کا سارے کا سارا نظام بکھر کر رہ جاتا ہے۔بارودی سرنگوں کے بچھانے سے زرعی زمینوں کا نقصان ہوتا ہے اور زندگی کے لیے بھی یہ جان لیوا ثابت ہوتی ہیں۔ ایک ایسا ماحول پیدا ہو جاتا ہے جو ماحول دوست نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ جنگ زدہ علاقوں میں جرائم کی شرح بڑھ جاتی ہے، صنفی عدم توازن کی وجہ سے عورتوں کو طرح طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، دہشت گردی، چوری چکاری، عصمت دری، املاک پر قبضہ وغیرہ جیسی اخلاقی بیماریاں بھی جنگ کے وجہ سے نمودار ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں جنگ کسی بھی علاقے کے ثقافتی اور تہذیبی ورثے کو بری طرح مسخ کر دیتی ہے جس کا ازالہ کبھی ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔ الغرض انسانی زندگی پر جنگوں کے اثرات ہمہ گیر اور عالمگیر ہوتے ہیں جو نسل در نسل چلتے رہتے ہیں۔ زندہ بچ جانے والوں کے نفسیاتی صدموں سے لے کر تنازعات کی وجہ سے ہونے والی معاشی تباہی تک جنگ ہر چیز کو تباہ کر دیتی ہے۔

ح۔ وار ٹراما اور اس کے اثرات، پوسٹ ٹرومیٹک سٹرس ڈس آرڈر

اقوام کے درمیان جنگیں معمول ہیں اور ان کے اثرات فوجیوں اور عام لوگوں پر پڑتے رہتے ہیں۔ بہت شروع ہی سے جنگوں کے نتیجے میں تکلیف دہ صورت حال کا سامنا کرنا، نقل مکانی کرنا، قتل وغارت گری کا مشاہدہ کرنا، انسانوں کے لیے ایک معمول رہا ہے۔جنگ اور اس کے تشدد کے نتیجے میں جو جذباتی اور ذہنی نفسیاتی ہیجان اور حالات پیدا ہوتے ہیں ان کو جنگی صدمے یعنی وار ٹراما کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ممکنہ تو طور پر جنگی صدمے کے کسی بھی متاثر فرد پر ذہنی اور نفسیاتی لحاظ سے صحت پر طویل مدتی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ وار ٹراما تھیوری میں فرد اور معاشرے پر جنگوں کے تباہ کن اثرات کو بیان کیا جاتا ہے۔ یہ تھیوری اس صورت حال کا احاطہ کرتی ہے جو انسانوں کو کسی شدید صدمآتی حادثے یعنی جنگ کے دوران یا بعد میں محسوس ہوئی ہو۔

جنگوں کے اثرات ہر عمر کے فرد پر یکساں مرتب ہوتے ہیں۔ بچے، بڑے، جوان، بوڑھے مرد اور خواتین، سب اس کی لپیٹ میں آتے ہیں۔ وہ تنظیمیں جو جنگی علاقوں میں مددگار کے طور پر کام کر رہی ہوتی ہیں، ان کے ارکان بھی ان جنگی تباہ کاریوں کی وجہ سے نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو کر کسی تناؤ کی کیفیت میں چلے جاتے ہیں۔ بچوں پر عموماً جنگی حالات کے اثرات زیادہ مرتب ہو سکتے ہیں۔ وار ٹراما تھیوری میں انہی تمام احوال وافعال کا جائزہ لیا جاتا ہے جو دورانِ جنگ یا مابعد جنگ افراد کو جھیلنے پڑتے ہیں۔

i- پوسٹ ٹرامیٹک سٹریس ڈس آرڈر.

جنگی اثرات میں سب سے زیادہ جس نقطے کو بیان کیا جاتا ہے یا پڑھا، لکھا اور سمجھا جاتا ہے وہ پوسٹ ٹرامیٹک سٹریس ڈس ارڈر ہے۔ پوسٹ ٹرومیٹک اسٹریس ڈس ارڈر کا تجربہ کرنے والے افراد اپنے اندر شدید اضطراب اور بے چینی محسوس کرتے ہیں۔ کسی شدید واقعے کی بازگشت کو مسلسل محسوس کرتے رہنا، پُرانی یادوں کے اندر ہی گم رہنا، فلیش بیک کا شکار ہونا، ڈراونے خوابوں کا شکار ہونا، خوفزدہ رہنا وغیرہ جیسی کیفیات ایسی علامتیں ہیں جن کو پی ٹی ایس ڈی کی ذیل میں گنا جا سکتا ہے۔ ایسی علامات کو محسوس کرنے والا انسان اپنے روزمرہ کے معمولات اور زندگی کے اعمال اور افعال سرانجام دینے میں شدید طور پر ناکامی محسوس کرتا ہے ۔یعنی وہ ایک نارمل زندگی سے دور اپنے شب و روز بسر کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور مسلسل ایک تکلیف میں مبتلا رہتا ہے۔ ایک امریکی ماہر نفسیات فورڈ، جی ڈی اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں

> "An untreated postromantic stress disorder can lost until the end of life and result in a permanent change of personality .Moreover self-aggressive or aggressive actions can be the consequences of war Trauma and post-traumatic stress disorder." [28]

ii۔ شدید ذہنی تناؤ

جنگ زدہ علاقوں میں انسانوں کو فوراً جس صدمے کا شکار ہونا پڑتا ہے وہ شدید تناؤ (اے ایس ڈی) کی کیفیت ہے۔ کسی الم ناک حادثے کو دیکھنا یا اس سے گزرنا ایک فرد کو حادثے کے فوراً بعد ہی چند دنوں تک یا تقریباً ایک ماہ تک مسلسل شدید پریشان رکھ سکتا ہے۔ اس دوران انسان ذہنی ناسودگی کا شکار رہتا ہے اور ایک

اضطراری کیفیت میں مبتلا ہو کر بے چینی کا سامنا کرتا ہے۔ دراصل یہ وہ پہلی اور ابتدائی علامات ہوتی ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ جنگ کی وجہ سے کوئی فرد متاثر ہوا ہے۔ اے ایس ڈی کو ایک فرد اپنی قوت ارادی اور اپنے معالج کے مشورے سے کم کر کے تندرست ہو سکتا ہے۔ مگر اس کو ایسے ہی چھوڑ دیا جاآئے اور اسے مزید پلنے کا موقع دیا جاآئے تو یہ مکمل طور پر پوسٹ ٹرومیٹک سٹریس ڈس ارڈر میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ لہذا ایسے فرد جو جنگی ہولناکیوں کی وجہ سے ذہنی تناؤ کا شکار ہوں، ان کو فورا کسی پُر سکون ماحول اور احساس کا دینے کا بندوبست کیا جانا چاہیے۔

iii۔ نفسیاتی اور اخلاقی دباؤ

ڈپریشن، ذہنی صدمہ یا نفسیاتی الجھن وار ٹراما کا ایک عمومی نتیجا ہے۔ وہ فوجی جو زبردستی جنگ میں جھونک دیے گئے ہوں اور جن کو مجبور کیا جاآئے کہ وہ ظالمانہ اسلحے سے مخالف فوج یا عام لوگوں کو کچلیں تو ایسے فوجیوں کے اندر ایک اخلاقی کش مکش چلنا شروع ہو جاتی ہے، ان کا ضمیر ان غیر انسانی سانحوں پر مسلسل پریشانی کا شکار ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جلد ہی ذہنی طور پر ایک اداس کیفیت کا سامنا کرتے ہیں اور دباؤ کو برداشت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ذہنی دباؤ میں انے کی وجہ سے جہاں وہ اخلاقی طور پر اپنے اپ کو مجرم تصور کرتے ہیں وہی ناامیدی، مایوسی، اداسی اور بے حسی جیسے غیر فعال جذبوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ کیفیت بھی ان کو روزمرہ کے معمولات سرانجام دینے سے روکتی ہے۔ شدید اضطراب، گھبراہٹ، فوبیا، پریشانی، دھڑکن کا تیز ہو جانا، پسینہ اناوغیرہ جیسی علامات بھی جنگی صدمے کے اثرات کا نتیجا ہوتی ہیں۔ پوسٹ ٹرومیٹک سٹریس ڈس ارڈر کے ہونے کی وجہ لڑائی میں براہ راست حصہ لینا، شدید چوٹ اناوغیرہ ہو سکتے ہیں۔ پھر بموں کے حملے، ان کی اوازیں، دشمن فوج کا آبادیوں میں داخل ہونے کا خوف، اپنے پیاروں کو اپنی انکھوں کے سامنے مرتے دیکھنا، زخمی ہوناوغیرہ انسان کو شدید جذباتی یا نفسیاتی طور پر متاثر کر کے ناکارہ بنا دیتے ہیں۔ ادب میں واؤ ٹراما تھیوری کا مقصد ٹراما کے عناصر کی نشاندہی کرنا ہے اور جنگوں کے اثرات کے منفی نتائج کو سامنے لانا ہوتا ہے۔ نقاد کوشش کرتے ہیں کہ وہ ادب میں تخلیق شدہ ان کرداروں کا جائزہ پیش کریں جو مصنف نے جنگی حالات اور ان کی تباہ کاریوں کے تناظر میں تخلیق کیے ہوں۔ کوئی بھی ادیب جب کسی جنگ اور اس کی ہولناکیوں کا ذکر اپنی کسی کہانی، ناول یا افسانے میں کرتا ہے تو دراصل اس کے دو اہم مقاصد ہو سکتے ہیں۔

1۔ یہ کہ وہ جنگوں کو ادب کے ذریعے عوام میں متعارف کروآئے اور انسانوں کو اخذ کروآئے کہ جنگ کس قدر سنگین اثرات رکھتی ہے۔

2۔ یہ کہ ٹراما کے شکار کرداروں کے ذریعے ادب میں ٹراما کی پیش کش اور اس کی کیفیات کو بیان کر سکے اور متعارف کرا سکے۔ ادب میں ٹراما تھیوری کا تعین ٹرومے اور پوسٹ ٹرومیٹک سٹریس ڈس ارڈر کے کرداروں سے ہوتا ہے۔ اس کے علاج اور میڈیکلی مدد کا دائرہ ادب میں ٹراما تھیوری کے اختیار میں نہیں آتا۔ ہاں اس سے بچنے کے طریقے ضرور بتائے جاسکتے ہیں۔

ط۔ مابعد نائن الیون مختصر عالمی ادبی منظر نامہ (بحوالہ ناول)

i۔ عالمی پس منظر

جنگِ عظیم اول اور دوم سے لے کر تاحال جتنی بھی جنگیں ہوئیں ان میں سے اکثر جنگیں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر اقوام کے درمیان ہوئیں۔ دنیا کی سپر پاور طاقتوں نے کمزور ممالک پر اپنا تسلط جمانے کی خاطر ان پر جنگیں مسلط کیں اور اس کے ذریعے اپنی دھاک بٹھائی۔ کمزور قوموں نے اپنے دفاع ہتھیار اٹھائے اور یوں وہ معاشی اور سماجی سطح پر مزید پست ہو گئیں۔ طاقتور ملک جنگوں کی وجوہات گھڑنے کی تاک میں رہے اور کمزور ملکوں پر چڑھائی کی کسی نہ کسی وجہ کا حصول ممکن بناتے رہے۔ پوری دنیا میں جاری اس استعماری ماحول کا تشدد آغازِ تاریخ سے آج تک انسان سہتا آیا ہے۔ ماضی میں اس کی شکلیں اور تھیں جبکہ آج یہ مختلف صورتوں میں سامنے آیا ہے۔ جنگ و جدل کی یہ تمام شکلیں کسی نہ کسی طرح عالمی طاقتوں کے حصول اقتدار کی پالیسی سے جڑی ہوئی ہیں۔ موجودہ عالمی منظر نامے پر ہر صورت بیسویں صدی کی ان تمام تحریکات اور جنگوں کے اثرات ہیں جو حصول اقتدار اور استعمار کی وسعت کے لیے لڑی گئیں۔

جدید تاریخ میں دوسری جنگ عظیم کے بعد عالمی منظر نامے میں ایک زبردست انقلاب آیا۔ اس جنگ کے بعد امریکہ ایک نئی سپر پاور کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ امریکی تاریخ پر نظر ڈالیں تو امریکہ نے ۱۹۴۵ کے بعد پانچ بڑی جنگیں لڑیں۔ ان جنگوں میں امریکہ کے مدمقابل کوریا، ویت نام، خلیجی جنگ، عراق اور افغانستان شامل ہیں۔ اس کے علاوہ صومالیہ، یمن اور لیبیا کے خلاف چند معمولی جنگیں بھی امریکی عسکری تاریخ کا حصہ ہیں۔

بیسوی صدی کے اہم واقعات میں اسرائیل کا فلسطین پر قبضہ اور اس کے نتیجے میں ہونے والی عرب اسرائیل جنگیں ہیں۔ بیسویں صدی میں عرب اسرائیل کے درمیان پانچ جنگیں ہوئیں جنھوں نے اس صدی کے پورے عالمی منظر نامے پر اپنے نقوش مرتب کئے۔

روس افغان جنگ نے بھی بیسویں صدی میں امریکہ کو پنپنے کا ایک اہم موقع دیا۔ اشتراکی ریاست روس نے افغانستان پر حملہ کیا۔ روس نے دسمبر ۱۹۷۹ میں اپنی تیس ہزار افواج کے ساتھ افغانستان پر حملہ کیا۔ روسی حملے کے بعد ۱۹۸۲ میں تقریباً تیس لاکھ لوگ پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ افغان مہاجرین ایران کی طرف پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ آغازِ جنگ میں افغان مجاہدین کے پاس جنگی تربیت کی کمی تھی لیکن پاکستان اور امریکہ نے اسلحہ اور تربیت کے ضمن میں افغانستان کی مدد کی۔ ۱۹۸۰ کی دہائی میں روس کو افغانستان کی طرف سے بھاری نقصان اٹھانا پڑا ۱۹۸۸ میں امریکہ، پاکستان اور افغانستان نے روس کے انخلاء پر معاہدہ کیا جس کے مطابق ۱۹۸۹ میں روس کا انخلا مکمل ہوا۔

۱۹۹۰ کو خلیجی جنگ کا آغاز ہوا۔ یہ جنگ عراق اور کویت کے درمیان لڑی گئی۔ اس جنگ میں عراق کی قیادت صدام حسین کر رہے تھے۔ اقوام متحدہ نے عراق کو کویت سے انخلاء کا حکم دیا۔ سعودی عرب نے عراق اور صدام حسین سے خطرہ محسوس کیا تو امریکہ اور نیٹو اتحاد کو اپنی حفاظت کے لیے سعودی عرب میں جگہ دی۔ جس کے نتیجے میں سعودی عرب میں امریکی افواج کا ہونا القاعدہ اور سعودی حکومت کے مابین نزاع کی وجہ بنا۔ اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کاؤنسل نے عراق اور کویت کے مابین جنگ بندی پر زور دیا لیکن صدام حسین کویت کو اپنا صوبہ بنانے پر بضد تھے۔ جنوری ۱۹۹۱ میں عراق کے خلاف بنی ہوئی متحدہ افواج کی تعداد سات لاکھ سے تجاوز کر گئی۔ اس سات لاکھ تعداد کی فوج میں پانچ لاکھ چالیس ہزار کی تعداد میں امریکی فوج شامل تھی۔ امریکی اتحادی فوج نے باقاعدہ طور پر عراقی فوج کے خلاف سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔

۱۷ مارچ ۲۰۰۳ کو امریکہ اور برطانیہ نے جنگ کی دھمکی کے ساتھ صدام حسین کو اقتدار سے الگ ہونے کا حکم دیا اور مزید یہ دھمکی دی۔

> "Despite Saddam's departure from power, America will turn to Iraq to contribute to the construction of Iraq and the destruction of dangerous weapons there." [29]

جہاد اور دیگر بنیاد پرست تحریکوں پر ہونے والی تحقیقات سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ جہادی تحریکیں خود امریکہ کی ضرورت تھیں۔ امریکہ نے سرد جنگ کے بعد پوری دنیا میں اپنے نئے دشمن پیدا کیے جن کو دو مختلف ناموں سے جانا جاتا ہے۔ معاشی اعتبار سے امریکہ کے دشمنوں کو yellow "

" threatکانام دیا گیا جبکہ دوسری صورت کے دشمنوں کو " Green threat " کانام دیا گیا۔ڈاکٹر سمیع اللہ فراز اپنی تحقیقات کی روشنی میں یہ بات واضح کرتے ہیں

"It has been mentioned that America creates its own enemies so that it can expand its policies and interests by using it as an excuse" [30]

یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۸۰ کی دہائی میں سویت یونین کے خلاف افغان مجاہدین کو امریکہ نے ہی سی آئی اے کی مدد سے تربیت دی تھی اور انہیں اسلحہ فراہم کیا تھا۔ روس افغان جنگ میں پاکستان بھی افغانستان کی مدد کرنے میں پیش پیش تھا۔ افغانستان کی شکست کے بعد امریکہ نے افغان مجاہدین سے منہ پھیر لیا اور یوں اسامہ بن لادن کی قیادت میں القاعدہ ایک ایسی تنظیم بنی جو ۱۹۹۰ کی دہائی میں امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کے خلاف برسرپیکار رہی۔ افغانستان میں روس کی شکست کے بعد امریکہ نے ایک نئے عالمی خطرے کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کیا۔ امریکہ کے نزدیک یہ نیا عالمی خطرہ اسلامی بنیاد پرستی تھا۔ اس اسلامی بنیاد پرستی کے باطن سے ایک اسلامی دہشت گردی نے جنم لیا اور پھر اس دہشت گردی کے خلاف یورپی طاقتوں کو منظم کر کے امریکہ بہادر نے اپنی قیادت میں اسلامی دہشت گردی (خود ساختہ) کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ امریکہ نے اپنی پر زور قیادت کے نتیجے میں عراق، شام، لیبیا، مصر اور افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

افغان مجاہدین پر مشتمل تنظیم "القاعدہ" کی تشکیل کے حوالے سے کی آراء پائی جاتی ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگست ۱۹۹۶ میں اسامہ بن لادن نے سعودی عرب میں امریکی فوجیوں کی موجودگی کی بنیاد پر ایک فتویٰ جاری کیا جو "امریکہ کے خلاف اعلان جنگ کے نام سے معروف ہے۔ اس فتوے کے بعد ۱۹۹۸ میں القاعدہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس فتوے کے مقاصد میں امریکہ اور ان کے اتحادیوں کو قتل کرنا، خواہ وہ عوام ہوں یا افواج، ہر اس مسلمان پر انفرادی حیثیت سے فرض یعنی فرضِ عین ہے، جو اس سے لڑنے کی استطاعت رکھتا ہو۔

افغان مجاہدین کی تنظیم القاعدہ کو اس بنا پر عالمی سطح پر شناخت حاصل ہے کہ اس تنظیم نے براہِ راست امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو اپنا اولین ہدف بنایا مثلاً نائن الیون کے حملے امریکہ پر افغان مجاہدین کی براہِ راست یلغار تھی۔ سفارت خانے کو چونکہ عالمی حیثیت حاصل ہوتی ہے اس وجہ سے افغان مجاہدین کی جانب سے دنیا کے مختلف ممالک میں امریکی سفارت خانوں پر بھی حملے کیے گئے۔ سفارت خانوں پر ان حملوں سے القاعدہ تنظیم پہلی بار عالمی منظر نامے پر ابھری۔ جس کے بعد ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملوں نے القاعدہ کو پوری دنیا

میں عالمی جہادی تحریک کے طور پر ابھارا۔ القاعدہ تنظیم نے اسلامی دنیا میں ہونے والے جھگڑوں کا اصل ذمہ دار امریکہ جو ٹھہرایا اور ان کے خلاف جنگ کرنے کا پختہ عہد و پیمان کیا۔

گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ کو خود کش حملہ آوروں نے چار امریکی جہازوں کو اغواء کر کے امریکہ کے شہر نیو یارک اور واشنگٹن کی اہم عمارتوں سے ٹکرانے کا منصوبہ بنایا۔ چار میں سے دو طیارے نیو یارک میں تعمیر شدہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی بلند و بالا دو عمارتوں سے ٹکرائے اور انہیں تباہ و برباد کر دیا۔ ایک طیارہ پینٹاگان کی عمارت سے ٹکرایا جبکہ چوتھا طیارہ اپنا ہدف حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ امریکہ میں ہونے والے ان حملوں کو ۹/۱۱ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان حملوں میں تین ہزار کے قریب لوگ مارے گئے اور یوں یہ واقعہ دنیا کے تکلیف دہ واقعات میں سے ایک ہو گیا۔ ان حملوں میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے جڑواں ٹاورز منہدم ہو گئے اور ۲۶۰۰ کے لگ بھگ جانوں کا ضیاع ہوا۔ ان میں اکثریت موقع پر دم توڑ گئی جبکہ کئی لوگ ہسپتالوں میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے وفات پا گئے۔ اس واقعے کے بعد نائن الیون دنیا میں دہشت گردی ، انتہاء پسندی، ظلم و تعدی کا استعارہ بن گیا۔ اس ایک واقعے نے تاریخ کا رخ موڑنے کے بھرپور کوشش کی اور سیاست و سماج، معیشت و معاشرت اور تہذیب و ثقافت پر بھرپور اثرات مرتب کئے۔

ii۔ مابعد نائن الیون حالات

نائن الیون کے حملوں کے بعد ایک ماہ کے اندر اندر امریکی صدر بش نے عالمی اتحاد بلوایا اور نائن الیون کے حملوں کا بدلہ لینے کی غرض سے افغانستان پر یلغار کا فیصلہ کیا۔ افغانستان میں القاعدہ کی حکومت کو پلٹنے میں تو زیادہ وقت نہیں لگا لیکن اسامہ بن لادن کو ڈھونڈنے میں امریکہ کو ایک دہائی کا سخت کوشش اور انتظار کرنا پڑا۔ اسامہ بن لادن کو امریکہ نے مئی ۲۰۱۱ میں ایبٹ آباد میں ایک فوجی کاروائی میں ہلاک کرنے کا دعویٰ کیا۔ امریکہ نے ٹریڈ سینٹر کے حملوں کا ذمہدار "القاعدہ" اور اس کے ذمہدار اسامہ بن لادن کو ٹھہرایا اور اس تنظیم کو عالمی دہشت گرد تنظیم کے طور پر پوری دنیا میں مشہور کیا گیا۔ اس وقت کے امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے افغانستان پر جنگ مسلط کر دی ۔ انہوں نے افغانستان کے حکمران جماعت سے اسامہ بن لادن کی حوالگی کا مطالبہ کیا۔ طالبان نے اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کرنے پر انکار کر دیا جس کے نتیجے میں امریکی صدر نے برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلئیر اور دیگر طاقتوں خصوصاً نیٹو کو اپنے اتحاد میں شامل کیا۔ دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ میں بعد ازاں پاکستان بھی امریکہ کا اتحادی بنا۔ ۱۳ نومبر ۲۰۰۱ کو شمالی اتحاد کے جنگجو نے امریکی مدد سے کابل میں حملہ کیا۔ جس کے نتیجے میں طالبان نے افغانستان کا اقتدار چھوڑ دیا اور زیر

زمین اور پہاڑوں کے درمیان چلے گئے۔ اسامہ بن لادن کی خفیہ موجودگی کی اطلاع پا کر دسمبر ۲۰۰۱ میں امریکہ نے تورابورا کی پہاڑیوں پر بمباری کی تاہم ان کی اطلاع صلہ ثابت ہوئی اور اسامہ بن لادن کو ڈھونڈنے کی ایک اور امریکی کوشش ناکام ہو گئ۔ اقوامِ متحدہ، شمالی اتحاد کے افغان مجاہدین، افغانستان کے دیگر مختلف گروپس اور ظاہر شاہ کی جرمنی میں کانفرنس میں شراکت کے بعد ۵ دسمبر ۲۰۰۱ کو بون معاہدے پر دستخط ہوئے اور اس کے بعد اپریل ۲۰۰۲ میں حامد کرزئی کی سربراہی میں ۱۷ اپریل ۲۰۰۲ کو نئی افغان حکومت کا اعلان کیا گیا۔ امریکہ افغانستان میں ترقیاتی کاموں کے لیے امدادی پیکجوں کے ساتھ ساتھ افغانستان کے ساتھ جنگ کا سلسلہ جاری رکھا۔

ز۔ نائن الیون کے عالمی ادب پر اثرات

عالمی ادب میں جنگ عظیم اول اور دوم کے بعد مزاحمتی ادب لکھا جانے لگا۔ اس مزاحمتی ادب میں دنیا کے بڑے تخلیق کاروں نے بڑا ادب تخلیق کیا۔ لیو ٹالسٹائی کا ناول "جنگ اور امن" اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔ جنگ عظیم کے بعد دنیا کے تقریباً ہر حصے میں جنگیں لڑی گئیں اور انقلاب آئے۔ اس تمام عالمی منظر نامے پر بھی دنیا کی ہر زبان میں ادب تخلیق کیا گیا۔ اکیسویں صدی کے آغاز سے ہی امریکہ میں موجود ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی بلند و بالا عمارتوں پر ہونے والے حملوں نے پورے عالمی منظر نامے کو تبدیل کر دیا۔ جس کے بعد اکیسویں صدی میں ایک نو مزاحمتی ادب تشکیل پایا۔ اس ادب کا ایک بڑا موضوع دہشت گردی، انتہاء پسندی، ظلم و تعدی کے خلاف مزاحمت تھا۔ نائن الیون کے دل خراش واقعے کا عالمی منظر نامے پر کو طرح اثر مرتب ہوا اس کے متعلق ڈاکٹر نجیبہ عارف رقم طراز ہیں۔

> "مابعد کی اس دنیا میں دو بلند و بالا عمارتوں کا گرنا، در اصل دو خلاؤں کی تشکیل ہے۔ ایسی تخریب جس کی بنیاد پر نئی تعمیر ہو سکتی ہے۔ یہ واقعی ایک عہد کی فصیل اور دوسرے عہد کا دروازہ ہے۔ یہ بات بش اور اوبامہ کی تقاریر سے لے کر، اسکول کے بچوں کے مباحثے تک کئی بار کہی اور سنی گئی ہے کہ گیارہ ستمبر کا دن عہدِ جدید کی تاریخ کا اہم ترین دن ہے جب پرانی جمی جمائی زندگی کی بساط الٹ گئی اور مشرق و مغرب کے درمیان ایک نیا رشتہ استوار ہوا۔ اس الٹی ہوئی بساط کو، اس نئے رشتے کے پیچ و خم کو، ہر ایک نے اپنے اپنے فکری، تاریخی اور واقعاتی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔"
>
> 31

گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ کے اس واقعے کے زیر اثر عالمی ادب میں تقریباً ہر صنف ادب میں لکھا گیا۔ جس میں ناول، افسانے، نظمیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ نائن الیون کے واقعے کو دنیا بھر میں مختلف فلموں، ڈراموں اور مصوری کے ذریعے سمجھنے اور بیان کرنے کی کوشش کی گئ۔ ان تمام زرائع سے یہ دکھانے کی کوشش کی گئ کہ نائن الیون کے واقعے نے انسان کی شخصی اور معاشرتی زندگی پر کیا کیا اثرات مرتب کیے ہیں۔ نائن الیون کے بعد کے عالمی ادب کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر سب سے زیادہ ادب امریکہ میں تخلیق کیا گیا۔ امریکہ میں لکھے جانے والے ناولوں میں زیادہ تر ان افراد کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے جو براہ راست نائن الیون کے حملوں کا شکار ہوئے۔ مختلف افراد کی نجی زندگیوں میں نائن الیوین کے کیا اثرات مرتب ہوئے یہ ان ناولوں کا بنیادی موضوع ہے۔ عالمی ادب میں نائن الیون کے واقعے کے بعد کئ ناول اور افسانے لکھے گئے۔ اس موضوع پر لکھے گئے درجنوں ناول شائع ہوئے جن میں امریکی مصنفین کے مندرجہ ذیل ناول بہت معروف ہوئے۔

1- Between two rivers (2004 by Nicholas Rinaldi

2- Extremely Loud and Incredibly Close (2005by Jonathan Safran

3- Eleven (200 by Welsh David

4- The Emperor's Children (200 by Claire Messud

5- The good life (200 by Jay McInerney

- The Faithful spy (200 by Alex Berenson

7- The Falling Man 2007 by Don DeLillo

8- The writing on the wall (2005 by Lynne Sharon Schwartz

9- False Impression (2005 by Jeffrey Archer

10- Architect of Courage by Victoria Weisfeld

11- Bleeding Edge (2013 by Thomas Pynchon

12- The Garden of last days (2008 by Andre Dubus III

13- Nine , ten : A September 11 story by Ian McEwan

14- Towers falling (201 by Jewell Parker

15- I survived the Attacks of September 11 ,2001 by Lauren Tarshis

کین کیلفس کے ناول A Disorder Peculiar to the Country شوہر مارشل اور بیوی جوائس کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سانحہ نائن الیون کے پس منظر میں اس شادی شدہ جوڑے کی آپس میں نااتفاقی اور نارضامندی سے جاری رہنے والی زندگی کو بیان کیا گیا ہے۔ سانحہ نائن الیون کے وقت دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو مردہ سمجھتے ہیں لیکن خوش بختی سے دونوں اس حادثے میں زندہ ہوتے ہیں۔ اپنی اس نئی زندگی کو پانے کے باوجود میاں بیوی ایک دوسرے کو تکلیف دینے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ ان کی نااتفاقی آخر اس خواہش پر منتج ہوتی ہے کہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے قطع تعلق کر لیں اور اپنے لیے نئے راستوں اور نئی منزلوں کا انتخاب کریں۔ قطع تعلق کے بعد بیوی جوائس امریکہ افغان جنگ میں دلچسپی لیتی ہے جبکہ شوہر مارشل امریکہ کے لیے بم بنانے کے تجربات کرتا ہے۔ جوائس اور مارشل کی زندگی کے پس منظر میں کیلفس عالمی سطح کے منظر نامے پر جاری رہنے والی عراق، افغان جنگ، اسامہ بن لادن کی گرفتاری کی امریکی کوششیں، دو تہذیبوں کے تصادم اور مابعد نائن الیون بننے والی مجموعی صورتحال کو بیان کرتے ہیں۔

نائن الیون کے واقعے کے بعد جو دردناک صورتحال پیدا ہوتی ہے وہ محض دو زندگیوں کو ہی تباہ و برباد نہیں کرتی بلکہ مجموعی طور پر پورے معاشرے پر تلخ اثرات مرتب کرتی ہے۔ ناول نگار نے ایک ناکام ازدواجی زندگی کے پس منظر میں وسیع تناظر کا کامیاب احاطہ کیا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان یہ نااتفاقی اور بے اعتنائی علامتی طور پر دو تہذیبوں کے درمیان تصادم کا اندیشہ ہے۔ مشرق اور مغرب کے درمیان موجودہ صدی میں پھیلتا ہوا خلا دو تہذیبوں کے زبردست مگر الم ناک انجام کی پیشین گوئی کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی میاں بیوی کی یہ زندگی بیان کرتی ہے کہ دو قومیں آپس میں خواہ کتنا ہی برسرِپیکار کیوں نہ ہوں۔ وہ ایک دوسرے کو نیست و نابود نہیں کر سکتیں۔

پاکستانی ادیب محسن حمید ایک طویل عرصہ سے امریکہ میں قیام پزیر ہیں۔ انہوں نے دو ناول لکھے پہلا ناول Moth Smoke ۲۰۰۰ میں شائع ہوا جو ناول کے قارئین میں بہت پسند کیا گیا۔ جبکہ دوسرا ناول The Reluctant Fundamentalist کے نام سے شائع ہوا۔ اس ناول میں انہوں نے پاکستان سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ طبقے کے ایک کردار چنگیز کو مرکزی کردار بنایا۔ اور چنگیز کی زندگی پر نائن الوین کے اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔ ناول میں دکھایا گیا ہے کہ نائن الیون کے سانحے کے بعد امریکہ میں مقیم پاکستانی مسلمان کس طرح امریکی عتاب کا نشانہ بنے اور اس کے نتیجے میں پاکستان سے تعلق رکھنے والے چنگیز کو بھی اپنی کامیاب زندگی اور

خوبصورت محبوبہ سے ہاتھ دھونا پڑا۔ انسان کی نجی زندگی اور مقاصد کو سیاست کس طرح چکنا چور کرتی ہے اور ان کے عزائم کو کس طرح تباہ و برباد کرتی ہے یہ اس ناول کی مرکزی کہانی ہے۔

اس ناول کا یہ مرکزی خیال کسی امریکہ دشمن کا نہیں بلکہ یہ ایک تعلیم یافتہ روشن خیال نوجوان کا خیال ہے کسی طور پر بھی اسلامی بنیاد پرست یا متشدد اسلام پسند نہیں اس پورے ناول میں کہیں بھی ناول نگار نے اپنا نقطہ نظر بیان کرنے کے لیے مذہب کا سہارا نہیں لیا۔ اس ناول کا سب سے حیران کن لمحہ وہ ہے جب چنگیز ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی کی خبر سن کو مسکرا دیتا ہے۔ اس مسکراہٹ کو مرکزی کردار تو بڑی کامیابی سے چھپا لیتا ہے لیکن اس کی مسکراہٹ ناول کی معنویت میں اضافہ کرتی ہے۔ یہ مسکراہٹ پس پردہ کئی ان کہی کہانیوں کو بیان کرتی ہے۔

> " New York was in mourning after the destruction of the World Trade Centre, and floral motifs figured prominently in the shrines to the dead and the missing that had sprung up in my absence. I would often glance at them as I walked by: photos, bouquets, words of condolence – nestled into street corners and between shops and along the railings of public squares. They reminded me of my own uncharitable – indeed, inhuman – response to the tragedy, and I felt from them a constant murmur of reproach. [32]

ناول کو بڑی منفرد تکنیک کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ایک جنبی امریکی شخص انارکلی لاہور میں ایک پاکستانی نوجوان سے ملتا ہے۔ لاہور کا یہ نوجوان اس امریکی شخص کو اپنے ماضی کی سنہری یادوں کی کہانی بیان کرتا ہے۔ اس کا یہ ماضی امریکہ میں گزرتا ہے۔ اس کہانی کے زریعے ناول نگار انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو بیان کرتے ہوے عالمی منظر نامے پر سیاست کے کھیل کو بھی بیان کرتا ہے۔ ناول میں دکھایا گیا ہے کہ عالمی سطح کی سیاسی چالبازیاں معاشرے میں بسنے والے ایک امن پسند اور روشن خیال انسان کو بھی شدت پسندی کی طرف مائل کر سکتا ہے۔ ناول میں محسن حمید نے ایک اجنبی امریکی شخص اور روشن خیال پاکستانی کی کہانی کے

زریعے ان کی قوم کی نمائندگی کی ہے۔ناول میں بیان کیا گیا ہے کہ امریکہ کس طرح اپنے اقتدار کی ہوس میں دوسری کمزور قوموں پر اپنی پالیسیاں مسلط کرتا ہے اور ان کو اپنے زیر نگیں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

" America was engaged only in posturing. As a society, you were unwilling to reflect upon the shared pain that United you with those who attacked you. You retreated into myths of your own difference, assumptions of your own superiority. And you acted out these beliefs on the stage of the World. So that the entire planet was rocked by the repercussions of your tantrums, not least my family, now facing war thousands of miles away. Such an America had to be stopped in the interests not only of the rest of humanity, but also in your own. [33]

ڈان ڈیلیلیو کا ایوارڈ یافتہ ناول The falling man بھی ایک علامتی طرز کا ناول ہے۔اس ناول کی بنیاد ایک تصویر بنی۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی عمارتوں پر حملے کے وقت سینکڑوں لوگوں نے بلند و بالا عمارت کی کھڑکیوں سے چھلانگیں لگا دیں۔ ان سینکڑوں لوگوں نے عمارت سے کودنے کے نتیجے میں اپنی جانیں ضائع کر دیں۔ ایسی ہی ایک تصویر کو رچرڈ ڈریو نے کھینچا اور اس کا نام The falling man رکھا۔ یہ تصویر پوری دنیا میں بہت معروف ہوئی۔ اس گرتے ہوئے آدمی کے منظر کو کئی سٹنٹ اداکاروں نے بھی نیو یارک کے شہر میں کئی بار پیش کیا۔ یہ سٹنٹ اداکار اپنے آپ کو رسیوں سے باندھ کر عمارت سے خود کو گرا دیتے۔ اس منظر پر کئی دستاویزی فلمیں بھی بنیں۔ ڈان ڈیلیلیو نے اسی تصویر سے اپنے ناول کا عنوان اخذ کیا۔ علامتی طور پر یہ تصویر پورے ناول کی کہانی کو بیان کرتی ہے۔ اس ناول کی کہانی انسان کی انفرادی اور اجتماعی سطح پر موت کی طرف سفر کی کہانی کو بیان کرتا ہے۔

اس ناول کا مرکزی کردار ۳۹ سالہ کیتھ ہے جو پیشے کے لحاظ سے قانون دان ہے۔ کیتھ نائن الیون کے حملے میں بڑی مشکل سے اپنی جان بچاتا ہے اور پھر ایک بریف کیس لیے اپنی علیحدہ ہو جانے والی بیوی کے گھر داخل ہوتا ہے۔ کیتھ کے ہاتھوں میں جو بیگ ہوتا ہے وہ دراصل کسی اجنبی خاتون کا ہوتا ہے جو کیتھ کی

طرح اس حادثے میں بال بال بچتی ہے۔ اس حادثے کے بعد کیتھ اس اجنبی خاتون کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے اور ایک مشترک تجربے سے گزرنے کی وجہ سے یہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کیتھ کی بیوی لیانا مشرق وسطیٰ کے بارے میں متعصبانہ نقطہ نظر رکھتی ہے اور اس میں وہ اتنی شدت پسند ہوتی ہے کہ پڑوسیوں کے گھر سے سنائی دینے والی موسیقی میں بھی اسے مشرق وسطی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ رہنا شروع کر دیتی ہے۔ اس کی ماں اپنے کسی دوست سے بیس سالہ طویل رفاقت صرف اسی وجہ سے چھوڑ دیتی ہے کہ ماضی میں اس کا تعلق کسی نہ کسی دہشت گرد گروہ سے تھا۔ کیتھ اور لیانا کا بیٹا دوربین سے کھیلنا شروع کرتا ہے تو وہ آسمان پر جہازوں کو دیکھتا ہوا "بن لاٹن "یعنی بن لادن کو تلاش کرتا رہتا ہے۔ دوربین کی مدد سے بن لادن کی تلاش اس بچے کی معصومیت اور ناول کی معنویت میں اضافہ کرتی ہے۔اس ناول کا اختتام ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کے بعد اٹھنے والے دھوئیں اور آگ سے لپٹی ہوئی عمارتوں کے بیان سے ہوتا ہے۔

اونیل کے ایوارڈ یافتہ ناول Netherland میں کرکٹ کے کھیل کو بنیادی علامتی حیثیت حاصل ہے۔ اس ناول میں ناول نگار نے زندگی کو ٹیسٹ کرکٹ سے تشبیہہ دی۔ ٹیسٹ کرکٹ میں بسا اوقات کھیل پانچ روز تک جاری رہتا ہے لیکن بغیر کسی نتیجے کے ختم ہو جاتا ہے۔ بعینہ زندگی کی مثال ہے کہ انسان کی زندگی میں تگ و دو کا ایک لامتناہی سلسلہ چلتا رہتا ہے لیکن وہ اپنی زندگی ہار جیت کے بغیر گزار دیتا ہے۔ کرکٹ کے کھیل کے اس علامتی تناظر میں ناول نگار نے سماج میں بسنے والے عام طبقے کے لوگوں کی نفسیات کو بھی بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک ناخوش شادی شدہ جوڑے کی زندگیوں کے تین سال کے عرصے کو بیان کیا ہے۔ جنہیں گیارہ ستمبر کے واقعے کے بعد شدید عدم تحفظ کا سامنا کرنا پڑا۔ امریکی صدر جارج واشنگٹن بش کی پالیسیوں کے تحت عام سطح پہ جینے والے لوگوں کو اضطراب کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی زندگیوں میں بے یقینی اور انتشار کا عرصہ طویل ہو گیا۔ اس ناول میں نائن الیون کے واقعے کے بعد سماجی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔

ان تبدیلیوں نے افراد کی خانگی زندگی پر کیا اثرات مرتب کیے، انسان کا سماج میں کیا مقام رہا، غیر مسلم ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کو کس طرح کے عدم تحفظ کا سامنا کرنا پڑا اور نیو یارک میں زندگی کس طرح بسر ہونے لگی۔ یہ تمام عناصر ناول کے مرکزی خیال کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس ناول میں جتنے بھی کردار پائے گئے ہیں وہ تمام نائن الیون کے بعد سیاسی بحث و مباحثہ میں حصہ لیتے ہیں۔ حتی کہ

معاشرتی تقریبات اور ڈنر پارٹیوں میں بھی قومی اور بین الاقوامی امور پر بحث لازمی تصور کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ناول نگار نے بڑے مسحور کن طریقے سے اس نہج اور سمت کو بیان کیا ہے جسے نائن الیون کے بعد لوگوں نے شعوری اور غیر شعوری طور پر قبول کیا۔

ولیم گبسن کا ناول Pattern Recognition ایک ایسا ناول ہے جس میں مرکزی کردار کے والد کی گمشدگی ماضی کی گمشدگی کی علامت بن جاتی ہے۔ اس ناول کے مرکزی کردار کا باپ نائن الیون کے حادثے میں گم ہو جاتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار اپنے باپ کو ڈھونڈنے کے لیے ہزار ہا جتن کرتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک ملک سے دوسرے ملک تک کا سفر کرتا ہے تاکہ وہ اپنے گمشدہ باپ کی بازیافت کر سکے۔ اس کے والد کی گمشدگی دراصل بیسویں صدی کی گمشدگی کی داستان ہے۔ نئی صدی اور نئے زمانے کے آغاز کے ساتھ بیسویں صدی اور پرانی اقدار و روایات کہیں گم ہو گئیں جن کی بازیافت کی کوشش کی کامیابی ممکن نہیں۔ اکیسویں صدی کے اس بدلتے ہوئے وقت کا یہ تقاضا ہے کہ پرانی جڑوں کی تلاش کی جائے۔ ان کی شناخت کیے عمل اور نئی زندگی کے بدلے ہوئے رخ میں زندگی کے نئے سرے سے معنی دریافت کرنے کی سعی و تگ و دو کی جائے۔ گمشدہ والد کی تلاش کی علامت میں پرانی شناخت کی تلاش کو ناول نگار اس طرح بیان کرتے ہیں۔

> "Since there was no reason for his having been in New York, that particular morning, there was no reason to assume that he would have been in the vicinity of the World Trade Center. But Cynthia, Cayce's mother, guided by voices, had been certain from the start that had been a victim. Later, when it was revealed that the CIA had maintained some sort of branch office in one of the smaller, adjacent buildings, she had become convinced that the Win had gone there to visit an old friend or former associate. [34]

ناول نگار نے اس ناول میں مستقبل کے خدشات کو بھی ناول کا موضوع بنایا۔ تخلیقیت اور روایت کے تصادم، تاریخ کے مطالعہ کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ گیارہ ستمبر کی پس منظری حیثیت کو گہری معنویت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

جان اپڈائک امریکہ سے تعلق رکھنے والے ایک مشہور و معروف افسانہ نگار، ناول نگار اور نقاد ہیں۔ مجموعی طور پر ان کے بیس سے زائد ناول، کئی افسانوی مجموعے اور شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جان اپڈائیک بیسویں صدی کے معروف ترین امریکی ادیبوں میں سے ایک ہیں۔ ان کی کتابوں میں Rabbit series بہت مشہور ہوئی۔ اس سیریز کے پانچ ناول شائع ہوئے۔ نائن الیون کے موضوع پر شائع ہونے والا ان کا ناول Terrorist بے حد مقبول ہوا۔ اس ناول کا موضوع نائن الیون سے متاثر ہونے والی زندگی نہیں بلکہ ایک نوجوان مسلم دہشت گرد کی کہانی ہے جو جہادی دہشت گرد کہلاتا ہے۔ یہ مسلم جہادی دہشت گرد اٹھارہ سالہ امریکی مسلمان نوجوان احمد ہے جس کے باپ کا تعلق مصر سے ہے جبکہ ماں آئرش ہے۔ مرکزی کردار احمد کی ماں کیتھولک مذہب سے تعلق رکھتی ہے لیکن جدید امریکی معاشرے میں رہتے ہوئے وہ اپنے مذہب سے بیزار ہو جاتی ہے اور سیکولر خیالات رکھتی ہے۔ اپنے ان سیکیولر خیالات کی وجہ سے وہ کیتھولک مذہب سے دوری اختیار کر لیتی ہے اور غیر مردوں سے جنسی تعلق قائم کرتی ہے۔ احمد ایک نرم دل تربیت یافتہ بیٹے کا کردار ادا کرتا ہے۔ وہ اپنی ماں کے ناجائز تعلقات کی وجہ سے اس سے نفرت تو کرتا ہے لیکن اس کی ضروریاتِ زندگی کا خیال کرنا اپنا اولین فریضہ سمجھتا ہے۔

احمد کا باپ مصر سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اسے تب چھوڑ کے چلا جاتا ہے جب احمد کی عمر محض تین سال کی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود احمد کو اپنی ماں سے زیادہ اپنے باپ سے محبت ہوتی ہے۔ احمد سکول میں داخلہ لیتا ہے لیکن اسے اپنے ہم مکتب اور ہم مجلس ساتھیوں کی باتیں بڑی ناگوار اور قابل اعتراض لگتی ہیں اس کے علاوہ وہ اپنی دوست کی طرف صنفی کشش بھی محسوس کرتا ہے لیکن ضبط نفس کا مظاہرہ کر کے اپنے جذبات پر قابو پا لیتا ہے۔ وہ امریکی سوسائٹی میں مادیت پرستی کے غلبے اور ثقافت کے نام پر اخلاقی زوال سے تنگ آ کر اپنی تعلیم کو خیر آباد کہہ دیتا ہے۔ وہ کالج چھوڑ دیتا ہے اور ایک مسجد میں رہنا شروع کر دیتا ہے۔ اس مسجد کا امام شیخ راشد احمد کی روحانی بالیدگی اور تربیت کا فریضہ سر انجام دیتا ہے لیکن احمد اس کی بنیاد پرستی اور قدامت پسندی کی وجہ سے اس سے بھی تنگ آ جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ ایک لبنانی خاندان سے جڑتا ہے اور ان کے فرنیچر کے کاروبار کو آگے بڑھانے کے لیے ان کے ٹرک ڈرائیور کا کام کرتا ہے۔ اسے اپنی اس عملی زندگی میں شیخ کی وہ تعلیمات یاد آتی ہیں کہ رومی تعلیم امریکی تہذیب کی جانب کشش پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اس سے انسان اپنے مذہب سے جدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پھر وہ مزید علم حاصل کرنے کی غرض سے ایک یہودی کونسلر جیک لیوی سے ملتا ہے۔

جیک لیوی اپنی پوری کوشش کرتا ہے کہ اس کو اس کی راہ سے ہٹادے لیکن جیک لیوی بھی ناکام رہتا ہے۔ آخر کار وہ ایک نام نہاد مسلمان سے ملتا ہے جو اپنے آپ کو چارلی کے نام سے متعارف کرواتا ہے۔ چارلی ناول کے مرکزی کردار احمد سے اس طرح پیش آتا ہے جیسے وہ ایک پختہ ذہن کا اور راسخ العقیدہ مسلمان ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ چارلی احمد کو جنسی ترغیبات کا درس بھی دیتا ہے اور اسے ایک آزاد خیال انسان بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ چارلی احمد کو خودکش حملے کی ترغیب دیتا ہے۔ احمد اس حملے کے لیے تیار ہو جاتا ہے لیکن جیک لیوی کو اس بات کی خبر پہنچ جاتی ہے اور وہ احمد کے ساتھ ٹرک میں بیٹھ کر اسے سمجھاتا ہے اور اس منصوبے کو ترک کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جیک لیوی، چارلی کی حقیقت بیان کرتا ہے کہ وہ دراصل کوئی مسلمان نہیں بلکہ اس نے مسلمانی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور اپنے اس بھیس میں سادہ لوح مسلمانوں کو بھٹکانا اس کا اصل کھیل ہے۔ جیک لیوی اسے بتاتا ہے کہ خودکش حملے کا منصوبہ ساز، بظاہر راسخ العقیدہ مسلمان چارلی، کوئی مسلمان نہیں بلکہ سی آئی اے کا ایجنٹ ہے۔ جیک لیوی کے اس انکشاف سے ہی ناول میں سیاست کی چالبازیوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ جیک لیوی کا یہ انکشاف اس حقیقت کی قلعی کھولتا ہے کہ خودکش حملوں کے پیچھے ہمیشہ مسلمان دہشت گرد نہیں ہوتے بلکہ اکثر اوقات اس کی منصوبہ ساز امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی سے ہوتی ہے جو اپنے مفادات کے حصول کی غرض سے ایسے گھناؤنے کام کرنے سے باز نہیں آتی۔ امریکی خفیہ ایجنسیوں کے کردار پر روشنی ڈالنے کے لیے یہ انکشاف ناول کی معنویت کو بڑھاتا ہے۔

اس ناول میں جان اپڈائک کی فنی مہارت کا ثبوت بہم ملتا ہے۔ کرداروں کی پیشکش میں انہوں نے مسلمان معاشرے کے پیش و خم اور کیفیات کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس ناول کے مرکزی کردار پر غور کریں تو لگتا ہے کہ احمد کا کردار کسی امریکی مسلمان کا کردار نہیں بلکہ کسی پاکستانی یا افغانی نوجوان مسلمان کا کردار ہے۔ ناول کے اس مرکزی کردار کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات کے محرکات پاکستانی فکشن کے کرداروں سے زیادہ مختلف نہیں۔ اس ناول میں امریکی تہذیب و ثقافت کے کھوکھلے پن اور مادہ پرستی کے بالمقابل ان قرآنی آیات و تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے جو روحانی سربلندی کی طرف راہنمائی کرتی ہیں۔ مغربی معاشرے میں اسلام کے صدیوں سے مروجہ تصور کو ایک علامتی حیثیت سے ناول میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً مرکزی کردار احمد کا اپنی ماں سے زیادہ اپنے باپ کی طرف رجحان، باپ کا تین سال کے بیٹے کو تنہا چھوڑنا اور اپنی ازدواجی زندگی سے علیحدگی اختیار کرنا مغرب میں رائج اس قدیم تصور کی نمائندگی کرتا ہے جس میں سارے کا سارا قصور ہمیشہ عورت کا تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ امام مسجد کا جدید تعلیم کے حصول پر تنقید کرنا بھی ایسا ہی ایک تصور

ہے۔ اس ناول کے مرکزی کردار کی نفسی کیفیت اور اس سے منسلک عوامل کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں۔

> "احمد کا مادیت پرستی سے بیزاری محسوس کرنا اور جنت کے حصول کے لیے اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی جان لینے کا عمل، جہاں اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں چند مسلمان تنظیموں کے بڑھتے ہوئے متشددانہ رویئے کا پتہ دیتا ہے وہاں ان خود ساختہ روایات کی بھی یاد دلاتا ہے جو صلیبی جنگوں کے بعد سے مسیحی دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق مشہور ہو گئی تھیں۔" [35]

اس ناول میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ امریکہ جیسے مادیت پرست ملک میں ایک مسلمان نوجوان کے لیے اپنے ایمان کو سنبھالنا بڑا کٹھن ہوتا ہے اور اسے قدم قدم پر ایسے کئ مرحلوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے جہاں وہ تشکیک کا شکار ہو جاتا ہے۔ نوجوان نسل کی روحانیت کی تلاش اور اس تلاش میں گمشدگی اور گمراہی بھی اس ناول کے مرکزی خیال کا درجہ رکھتی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار احمد تین مختلف لوگوں سے اپنے لیے روحانیت کی تلاش کرتا ہے لیکن اس میں شیخ اور چارلی اسے گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ بالآخر جیک لیوی اسے گمراہی کے دلدل سے نکال لاتا ہے اور زندگی کی ایک نئ معنویت بخشتا ہے۔ ناول نگار نے اس حقیقت کو بھی واضح کیا ہے کہ امریکہ کس طرح سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔

جوناتھن سیفران کا ناول Extremely Loud and Incredibly Close میں مرکزی کردار آسکر کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔ نائن الیون کے حادثے میں آسکر کے والد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اس حادثے کے بعد آسکر اور اس کے خاندان میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے جو ان کی زندگی کو شدید طور پر متاثر کرتا ہے۔ اس ناول میں ناول نگار نے مابعد جدید تکنیکی تجربات کے زریعے ناول کی کہانی کو پیش کیا ہے۔ یہ ناول بھی گیارہ ستمبر کے پس منظر میں لکھے جانے والے دیگر ناولوں کی طرح ہے جن میں اس سانحے کے نتیجے میں رقت اور رحم کے جذبات ابھارنے کی کوشش کی گئ ہے۔ اس طرح کے ناولوں کے پر کئ نقادوں نے قلم فرسائی کی ہے ان نقادوں میں نجیبہ عارف، ڈیوڈ سیمپسن کی اس بات کو بیان کرتی ہیں۔

"امریکی قوم نے گیارہ ستمبر کے واقعے سے ایک ماتمی فضا پیدا کرلی ہے اور رقت انگیز، دردناک انداز میں اسے بیان کر کے لوگوں کے جذبات برانگیختہ کرنے کی عادت ڈالی ہے۔۔۔امریکی قوم کا خود کو مظلوم سمجھ لینا اور عالم انسانیت کے دکھوں اور مصائب سے بے خبر رہنا اس کی عظمت کا ثبوت نہیں۔"[36]

امریکہ میں ہونے والے دلخراش واقعے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے حادثے کے بعد نو مزاحمتی ادب تشکیل پانے لگا۔ جس کا مقصد دہشت گردی، انتہا پسندی کے خلاف آواز اٹھانا تھا۔ مختلف فنون سے تعلق رکھنے والوں شاعروں ادیبوں، مصوروں، ڈرامہ نگاروں، فلمی دنیا کے تخلیق کاروں نے اپنے اپنے فن کے ذریعے اس واقعے کو پیش کیا اور سمجھنے کی کوشش کی۔ اس واقعے کے اثرات پر لکھے گئے ناولوں میں امریکی مصنفین کے ناول بہت مشہور ہوئے۔ مذکورہ ناول اس موضوع کے حوالے سے اہم ترین ناول ہیں۔ ہر ناول نت نئے واقعات کے ذریعے کرداروں کی زندگیوں پر نائن الیون کے اثرات کو بڑی گہرائی سے بیان کرتا ہے

ح۔ مابعد نائن الیون اردو ناولوں کے کرداروں کا اجمالی جائزہ۔

اکیسویں صدی کے ظہور کے ساتھ ہی عالم انسانی میں ایسے واقعات حادثات اور سانحات ظہور پذیر ہوئے کہ جنہوں نے ہر طبقہ انسانی کے ہر گروہ کو فکری نفسیاتی اور جذباتی لحاظ سے متاثر کیا ہے۔ ناول نگار بھی اسی معاشرے کا حصہ ہیں لہذا ان کی سوچ کی بنت اور زاویوں میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ سیدھی ،سپارٹ اور بیانیہ یا مکالماتی انداز میں کہانی بیان کرنے کی بجائے پہلو دار طریقے سے کہانی کو بیان کرنے کی روایت کا اغاز ہو چکا ہے۔ کہانی نئے تکنیکی لوازمات سے مرصع کر کے پیش کی جاتی ہے، کردار بھی نئے تقاضوں کے مطابق سیدھے سادے نہیں بل کہ نفسیاتی لحاظ سے پیچیدہ ساخت سے مزین نظر آتے ہیں۔ ماجرہ گوئی کی روایت اگرچہ دلچسپ اور پر لطف ہوتی ہے مگر اب کے حالات و واقعات میں ناول نگار کو کچھ نیا پن اختیار کرنا ہوتا ہے ورنہ ناول نگار کا تخلیقی سرمایہ پاپولر فکشن کی نذر ہو کر گردِ راہ میں گم ہو سکتا ہے۔ یقیناً جدید دور کے اس عرصے میں ایسے ناول نگار آئے ہیں جنھوں نے جدید تقاضوں کے مطابق اپنے تخلیقی سرمائے کو ڈھالا ہے اور اپنے ناولوں کو امر کیا ہے۔

اکیسویں صدی کے ناولوں کے حوالے سے محمد حمید شاہد کا کہنا ہے کہ

"گزشتہ کچھ برسوں کے اردو ناولوں کے سرسری جائزے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ لگ بھگ ہر تکنیک اور اسلوب میں لکھنے والے اس صنف میں اپنا تخلیقی جوہر دکھا رہے ہیں کہیں کہیں یوں لگتا ہے کہ اس سنس پر نئے نئے امکانات کے در کھول دیے گئے ہیں "[37]

کسی بھی ناول کی کامیابی اور معیار کا تعلق ناول کے پلاٹ, قصہ پن, اسلوب بیان, مکالمہ, منظر کشی, کہانی وغیرہ کو کرداروں کے مطابق تخلیق کرنا ہوتا ہے. بہت اچھے پلاٹ، قصے اور اسلوب کے باوجود بھی اگر کرداروں کے اندر بیان اور ادائیگی کی کوئی خامی رہ جائے تو وہ ناول اعلی معیاری ناول نہیں کہلا سکتا۔ سادہ لفظوں میں بیان کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ناول کی کہانی، پلاٹ، منظر وغیرہ اپنے موثر سیاسی اور سماجی حالات و واقعات کے تابع ہوتے ہیں اور یہ تمام حالات و واقعات اور ان کی پیشکش پوری طرح کرداروں کے تابع ہوتی ہے۔ کردار کہانی کے خمیر میں جس قدر گہرائی سے ملیں گے ناول اور کہانی اتنی ہی جان دار طریقے سے وجود میں آئے گی۔ کرداروں کے زبان و بیان کو ان کے مقام اور مرتبے کے مطابق لانا اور بیان کرنا کرداروں کو معتبر بنا دیتا ہے۔ حسب کردار، کردار کی بناوٹ اور مکالمہ بازی کسی بھی افسانوی نثر کی کامیاب تخلیق کی ضامن ہوتی ہے۔ڈاکٹر شبیر احمد قادری اس حوالے سے لکھتے ہیں

"ناول کے دیگر عناصر کی مانند کردار بھی بالعموم مقامی رنگ میں رنگے ہوتے ہیں ۔کردار ناول کی کہانی، پلاٹ، ماحول، منظر کشی، مکالمہ نویسی، جذبات نگاری، زبان ،فلسفہ حیات وکائنات کی پیش کش کا اندازہ، خیر وشر کی قوتوں کی باہمی ستیزہ کاری ،اخلاق واقدار اور دیگر امور ولوازم کو جزئیات کے ساتھ پیش کرنا کامیاب ناول نگار کو کامیابی کی ضمانت فراہم کرتے ہیں "[38]

اس میں کوئی شک نہیں کہ ناول کے تمام اجزائے ترکیبی مل کر ہی ایک خوب صورت ناول کو ترتیب دیتے ہیں مگر یہ بھی تسلیم شدہ ہے کہ ناول کے تمام لوازم کو کامیابی سے پیش کرنے کی ذمہ داری بہر حال کردار ہی کے سر ہوتی ہے۔ کردار کو بیان کرنے کے عموما دو طریقے ہیں ایک یہ کہ ناول نگار اپنی زبان سے کسی کردار کے جذبات و احساسات کو بیان کرے اور دوسرا یہ کہ کردار خود اپنے جذبات و احساسات کو بیان کرے ۔بہترین طریقہ بیان یہی ہے کہ کردار کی زبانی کہانی یا مکالموں کو بیان کرایا جائے۔ اس طرح کردار سے قاری مانوس ہو جاتا ہے اور کردار کے ذریعے جو فلسفہ یا نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہوتی ہے قاری اسے جلد

اخذ کر لیتا ہے۔ آج کی دنیا چوں کہ بہت جدید اور مصروف ہے اور ماضی سے الگ حال اور مستقبل سے جڑی ہوئی ہے۔ ٹیکنالوجی کی ترقی نے انسان کو ماضی سے تقریبا نکال کر حال اور اب حال سے مستقبل کے اندر لا چھوڑا ہے۔ لہذا ناول نگار جو اسی تغیر پذیر معاشرے کا فرد ہے، نے بھی اپنی تحریر میں جدت لانے کی کوشش کی ہے۔ پہلے ناولوں میں کردار اسم با مسمی یا تمثیلی انداز سے پیش کیے جاتے تھے مگر اب اس طرح کے کرداروں کی گنجائش بالکل نظر نہیں آتی۔ آج کا انسان علوم کی دریافت کی معراج پر ہے لہذا اسے متوجہ کرنے کے لیے روایتی کرداروں کی بجائے اچھوتے، منفرد اور پیچیدہ کرداروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج کے قاری کو شہزادہ جان عالم اور شہزادی انجمن آرا کے کردار یا ڈپٹی نظیر احمد کے مصلحانہ کرداروں سے بالکل متاثر نہیں کیا جا سکتا ان کی بجائے آج کا قاری پیچیدہ سائنسی اور کائناتی رازوں سے ہمسر ہونے والے کرداروں کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ ایسے کرداروں کو پسند کرتا ہے جو ہر لحاظ سے دور جدید کے مزاج سے آشنا ہوں۔ مابعد نائن الیون اردو ناول کے اندر بھی کرداروں کی جدت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اردو ناولوں کے یہ کردار جدید سائنسی علوم اور سائبر دنیا کے استعارے محسوس ہوتے ہیں، یہ کردار جدید میڈیا اور جدید رسل و رسائل میں ڈوبے زندگی کی حقیقت کی تلاش میں دراصل زندگی ہی سے دور نظر آتے ہیں۔ لہذا آج کے ناول نگار کو آج ہی کے ذہن اور دماغ کے مطابق کرداروں کو تراشنا پڑ رہا ہے۔ شامل تحقیق ناولوں کے کردار اگرچہ مغربی ناول یا فکشن کے کرداروں کی نسبت کم وسعت رکھتے ہیں مگر یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ یہ کردار جدیدیت کے رنگ سے ہم رنگ بھی نظر آتے ہیں۔

دور حاضر میں جس میں ہم جی رہے ہیں ایک ایسی جناتی مشین ہے جس سے آئے روز نئے اور پیچیدہ ترین حالات نکل کر سامنے ارہے ہیں۔ پوری انسانی تہذیب اور ثقافت میں تغیر کا جن سر چڑھ کے بول رہا ہے۔ کسی چیز کو بھی استحکام حاصل نہیں ہے۔ نظریات، فلسفے، طرز زندگی، سوچ، فکر، رہن سہن یہاں تک کہ انسانی رویے تک کوئی چیز بھی مستحکم نہیں رہی۔ یہ تبدیلی اگرچہ ازل سے سفر پذیر ہے مگر اس دور میں اس نے جو رفتار حاصل کی ہے وہ شاید اخری زمانے کی نشانی ظاہر کر رہی ہے۔ اس تغیر اور تبدیلی کا اظہار یقینا اردو ناولوں میں بطور کہانی، پلاٹ اور کردار کی نفسیات کے نظر ارہا ہے۔ ڈاکٹر فخر الکریم، سید محمد عقیل کے حوالے سے ایک مضمون "اکیسویں صدی میں اردو ناول چند مباحث" میں لکھتے ہیں

> "یہ آج کے ناول کی وہ نئی دنیا ہے جو منٹو اور عصمت چغتائی سے میلوں آگے چلی ائی ہے، غلط ہے یا صحیح ہے اس کا فیصلہ خود آج کی نئی نسل ہی کرے گی۔ کہ جب زندگی میں

چاروں طرف یہی فضا ہے تو اسے قبولیت حاصل ہو کر رہے گی، یہ کرائسز ہے یا آج کی مادی اور صارفیت کی دنیا کا اگلا قدم، اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ آج کی دنیا ایک عالمی گاؤں بنتی جا رہی ہے تو گاؤں کے ایک کونے میں جو ہو رہا ہے تو دوسرا کونہ اس سے کیوں کر بچ سکے گا؟"[39]

سیاست، مذہب، معیشت، عالمی نظاموں کی کروٹیں یہ سب آج کے ناول کے متن کا حصہ ہیں لہذا ان ناولوں کے کردار روایتی اور قدیم طرز سے بالکل الگ ایک نئی فکر اور انداز کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔ ان پچھلی دو دہائیوں میں شائع شدہ اردو ناولوں کا جائزہ لیا جائے تو موضوع کی وسعت اور تنوع بھی قابل لحاظ حد تک ان کے اندر موجود ہے۔ جس طرح آج کا انسان پیچیدہ اور تہ در تہ شخصیت رکھتا ہے اسی لحاظ سے ناول کی کہانی پلاٹ اور کردار بھی اس خمیر کے اندر جمع ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ نائن الیون ان دو دہائیوں کو محیط وہ قصہ ہے جس نے کسی نہ کسی طور ناول نگاروں کو اپنی طرف متوجہ کیا رکھا۔ اس کے جلو سے نکلنے والے ہزاروں انسانی، معاشی، سیاسی اور سماجی مسائل اردو ناول نگاروں کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ ان ناول نگاروں میں مستنصر حسین تارڑ (قلعہ جنگی، خس و خاشاکِ زمانے) نیلم احمد بشیر (طاوس فقط رنگ)، شیراز دستی (ساسا) امنہ مفتی (اخری زمانہ) محسنہ جیلانی (میں دہشت گرد ہوں) محمد الیاس (برف) نگہت حسن (جاکنگ پارک) ایم اختر (ایک لوسٹوری ایک ایٹمی قیامت) زیف سید (گل مینا) وغیرہ اہم ناول نگار ہیں۔ ان میں نائن الیون کے جڑے ہوئے تمام تر واقعات حالات یا خیالات کو پیش کر کے آج کے انسان کی مجموعی سوچ اور فکر کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس طرح دورِ حاضر کی مادی اور غیر مادی اشیاء کے اندر تلاطم ہے، تغیر ہے سماب صفتی ہے بالکل اسی طرح آج کے اردو ناول میں پیش کیے گئے کردار اور کہانیاں بھی تغیر و تبدل کا شکار نظر آتی ہیں۔ ایک کہانی یا محبت اگر پاکستان کی سرزمین سے شروع ہوتی ہے تو اس کا پھیلاؤ امریکہ اور یورپ کی سرزمینوں تک نظر آتا ہے۔ محمد شیراز کے ناول ساسا ہی کو لیں اس ناول میں دو تہذیبوں کے تفاوت کو ساسا پرندے کی علامت کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار سلیم ہے جو پاکستان کے گاؤں سے نکل کر محبت کی تلاش میں امریکہ پہنچ جاتا ہے۔ امریکہ میں اسے اپنی تہذیب اور ثقافت اور روایات سے یکسر مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مصنف نے سلیم کے کردار کو پہلو دار ڈھب سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ محبت تو اپنے گاؤں کی لڑکی منزہ سے کرتا ہے مگر امریکہ میں دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق کبھی اینا اور کبھی جینی کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اینا سے وہ پہلے قریب ہوتا ہے مگر اینا جب ایک ہندوستانی لڑکے

کے ساتھ چھٹیاں گزارتی ہے تو اس کا دل بیٹھ جاتا ہے اور وہ جینی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ جینی جو پہلے ہی ایک بو آئے فرینڈ کی محبت سے مایوس ہو چکی ہوتی ہے سلیم کو ویل کم کرتی ہے۔ یہاں اگر ہم ان کرداروں کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہاں محبت شاید پسندیدگی یا موجودگی کی ضرورت تک محدود رہتی ہے، وہ ملکوتی محبت جو قدیم قصوں اور کہانیوں میں پائی جاتی تھی وہ اب مفقود نظر آتی ہے۔ ہر ایک اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق، حسب ضرورت اور حسب ذائقہ محبت کا دعوی کرتا ہے اور واپس لے لیتا ہے۔ محبت کی رسیلی لذت سے کوئی ایک کردار آشنا نظر نہیں آتا۔ وجہ یہ ہے کہ دور حاضر کے بے پناہ بدلتے حالات نے انسانوں کو بھی مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی محبت کا ماتم کرنے کی بجائے اگے نکل جآئے اور نئی دنیا تلاش کرے۔ اینا اور جینی خالص امریکی ماحول کی پیداوار ہوتی ہیں، ان کے اندر زندگی کی خالص رمزیت کی بجآئے تعلق میں تصنع، بناوٹ اور رکھ رکھاؤ موجود ہوتا ہے جب کہ سلیم کا پس منظر ایک خالص ماحول سے ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اپنے اپ کو ڈھال رہا ہوتا ہے مگر وہ محبت کے معاملے میں ذائقہ بدلنے کا قائل نظر نہیں آتا۔ ہاں مصلحت کوشی اس کی بھی عادت ہوتی ہے اس لیے وہ مختلف لڑکیوں سے محبت کی کسک دل میں محسوس کرتا ہے ۔ تہذیبی لحاظ سے سلیم امریکہ اور پاکستان کے اندر زمین اور اسمان کا فرق محسوس کرتا ہے۔ ایک طرف تو وہ اپنی دوست کے پرندے ساسا کو پورے اہتمام کے ساتھ مر جانے پر دفن کرنے کی رسم ادا کرتا ہے لیکن دوسری طرف اسی وقت اسے اپنے ملک میں ہزاروں بچوں کے بموں سے اڑنے والے چیتھڑے یاد آتے ہیں۔ وہ اس تفاوت کو محسوس کرنے کے ساتھ ہی دکھ سے بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ایک ایسا فرد جو اپنی تعلیم اور مستقبل کے خواب لے کر امریکہ میں مقیم ہوتا ہے وہ جذباتی طور پر اتنا رنجور ہوتا ہے کہ مشرق اور مغرب کے اس فرق کو ہضم نہیں کر پاتا۔ سلیم کا کردار ایک سیدھا اور سپاٹ کردار نہیں کہ محبت ہی کی تلاش میں رہے ۔ اسے اپنی تہذیب اور مغرب کی تہذیب کے تصادم کا ادراک بھی ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے فلسفوں کو بہت باریکیوں کے ساتھ سوچتا اور سمجھتا ہے وہ اپنی تہذیب سے فرار تو چاہتا ہے مگر اپنے دامن کو کبھی اس سے نہیں چھڑا پاتا، وہ امریکہ کے ماحول کو اختیار تو کرتا ہے مگر مزاج سے اپنے مشرقی پن کو نکال نہیں پاتا وہ جہنی کے ساتھ شادی کے لیے تیار تو ہو جاتا ہے مگر منزہ کی محبت دل میں کہیں نہ کہیں موجود ہوتی ہے یہ سب کے باوجود وہ ٹھہر کر رک کر اپنے ماضی حال اور مستقبل کے درمیان کوئی ربط قائم کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ وہ حالات کے مطابق اپنے آپ کو لیے جا رہا ہوتا ہے اور بالاخر واپس پاکستان آجاتا ہے جہاں اس کی محبت اس کے انتظار میں بیٹھی ہوتی ہے۔ اینا اور جینی کے کردار خالص امریکی تہذیب کے آئینہ دار ہیں اور وقت اور حالات کے

مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا جانتے ہیں۔ ان کے لیے محبت ایک جذبہ تو ہے مگر وہ اسے روگ بنانے کے قائل نہیں، ان کے ہاں پرندوں اور جانوروں کے حقوق تو تسلیم شدہ ہیں مگر یہ امریکی دہشت گردی کے نتیجے میں مارے جانے والے لاکھوں مسلمانوں کے خون پر چپ رہتے ہیں جیسے یہ ان کا حق ہو۔ ناول کی کہانی میں فکری اور فلسفیانہ مباحث بھی ملتی ہیں پلاٹ کی حد تک کہانی میں واحدت نظر آتی ہے ورنہ کہانی کا ہر موضوع الگ ایک کیفیت رکھتا ہے۔ مثلاً سلیم ایک جگہ اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں پیش کرتا ہے

"خواتین و حضرات میرے شعور کی تختی سرد جنگوں، سٹنگر اور کروز میزائلوں، کارپٹ بمبنگ، خودکش دھماکوں اور ٹارگٹ کلنگ سے عبارت ہے۔ میں اس سب کچھ سے بے نیاز ہو رہا ہوں، ہمیشہ اپنی دھن میں مگن، محبت کی کھوج میں محو، جی ہاں میں محبت کا کھوجی ہوں، ایک ایسا کھوجی جو دہشت کے موسم میں محبت کی فصل لگانے کے خواب دیکھتا ہے"[40]

یہاں سلیم کا کردار نہایت باریک طریقے سے اپنے ملک اور وطن میں خون کی ارزانیوں کا شکوہ کرتے ہوئے یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ اس جہانِ عالم کی بقا ایک ہی نقطے میں مضمر ہے اور وہ ہے محبت۔ لہذا میں محبت کا متلاشی ہوں۔ یہاں اس کی محبت ذات سے نکل کر کائنات کو اپنے لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اس کے کردار کی فکری جہت اسے عام سطح سے اٹھا کر اس سطح پر لے جاتی ہے جہاں وہ محض عورت کی محبت کا طلب گار نہیں رہتا بل کہ امن عالم کے لیے انسانی محبت کی فراوانی کا طلب گار بن جاتا ہے۔

ایم اختر کا ناول "ایک لوسٹوری ایک ایٹمی قیامت" اپنی نوعیت کا واحد ناول ہے جس میں پاکستان اور بھارت کی ممکنہ ایٹمی جنگ کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ وکرم نام کا ایک کردار جو بھارت کا ہے اور شوسینا کا سرگرم رکن ہے، اس کی فیس بک پر گفتگو پاکستانی اسامہ سے ہوتی رہتی ہے جو امریکہ میں مقیم ہوتا ہے۔ فکری لحاظ سے دونوں میں بہت بڑا فرق بتایا گیا ہے۔ وکرم کو پاکستان اور مسلمانوں سے شدید نفرت ہے جب کہ اسامہ نفرتوں اور مذہبی منافرتوں سے نکل کر انسان دوستی اور فلاح و بہبود کی توجہ کرنے پر زور دیتا ہے۔ ناول نگار نے اپنے کرداروں کے ذریعے دور حاضر کے اہم ترین مسئلے دشت گردی، جنگ اور قتل و غارت گری کو بخوبی پیش کیا ہے ۔ناول کی کہانی ایک طرف امریکہ کے ترقی یافتہ منظر کی عکاسی کرتی ہے تو دوسری طرف پاکستان جیسے تیسری دنیا کے مفلوک الحال ملکوں کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ تیسری طرف ناول نگار نے وکرم نام کے کردار سے بھارت میں پائی جانے والی ایک خاص کش مکش کو واضح کیا ہے جو اپنے من گھڑت فلسفوں اور نظریات کا نہ صرف

پر چار کرنا چاہتی ہے بل کہ اسے نافذ بھی کرنا چاہتی ہے۔ اسامہ جو کہ امریکہ میں موجود ہوتا ہے، اپنے پاکستان کے حالات کے حوالے سے سخت تشویش میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کی دوست ڈونیا جو اس کے ساتھ پاکستان کی سیر کے لیے آتی ہے وہ یہاں کی غربت، افلاس اور اخلاقی انحطاط سے شدید حیرت زدہ ہو جاتی ہے۔ یہاں ڈونیا کا کردار پاکستان کے لوگوں کے دماغوں میں موجود تناؤ، فرسٹریشن اور مضر اثرات کو بہت اچھے طریقے سے واضح کرتا ہے۔ ہمارے معاشرے کی اور لوگوں کی منافقت کھل کر سامنے آجاتی ہے جب وہ ایک پردیسی لڑکی کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کرتے ہیں۔ ان کی مسلمانیت اور حسنِ اخلاق محض زبان کی حد تک نظر آتا ہے جب کہ عملاً وہ ایک مکروہ ترین سوچ کے حامل ہوتے ہیں۔ محمد اختر نے نہایت کمال کے ساتھ پاکستان اور بھارت اور یہاں کے لوگوں کی ذہنی سطح کا ایک مکمل نقشہ پیش کیا ہے۔ شدت پسندی یہاں کے سماج کا یقینی حصہ نظر آتی ہے، کسی کی جان لے لینا کوئی بڑی بات نظر نہیں آتی، کسی پر کوئی الزام لگاو اور اسے مار ڈالو۔ ایک ایسے معاشرے کا عکس اس ناول میں نظر آتا ہے جو سسک رہا ہے، بدبو سے اٹا پڑا ہے، تعفن ہی تعفن ہے۔ ہر کردار سے سڑی ہوئی بو آرہی ہوتی ہے۔ نتاشہ جو اسامہ کی امریکی دوست ہوتی ہے وہ اگرچہ پڑھی لکھی ہے مگر اس کے خیالات پاکستان اور بھارت کے حوالے سے بہت نفرت انگیز ہوتے ہیں، نتاشہ اور اسامہ دوست ہوتے ہیں اور پیشے کے اعتبار سے دونوں صحافی۔ لہٰذا اکثر ان کے درمیان مختلف امورِ عالمی پر بحث چلتی رہتی ہے۔ نتاشہ اور اسامہ کا صحافتی کردار ان کے پروفیشنلزم کا ثبوت تھا مگر بہ طور انسان وہ بھی لطیف جذبات سے آشنا ہوتے ہیں۔ اسامہ اور نتاشہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور اسامہ اس سے شادی بھی کرنا چاہتا ہے۔ محبت ایشیائی افراد کے لیے زندگی اور موت کا تو سبب ہو سکتی ہے مگر کسی مغربی فرد کے لیے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نتاشہ ایک دوسرے امریکی لڑکے جو اس کا کزن ہوتا ہے سے شادی کر لیتی ہے اور اسامہ لاچار دیکھتا رہ جاتا ہے۔ یہاں سانتا کے کردار سے مصنف نے ایک اور اہم ترین سمت کی طرف بات چھیڑی ہے جسے عمومی طور پر اہم نہیں سمجھا جاتا سنتیا گو جس کی شادی نتاشہ سے ہوئی ہے وہ دراصل کٹر یہودی ہوتا ہے اور شیطانی طاقتوں کو اپنی طاقت اور دانش کا سرچشمہ سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قدیم جادوئی کتابوں کے چِلے کرتا ہے اور شیطان کو سجدے کرتا ہے۔ اس دور جدید میں اسرائیل کے الومناتی یہی کام کر رہے ہیں۔ ان کا ایک پورا نیٹ ورک ہے جو تحقیق کرتا ہے کہ کس طرح شیطان سے رابطہ کیا جائے اور کس طرح اس کی مدد حاصل کی جائے ؟ سانتیا گو کا کردار اس ناول میں اسی الومناتی سوچ کا مظہر ہے۔ ناول کے آخر میں پاکستان اور بھارت کی حتمی اور آخری فرضی جنگ کا تذکرہ ہے جس میں بھارت اور پاکستان نامی ملک دنیا کے نقشے سے مٹ جاتے ہیں اور ان

کی جگہ برباد اور تباہ شدہ زمین رہ جاتی ہے جہاں زندگی کے کوئی آثار نہیں ملتے۔ کہانی کے کردار اپنی اپنی جگہ کہانی کے مختلف پہلوؤں کو بہ خوبی سر انجام دے رہے ہیں۔ نفرت، محبت سیاست، جمہوریت، جنگ، خانہ جنگی غرض ہر بحث کو کرداروں کے ذریعے بخوبی پیش کیا گیا ہے۔ناول میں بیان کی ایک جدیس ترکیب استعمال کی گئ ہے، اس ترکیب کے استعمال کے لیے وکرم کا کردار اہم سمجھا جا سکتا ہے جو اسامہ کے ساتھ فیس بک مسینجر کے ساتھ گفتگو کرتا ہے۔ اپنی نوعیت میں یہ اردو ناول میں ایک اہم پیش رفت ہے۔ ناول میں اس کا ذکر یوں کیا گیا ہے۔

> "میں فیس بک پر آن لائن تھا میری توقع کے مطابق وکرم بھی آن لائن ہوا۔ میری وکرم کے ساتھ فیس بک پر کئی ہفتوں سے طویل چیٹ چل رہی تھی۔ عکرم دہلی میں مقیم تھا اور میں لاہور سے تعلق رکھتا تھا۔ ۔۔۔۔۔۔۔ میں اس وقت فارغ لمحات میں فیس بک چیٹ میں مصروف تھا، ان دنوں فیس بک پر چیٹ کی وبا عام تھی" [41]

ناول نگار نے اپنے کرداروں کے ذریعے اس نیے ابلاغی ٹول کو استعمال کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ نکہت حسن کا "جاگنگ پارک" ناول محض پارک نہیں بل کہ کرداروں کی ایک آماج گاہ ہے۔ یہ پارک ایک گھر یا ایک ملک کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ زبیدہ اس ناول کا اہم کردار ہے جو اپنا وزن کم کرنے کے لیے پر میں جاگنگ کے لیے جاتی ہے رہتی ہے۔ اسے یہاں دنیا بھر کے موضوعات سننے کو ملتے ہیں۔ جہاد، سیاست، الیکشن،، جمہوریت، عدل و انصاف کی ابتری، امریت، زندہ باد مردہ باد وغیرہ جیسی مختلف انواع و اقسام کی آوازیں اس پارک کی فضا میں سنائی دیتی ہیں۔ ہر انسان اپنی اپنی بولی بولے جا رہا ہے، کسی کو کوئی قرار نہیں، سکون نہیں، سب بھاگے چلے جا رہے ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ سارے کا سارا ماحول کسی آفت کے اندر گھرا ہوا ہے جس سے چھٹکارا پانے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ سماجی صدمات (ٹراما) اس قدر ہیں کہ کوئی فرد بھی نارمل سوچ نہیں رکھتا۔ بل کہ شدت پسندی کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ زبیدہ کا کردار دراصل مصنفہ کا وہ مہرہ ہے جس کے ذریعے وہ سماجی ہیجان، اضطراب ٹراما اور بے چینی کو بیان کرنے کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ ملک پاکستان کے عوام کی سوچ اور فکر کا ابلاغ کرتا ہوا یہ ناول اپنی نوعیت کا منفرد ناول ہے جس میں ہر موضوعِ زندگی کو چھیڑا گیا ہے۔ صحافت ہو یا سیاست، مذہبی منافرت ہو یا بم دھماکے، نائن الیون کے اثرات ہوں یا تیز رفتار مشینی ترقی، ہر ہر زاویے کو پارک کے اندر مختلف کرداروں کی زبانی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا ناول "قلعہ جنگی" افغانستان کے جہاد کے دوران چند مجاہدین کی مشکلات کا عکس نامہ ہے۔

چند مجاہد جو مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی تہذیب اور ثقافت بھی الگ ہوتی ہے، مگر ایک قلعے کی تہ میں پڑے موت کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ تارڑ نے ان کرداروں کے ذریعے افغانستان کے اندر انسانی جانوں کے ضیاع اور امریکہ کی افغانستان پر بے رحم بمباری کا ذکر کیا ہے۔ مجاہد دین کا یہ دستہ نہایت زخمی حالت میں ہوتا ہے، موت ان کے قریب تر ہوتی ہے، کھانے کو کچھ نہیں ہوتا، ایک گھوڑے کو یہ لوگ مارتے ہیں کہ کھایا جاسکے مگر ان کے جسموں میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اسے کھا سکیں۔ بالاخر یہ کردار ایک ایک کر کے مر جاتے ہیں۔ ان چند کرداروں کے ذریعے ناول نگار نے افغانستان کے جہاد کے دوران اس طرح کے پیش آنے والے ہزاروں واقعات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ قلعہ جنگی میں ان چند مجاہد کرداروں کے ذریعے جو نقشہ پیش کیا گیا ہے حالات حقیقت میں ان سے بھی بدتر گزرے ہیں۔ ناول ان چند کرداروں کی کہانی نہیں بل کہ پوری تاریخ ہے، ایک پوری تلخ حقیقت ہے جو وقت اور حالات کی گرد کے نیچے ہمیشہ کے لیے چھپ چکی ہے۔ ناول نگار جس صورت حال کو قلعہ جنگی کے مجاہد کرداروں سے واضح کرنا چاہتا تھا وہ اس نے بہ خوبی پیش کی ہے۔ کہانی کا اختتام مجاہدوں کی موت کے ساتھ ہوتا ہے جو ایک ایک کر کے مر رہے ہوتے ہیں ناول کے اخری الفاظ اس ناول کی ساری کہانی کو بہت عجیب اور دل گرفتا انداز میں پیش کرتے

> "بلخ کے کھنڈروں پر میں بر آجمان آتش پرست کی آگ بھڑکی اور بجھ گئی، کیا ایک ہزار برس بعد قلعہ جنگی کے اس تب تک زمین میں دفن ہو چکے تہ خانے کے اندر جو موجود ہڈیاں ہوں گی؟ ان کی بازیابی کے لیے بھی کسی کو خواب آئے گا؟ کہ ہم یہاں دفن ہیں اور ہمیں کوئی کھود نکالے گا اور اسی تہ خانے کے اوپر ایک اور مزار شریف وجود میں آئے گا"[42]

یہ وہ گمنام مجاہد ہیں جن کی ہڈیاں بھی آج تک نہ مل سکی اور جو ڈیزی کٹر بموں سے پانی بن کر اڑ چکے ہیں۔ "طاوس فقط رنگ" ناول کے کردار مشتر کہ تہذیب کے آئینہ دار نظر آتے ہیں۔ پاکستانی نژاد مراد اور اس کے ماں باپ دوسری تہذیب کے بے رحم پنجوں میں آئے سسکتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مراد کے ماں باپ اچھے مستقبل کے خواب لیے امریکہ آتے ہیں اور یہیں کی شہریت حاصل کرتے ہیں۔ مگر وہ اپنی پاکستانی تہذیب اور ثقافت سے اپنا دامن کبھی نہ الگ کر سکے۔ ان کی اولاد بیٹا اور بیٹی امریکی شہری ہوتے ہیں اور ان کی وہ جذباتی وابستگی پاکستان سے نہیں ہوتی جو ان کے ماں باپ کی ہوتی ہے۔ مراد ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں جاب کرتا ہے جہاں اس کا پاکستانی دوست اسفند بھی ہوتا ہے۔ یہاں ان کی ایک امریکی کولیگ ڈیلائلہ ہوتی ہے جو بہت

پر اسرار شخصیت کی حامل ہوتی ہے۔ مراد دراصل اس نسل کا نمائندہ ہے جو پیدا تو امریکہ میں ہوئی مگر ان کے ماں باپ مسلمان اور ایشیائی ممالک سے ہوتے ہیں۔ مراد اور اس کی بہن کا کردار اور ان کی سوچ و فکر اور زندگی کے حوالے سے ان کا نقطہ نظر اسی گروہ کی ترجمانی ہے جو بہ طور امریکی، امریکہ میں پروان چڑھی۔ اس نسل کے مفادات، خیالات اور افکار خالص امریکی ساخت سے جڑے ہوتے ہیں۔ ان کا وطن امریکہ ہوتا ہے اور وہ بہ طور امریکن ہی اپنے آپ کو گردانتے ہیں۔ ناول نگار نے ان کرداروں کے ذریعے دو اہم نکات کو کہانی میں سمجھانے کی کوشش کی ہے

یہ کہ امریکہ میں پیدا ہونے والے ایشیائی ماں باپ کی اولادیں خالص امریکی تہذیب اور ثقافت سے دلچسپی رکھتی ہیں اور امریکہ ہی کو اپنا حقیقی وطن تسلیم کرتی ہیں۔ مابعد نائن الیون ایشیائی نژاد امریکی نسل کو جس تعصب اور ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑا وہ بھی مصنف نے ان کرداروں کے ذریعے بہت اچھے طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ نائن الیون کے بعد کا دور امریکی مسلمانوں کے لیے نہایت اعصاب شکن رہا ہے ۔ طاوس فقط رنگ میں اسی طرح کی ایک فیملی کے حالات کو پیش کر کے اس صورت حال کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کا سامنا مابعد نائن الیون امریکہ یا دیگر مغربی ممالک میں مسلمانوں کو کرنا پڑا۔ ڈاکٹر بی بی امینہ "طاؤس فقط رنگ" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

> "طاؤس فقط رنگ میں 11 ستمبر کے حادثے کے نتیجے میں متاثرین کی بدلتی ہوئی نفسیات اور معاشی مسائل کا تذکرہ ہے جس میں امریکہ بورن (American Born) کہلائے جانے کے باوجود تعصب کا نشانہ بننے والوں کی مشکلات اور معاشی مسائل کے ذکر کرنے کے علاوہ امریکہ میں رہنے والے مہاجر نسلوں کی تاریخ سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سوشل میڈیا، فیس بک انٹرنیٹ اور سائبر کرائم اور ہراسمنٹ جیسے عناصر سے بننے والی جدید اور عجیب و غریب دنیا کو بھی ناول میں سمویا گیا ہے"[43]

مراد کا کردار یہاں اسی کش مکش کو بہ خوبی عیاں کرتا ہے جس کو نائن الیون کے بعد امریکی شہری ہونے کے باوجود سخت بحران کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اسے کہیں پر ملازمت نہیں مل رہی ہوتی کہ وہ مسلمان ہے۔ اسے دہشت گرد قرار دے کر جیل میں بھی ڈالا جاتا ہے۔ مراد یہاں جذباتی لحاظ سے شدید ٹراما سے دوچار ہو جاتا ہے کہ وہ تو امریکی شہری ہے اور اس کے ساتھ ایسا متعصبانہ رویہ کیوں رکھا جا رہا ہے؟ وہ کیوں گوروں کے

عتاب کا نشانہ بن رہا ہے؟ مثلا ایک جگہ وہ ملازمت کے لیے جاتا ہے تو اس اس کی پروفائل چیک کرتے ہوئے اسے شیری نامی امریکی لڑکی کہتی ہے کہ

"تمہارا کوئی کریمنل ریکارڈ ہے تو میں کمپیوٹر پر چیک کر لوں گی۔ ویسے میں ایف۔ ا۔بی (F.O.B) فریش آف دابوٹ Fresh of the boat (لوگوں پر آسانی سے اعتماد نہیں کرتی سمجھے !ایف۔ او۔بی کا سن کر مراد یوں چونکا جیسے اسے کسی نے گالی دے دی ہو۔ اس کے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ اسے پتا تھا کہ ایف او بی ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو بذریعہ کشتی غریب ملک سے امریکہ میں آئے ہوں۔"[44]

یہ جملہ اس کے لیے نہایت قابل برداشت تھا کیوں کہ وہ تو پیدائشی امریکی تھا۔ نیلم احمد بشیر نے بہت کمال سے اس نسل کے تلخ تجربات کو جو انھیں مابعد نائن الیون پیش آئے کو پیش کیا ہے۔ مراد اور اس کی بہن کنول کی غیر جذباتیت اور روکھا پن بھی اس کہانی میں ایک اہم نکتہ ہے۔ ہم مشرقی لوگ اپنے تعلق رشتے ناطے کے حوالے سے بہت جذباتی ہوتے ہیں مگر مراد اور کنول جس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں وہ خالص امریکی ماحول کی عطا کردہ ہے۔ ان کے اندر سپاٹ پن، روکھا لہجہ، جذبات میں سطحیت وغیرہ پائی جاتی ہے۔ مراد اور کنول کے ماں باپ پاکستانی ہیں لہذا وہ اپنی اولاد سے وہی توقع رکھتے ہیں جو پاکستانی ماں باپ کو اپنی اولاد سے ہو سکتی ہے۔ مگر ان کو اس حوالے سے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ ان کے بچے یکسر غیر جذباتی رویے کے حامل ہیں۔ یہ بھی ایک اہم نکتہ ہے جس کو مصنف نے بہت دلکش طریقے سے واضح کیا ہے۔ مغربی ممالک میں رہائش پذیر لوگوں کو جہاں دیگر مسائل کا سامنا کرنا پڑا وہی ان کو اولاد سے محبت، احترام اور وابستگی کی امید کے حوالے سے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ مراد اور کنول کے کردار خالص مادیت پرست سماج کے نمائندہ ہیں جن کو جذبات و احساسات کی گہرائی سے کوئی واسطہ نہیں۔ ناول کے باقی کردار امریکی ہی ہیں جو مختلف نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہیں اور انسانوں کو مطلب کے مطابق استعمال کرنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔

"میں ایک دہشت گرد ہوں" محسنہ جیلانی کا مختصر ناول ہے جس میں مغرب میں رہائش پذیر مسلمان فیملیز کو مابعد نائن الیون جن مسائل اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ زرینہ کا کردار دراصل دو تہذیبوں کی کش مکش اور ٹکراؤ کا آئینہ دار ہے جیسا کہ ناول کے شروع میں ایک تبصرے میں واضح کیا گیا ہے دو پاٹوں کے بیچ پسی ہوئی

برٹش مسلم زرینہ کی کہانی ناولٹ "میں دہشت گرد ہوں "ایک میں ایک عالمی استفامیہ کی صورت پیش کی گئی ہے"[45]

کرداری لحاظ سے یہ ناول تین طرح کی فکر رکھنے والے کرداروں پر مشتمل ہے پہلے نمبر پر وہ کردار جو بہتر مستقبل کے لیے ہجرت کر کے برطانیہ آباد ہوئے مگر اپنے دل سے اپنے وطن کی محبت نہ ختم کر سکے۔ دوسرے نمبر پر ان کی برطانیہ میں پیدا ہونے والی برطانوی شہری اولادیں ہیں جن کی نمائندہ زرینہ اور اس کا بھائی حامد ہے۔ یہ ذہنی اور فکری لحاظ سے مکمل برطانوی ہیں مگر ان کی پشت پر ماں باپ کی صورت میں پاکستانی مزاج لوگ موجود ہوتے ہیں۔ تیسری نسل وہ نسل ہے جس کے ماں باپ بھی برطانیہ میں پیدا ہوئے اور وہ مکمل برطانوی پس منظر کی حامل نسل کہلاتی ہے۔ اس ناولٹ میں ان تینوں نسلوں کے طرز فکر اور طرز زندگی کو ایک پاکستانی خاندان اور ان کے بچوں کی مدد سے پیش کیا گیا ہے۔ زرینہ اپنے آپ کو مکمل برطانوی شہری سمجھتی ہے مگر افسوس کہ اسے نائن الیون اور خصوصا لندن بم دھماکوں کے بعد سخت نسلی تعصب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے جذبات کو اس وقت سخت ٹھیس پہنچتی ہے جب اسے دہشت گرد کہہ کر چھیڑا جانے لگا۔ وہ شدید ذہنی اور جذباتی صدمے کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ اس کرب میں مبتلا ہوتی ہے کہ کس جرم میں اسے دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے حالاں کہ وہ خود دہشت گردانہ حملوں کی نہ صرف مذمت کرتی ہے بل کہ اس کو غیر انسانی فعل قرار دیتی ہے۔ زرینہ کا کردار ان ہزاروں لڑکیوں کی نمائندگی کرتا ہے جو بعد از نائن الیون کسی مغربی مملک میں مقیم تھی اور جن کو نسلی تعصب کا سامنا کرنا پڑا۔ محسنہ جیلانی خود برطانیہ ہی میں مقیم ہیں اس لیے انہوں نے بہت گہری نظر سے ان حالات و واقعات کا مطالعہ کیا جن میں برٹش مسلم بری طرح مبتلا ہوے۔ انھوں نے زرینہ نام کے کردار کے ذریعے ان تمام کیفیات کو بیان کیا ہے جو ممکنہ طور پر برطانوی مسلم لوگوں کو پیش آتی رہی ہیں۔ زرینہ کے کردار سے جس بات کو اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یورپ اور امریکہ جتنے مرضی ترقی کر لیں، جتنے مرضی تہذیب یافتہ ہو جائیں مگر ان کے اذہان میں اسلام دشمنی اور مسلمانوں کی نفرت کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ ناول کے اس ٹکڑے سے زرینہ کے کردار کے ذریعے اس بات کی وضاحت بہ خوبی ہو جاتی ہے۔

"لائبریری میں لوگ بدل گے تھے، ان کا ان کا رویہ بدل گیا ہے۔ جین ایوا اور جولٹ نے گلیوں میں صلیبیں پہن لی ہیں اوشا، نرملا نے ماتھوں پر بندیاں لگانا شروع کر دی ہیں، حجاب پہننے والی لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ کیسا عذاب ہے حجاب

پہنے والی لڑکیاں نسل پرستوں کا نشانہ بن رہی ہیں، اسلاموفوبیا تیزی سے پھیل رہا ہے ، نفرتیں بڑھ رہی ہیں، جان پہچان والے بہت سے لوگوں نے اپنے نام بدل لیے ہیں۔ صائمہ سارا ہو گئی جمیلہ اپنے آپ کو جینی کہلانے لگی ہے اور لیلی اپر اب للی کے نام سے جانی جاتی ہے، لیاقت لی ہو گیا ہے اور سمیر نے اپنا نام بدل کر سیم رکھ لیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کس قدر ڈر رہے ہیں خوفزدہ ہیں ساری دنیا جیسے اجنبی ہو گئی۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے دہشت طاری رہتی ہے "[46]

انصاف کے علم بردار یہ معاشرے اس معاملے میں منافقت کا شکار ہو جاتے ہیں اور تعصب کی رو میں بہہ کر بے قصور لوگوں کو اپنے تعصب اور نفرت کا نشانہ بناڈالتے ہیں۔ زرینہ اس قدر نفرت اور تعصب کا نشانہ بنتی ہے کہ وہ اپنے حواس کو بیٹھتی ہے اور جذباتی ٹروما کا شکار ہو جاتی ہے۔

عبدالصمد نے اپنے ناول "جہان تیرا ہے یا میرا" میں راشد کے کردار سے اس صدی کے اہم مسائل کو بیان کیا ہے۔ یہ مسائل یقیناً وہی ہیں جو کابیاں دیگر اور اردو ناولوں میں کیا گیا ہے۔ لیکن عبدالصمد نے ہندوستان کے مخلوط معاشرے کی نفسیات اور انتشار کو بھی پیش کیا ہے۔ بھارت میں بے شمار مذاہب کے لوگ رہ رہے ہیں مگر اقلیت ہونے کی وجہ سے انھیں جس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ بہت اذیت ناک ہے۔ ناول میں ایک غریب گھرانے کی زندگی کا نقشہ پیش کیا ہے۔ راشد جو ایک پڑھا لکھا انسان ہوتا ہے، کو ملازمت کے سلسلے میں سخت تعصب اور نفرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ راشد کا کردار فکری اور کرداری لحاظ سے ایک کامیاب کردار گردانا جاسکتا ہے جس کی بدولت ہم بھارت کے اندر بسنے والے غریب مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کی زبوں حالی اور ان کی نفسیاتی کیفیات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وہ مسلمان جو بھارت کو اپنا حقیقی اور اصلی وطن سمجھتے ہیں انھیں اپنی حب الوطنی ثابت کرنے کے لیے ثبوت اور دلائل دینا پڑتے ہیں۔ راشد کا کردار دو حصوں میں تقسیم ہے پہلے حصے کا تعلق بھارت اور اس کی سرزمین سے ہے اور دوسرے حصے کا تعلق مابعد نائن الیون امریکا کی سرزمیں سے ہے۔ ناول نگار اس کردار کے ذریعے جس سوچ، فکر یا فلسفے کو بیان کرنا چاہتا تھا وہ اس کردار نے بہ خوبی نبھایا ہے۔ یہ کردار ایک طرف معاشرتی عدم مساوات کو بیان کرتا ہے تو دوسری طرف غربت سے لڑنے والے ایک باہمت اور محنتی شخص کی خبر بھی دیتا ہے جو اپنے خاندان کی خوش حالی کے لیے صبر، ہمت اور برداشت سے کام لیتا ہے اور آخری دم تک مایوس نہیں ہوتا۔ راشد کو جب اقلیتی کالج سے نکال دیا جاتا ہے تو وہ

بجائے مایوس ہونے کے ٹیوشن سینٹر کھول کر روٹی روزی کا بندوبست کرتا ہے۔ پرنسپل نے جب اسے کالج سے نکال دیا تو اس ے اپنی دنیا لٹتی ہوئی محسوس ہوئی

> "راشد کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ نہ زمیں پر ہے نہ آسمان پر بل کہ خلاوں میں کہیں اٹکا ہوا ہے۔ وہ چاروں طرف ہاتھ پاوں مار رہا ہے مگر اسے کہیں قرار نہیں تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنا توازن بر قرار رکھنے میں بھی ناکام ہو جاتا اور وہی لمحہ اس کے شعور میں ایک تیز گھنٹی بجا دیتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے قدموں نے زمین کیسے چھوڑ دی اور کیوں کر وہ ہواؤں میں معلق ہو گیا۔"[47]

راشد کے یہ احساسات اس نوجوان پڑھے لکھے انسان کی پھر پور ترجمانی ہیں جو ہر سمت سے ہار کر نا امیدی کے اندھیروں میں جا رہا ہو۔ وہ پھر ایک امید کے ساتھ اٹھتا ہے اور اپنی اور اپنے گھر والوں کی خوب صورت زندگی کے خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہے اور نئی جدوجہد کے اندر اپنے اپ کو جھونک دیتا ہے۔ بھارت کی سرزمیں پر راشد ایک محبت کرنے والے نوجواں کے طور پر بھی نظر آتا ہے۔ افرین اس کی محبت ہوتی ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ جلد از جلد ایک مستحکم معاشی صورت حاصل کرے تا کہ افرین کو اپنا بنا سکے۔ راشد کو باوجود قابلیت کے ایک کمپنی سے اس لیے پھر نکال دیا جاتا ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ یہاں ناول نگار نے راشد کے کردار کے ذریعے بھارت کے ہندووں کی ایک فکر کو پیش کیا ہے کہ وہ بھارت میں ہونے والے تمام فسادات کی جڑ مسلمانوں کو سمجھتے ہیں۔ راشد کا کمپنی کے مینجر سے مکالمہ اس ساری صورت حال کو بہت اچھت سے بیان کرتا ہے۔

> "راشد نے جب منیجر سے بات کی تو منیجر کا لہجہ پڑا سپاٹ تھا کیسے ہیں راشد صاحب۔۔۔؟ اچھا ہوں سر، آپ کی دعا ہے، مگر میں تو آپ کے حکم سے برخواست کر دیا گیا ہوں۔۔۔ مدعا فورا اس کی زبان پر آگیا منیجر کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہاں۔۔۔ وہ تو ہماری مجبوری تھی ۔۔۔اس نے پھر سوال کرنے کی ہمت کی۔" میں جان سکتا ہوں کہ کیا مجبوری تھی"" ارے بھائی آپ جانتے ہیں ہماری فرم پرائیویٹ ہے ہم جس کے کام سے مطمئن نہیں ہوتے یا کسی وجہ سے اسے بر قرار رکھنا نہیں چاہتے اسے ہٹا دیتے ہیں آپ دیکھیے آپ کے تقرر نامے پر بھی یہی درج ہے"۔ مینیجر کا لہجہ ایسا پر سکون تھا جیسے کوئی خاص بات نہیں ہے۔" مگر آپ تو میرے کام سے بہت مطمئن

تھے سر آپ نے ترقی دلانے کا وعدہ کیا تھا"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"آپ کو پتہ نہیں کہ رام گاڑھ میں بم بلاسٹ ہوا ہے اور بہت سے لوگ مارے گئے ہیں"۔۔"پتا ہے سر خوب پتا ہے مگر اس سے میری برخاستگی کا کیا تعلق؟ منیجر کا لہجہ پوری طرح بدل گیا اس کا مطلب ہے آپ واقعی بن رہے ہیں "مسٹر راشد آپ کو نہیں معلوم کہ اس بلاسٹ کے سلسلے میں جن چار لڑکوں کو گرفتار کیا گیا ہے وہ سب کے سب آپ کے ہم مذہب تھے انجینئر تھے اور اہم فرموں میں ذمہ دار عہدوں پر فائض تھے" آخری تین چار جملے مینیجر نے یوں چبا چبا کر ادا کیے کہ راشد کے جسم میں ایک ٹھنڈی لہر دوڑ گئی"[48]

یہ وہ خاص فکر ہے جسے ناول نگار سامنے لانا چاہتا ہے کہ کس طرح بغیر کسی ثبوت کے مسلمانوں کی وطن پرستی پر شک کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جب راشد حالات سے مایوس ہو کت امریکا جاتا ہے تو یہاں اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا ہے جو نائن الیون کے بعد امریکا میں مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا گیا۔ امریکا میں راشد کی سوچ، فکر مکالمے وغیرہ اس سنگیں صورت حال کا عکس ہیں جو بہ طور مسلمان امریکا کی سرزمیں پر ہر ایک کو سہنا پڑے۔ ناول کے دیگر کردار ضمنی معلوم ہوتے ہیں قدیر کا کردار بھی امریکا میں مسلمانوں کے حوالے سے پائے جانے والے خیالات کی عکاسی ہے۔ اس کے علاوہ بہ طور باپ راشد کا والد ایک اچھے اور دانش مندانہ کردار کا حامل بتایا گیا ہے جو اپنے بیٹے کے بہت سے سوالوں کے بہت دانش سے جواب دیتا ہے اور مطمئن کرتا ہے۔

عصرِ حاضر کے ناولوں میں بیانیے کا تنوع ہے۔ ایک مصنف کے لکھنے کے لیے بے شمار موضوعات ،فلسفے اور نظریات دستیاب ہیں۔ کرداروں کی نفسیات کے لحاظ سے بھی معاصر اردو ناول متنوع کیفیات رکھتا ہے۔ عام گھریلو زندگی کی سرو سامانیوں کے بیان سے لے کر عالمی سطح تک کے تمام بڑے بڑے معاملات بھی ناول میں کہانی کا حصہ بن کر کرداری طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔۔ڈاکٹر فخر الکریم اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

"ناول نگاروں نے اپنی پیش کش میں تاثیر پر خاص نظر رکھی ہے جو ناول کے ہر موڑ پر نمایاں ہے اور سب سے اچھی بات یہ نظر آتی ہے کہ چھوٹے فریم ورک میں بھی ناول کے موڑ سمیٹنے کی بجائے خاص متحرک ہیں"[49]

ناول کرداری لحاظ سے متنوع مزاج کردار کا حامل ہیں یہ کردار جہاں روایتی جذبوں سے آشنا نظر آتے ہیں وہی یہ جدید فکر و نظر اور جدید فلسفہ و نظریات کے سے بھی جڑے نظر آتے ہیں جدید ذرائع ابلاغ

یعنی انٹرنیٹ ،فیس بک، انسٹاگرام ،واٹس ایپ جیسے سوشل میڈیا کے استعمالات بھی ان کرداروں کی خصوصیات میں شامل ہیں نیا زمانہ نئے تقاضے نیا انداز تحریر اور نیا طریقہ بیان ناولوں کی ادائیگی اور متن کی پیشکش میں نظر آتا ہے ڈائری خط وغیرہ کے طرز بیان سے نکل کر آج کے ناول نگار ای میل فیس بک انسٹا اور واٹس ایپ جیسے ابلاغی طریقوں کو آزمارہے ہیں اور اپنے کرداروں کو جدت سے ہم آمیز کر رہے ہیں۔ اردو ناول بہت خوبی کے ساتھ تمام حالات وواقعات کو بیان کر رہے ہیں۔

حوالہ جات

1. یوسف حسن، ادبی ترقی پسندی کے چند فکری اور فنی مباحث، مشمولہ، تاریخ، تہذیب اور سماج، مرتبہ، قاسم یعقوب، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، 2015، ص15
2. ایضا ص1
3. 3انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کتابی دنیا، دہلی، 2004، ص34
4. ایضا ص39
5. ایضا ص39
6. مولانا صلاح الدین احمد، اے ادب تو ایک گوہر بار، مشمولہ، ادبی دنیا، جلد پنجم، شمارہ، دوم، ص 1
7. جلیل عالی، تخلیق، تنقید، اور ہمارے فکری رویے، مشمولہ، تاریخ، تہذیب اور سماج، قاسم یعقوب، ص29
8. سائرہ ارشاد، داکٹر، نائن الیون دنیا اور اردو افسانے کے تخلیقی رجحانات، فکشن ہاؤس، لاہور، 2023، ص7
9. روبینہ سلطان، تین نیے ناول نگار، دستاویز پبلیشرز، لاہور، 2012، ص9
10. مجنوں گورکھ پوری، ادب اور زندگی، اردو گھر، علی گڑھ، 1984، ص37
11. ایضا ص39
12. .Nigan Haidry zad, "The significant Role of Trauma in literature and
13. Psychoanalysis "Islamic Azad University Solman, Iran,2014, page 788.
14. .Nasrullah Membrol,Trauma Studies, Blogstats, 2018,page1
15. . Same page 1
16. .Richard Gross, Psychology ,The science of mind and behaviour,Hodder Education ,UK. Page 4

17. . Nasrullah Membrol, Trauma Studies, Blogstats, 2018, page1

18. .J.Roger Kurtz, Trauma and Literature" Cambridge University Press Uk,200 p1

19. . . Nasrullah Membrol, Trauma Studies, Blogstats, 2018, page1

20. جمیل جالبی،ڈاکٹر، تاریخِ اردو ادب، مجلسِ ترقی ادب،لاہور،1995،ص27

21. قاسم یعقوب،ڈاکٹر،اردو شاعری پر جنگوں کے ثرات، سٹی بک پوائنٹ، کراچی،2015،ص:15

22. قاسم یعقوب،ڈاکٹر،اردو شاعری پر جنگوں کے ثرات، سٹی بک پوائنٹ، کراچی،2015،ص:1

23. جمیل جالبی،ڈاکٹر، تاریخِ اردو ادب، مجلسِ ترقی ادب،لاہور،1995،ص1

24. ایضاص27

25. علامہ اقبال،ڈاکٹر، بالِ جبریل،ص۔۔۔۔

26. قاسم یعقوب،ڈاکٹر،اردو شاعری پر جنگوں کے ثرات،ص

27. .http//www.enviorsagainstwar.org.Envioronment lists against war.

28. . Massimiliano Bratti, Hard to forget, The long-lasting impact or war on mental health, Discussion, paper, Germany,2015, page 5,

29. سید فضل اللہ، جنگِ عظیم اول، دارالشعور پبلیشرز،لاہور،2008،ص:331

30. . Ford DG, Posttraumatic stress disorder scientific and professional dimensions, Leviers, Page 13

31. . Britannica, T. Editors of Encyclopedia. " Persian Gulf War "Encyclopedia Britannica, January 9, 2021. Https://www.britannica.com/event/Persian-Gulf-War

32. . Muhammad Samiullah, " Contemporary Western Approaches towards Radical Islamic Movements: the case of Bernard Lewis and J L Esposito,"

.33 . Gilles Kepel and jean-Pierre Minelli, eds., Al-Qaeda in its Own Words" (Cambridge: Harvard university press, 2008), page 55

.34 نجیبہ عارف، نائن الیون اور پاکستانی اردو افسانہ، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۱۱، ص ۱۲، ۱۱

.35 Mohsin Hameed, The Reluctant Fundamentalist, page,5

.36 ایضاص 94

.37 William Gibson, Pattern Recognition, page 90

.38 نجیبہ عارف، نائن الیون اور پاکستانی اردو افسانہ، ص۱۹

.39 -ایضاً، ص ۲۰

.40 حمید شاہد، گزشتہ چند برس اور اردو ناول، مشمولہ ادبیات، خصوصی نمبر: اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ، شمارہ 24،123، جنوری تا جون 2020، ص30

.41 بشیر احمد قادری، اردو ناول کے کردار، مشمولہ ادبیات، خصوصی نمبر: اص88

.42 فخر الکریم، ڈاکٹر، اکیسویں صدی میں اردو ناول چند مباحث، ادبیات، خصوصی نمبر: ، ص50

.43 محمد شیر از دستی، ساسا، عکس پبلیشرز، لاہور، 2019، ص149

.44 مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، سنگِ میل پبلیشرز، لاہور، 2008، ص 21

.45 بی بی امینہ، ڈاکٹر، اکیسویں صدی اردو ناولوں میں سماجی اور اقتصادی عدم مساوات، مشمولہ ادبیات، خصوصی نمبر: اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ، ، ص30

.46 نیلم احمد بشیر، طاوس فقط رنگ، سنگِ میل پبلیشرز، لاہور، 2017، ص52

.47 ایم اختر، ایک لوسٹوری ایک ایٹمی قیامت، فکشن ہاؤس، لاہور، 201 ص 13

.48 محسنہ جیلانی، میں دہشت گرد ہوں، شہزاد پبلیشرز، کراچی، 2008، ص7

.49 عبد الصمد، جہاں تیرا ہے یا میرا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2018، ص23

.50 ایضا ص5،

.51 فخر الکریم، ڈاکٹر، اکیسویں صدی میں اردو ناول چند مباحث، ادبیات، ص49

باب چہارم

ٹراما کی دیگر جہات اور مابعد نائن الیون اردو ناول

الف۔ تمہید:

ٹراما کسی شخص کی نفسیاتی اور جذباتی شکست و ریخت کی وہ صورتِ حال ہے جس میں مبتلا شخص شدید دباؤ محسوس کرتا ہے اور اس دباؤ کا سبب عموما کوئی حادثہ، سانحہ یا واقعہ ہوتا ہے۔ ٹراما کے اثرات انسان کے نارمل جذبات اور احساسات، فکر اور نفسیات کو اس طرح مغلوب کرتے ہیں کہ وہ ایسا دباؤ اور تناؤ محسوس کرتا ہے کہ اس کی قوت برداشت جواب دے جاتی ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ٹراما کی وجہ سے انسانی رد عمل صرف نفسیاتی اور جذباتی ہی نہیں ہوتا بل کہ جسمانی طور پر بھی رد عمل کا اظہار کر سکتا ہے.

ب۔ نفسیاتی اور جذباتی ٹراما :

کسی واقعے کے بعد انسانی رد عمل اس بات کا تعین کرتا ہے کہ واقعہ تکلیف دہ ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو اس کی شدت کیا ہو سکتی ہے؟ نفسیاتی یا جذباتی صدمہ در حقیقت کسی سنگین واقعے کا رد عمل ہوتا ہے جس میں فرد جذبات کو پیش کرنے، بیان کرنے یا درست ترتیب دینے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ یہ ناکامی اس کو اس طرح صدمے کا احساس دلاتی ہے کہ وہ نفسیاتی لحاظ سے بھی انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس انتشار کے درج ذیل مضمرات انسان کی شخصیت میں نمودار ہوتے ہیں۔

1. متاثرہ فرد اپنے جذبات میں شدت اور بے ترتیبی محسوس کرتا ہے۔
2. متاثرہ فرد وقوع پذیر سانحے کے بعد عدم تحفظ کا شکار ہو جاتا ہے۔
3. انسان کے دماغ میں مسلسل خوف اور ڈر کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔
4. ایک ایسی ہیجان آمیز نفسیاتی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ جو کسی طرح بھی ایک نارمل انسان کی نہیں ہو سکتی اور جو متاثرہ فرد کی قوت برداشت کو تباہ کر دیتی ہے۔

پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ یہ واقعات جو شدید ہوں اور انسانی جذبات اور نفسیات کو بری طرح متاثر کرتے ہوں انسانی اور قدرتی ہو سکتے ہیں۔ قدرتی واقعات میں زلزلے، طوفان، اموات وغیرہ شامل ہیں اور

انسان کے پیدا کردہ حادثات میں جنگ، دہشت گردی، جنسی استحصال وغیرہ شامل ہیں۔ نفسیاتی اور جذباتی ٹراما کی تعریف ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے۔

" کسی نہایت تکلیف دہ واقعے کا وہ نتیجا جو کسی فرد کو فوری طور پر جسمانی، ذہنی یا جذباتی طور پر شدید نقصان پہنچائے اور اسے نفسیاتی اور جذباتی لحاظ سے مفلوج کر دے نفسیاتی یا جذباتی ٹراما کہلاتا ہے"

جذباتی اور نفسیاتی ٹرومے کو مزید ان الفاظ میں بھی واضح کیا جاسکتا ہے

"ٹراما یا صدمہ کسی فرد کے جذبات اور نفسیات کے حوالے سے وہ تکلیف دہ تجربہ ہے جس کے نتیجے میں وہ جذباتی اور نفسیاتی طور پر عمومی یا نارمل برتاؤ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے "

یہ صدمہ کوئی ایک بھی ہو سکتا ہے یا واقعات کی کا ایک سلسلہ بھی ہو سکتا ہے جو کسی کے جذبات و احساسات کو مجروح کر دیتا ہے۔ ٹراما کے اثرات کا تعلق جہاں واقعے کی شدت، نوعیت اور کیفیت پر ہوتا ہے وہیں انسان کے مزآج صحت اور شخصیت پر بھی ہوتا ہے۔ ہر انسان کا ایک ہی حادثے کے بعد رد عمل بالکل مختلف ہو سکتا ہے لہذا ہر انسان کی نفسیات اور جذبات بھی ٹرومے سے متاثر ہونے کی الگ الگ کیفیت رکھتی ہے۔ ٹراما کے اثرات قبول کرنے یا نہ کرنے میں انسان کی قوت ارادی کا بھی بہت عمل دخل ہے، ایک انسان کسی واقعے سے جس قدر خوفزدہ ہو گا اور خطرہ محسوس کرے گا وہ اتنا ہی نفسیاتی اور جذباتی لحاظ سے صدمے کا شکار ہو گا۔ مضبوط اعصاب اور حوصلے والے فرد کے لیے کسی حادثے یا سانحے کے اثرات کم ہو سکتے ہیں، یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح ٹراما مختلف اشکال میں ظاہر ہوتا ہے اسی طرح ٹراما کا سامنا کرنے والے لوگوں پر بھی اس کے اثرات مختلف اشکال میں فرق کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ نفسیاتی اور جذباتی صدمے کے محرک عموماً وہی ہوتے ہیں جو ٹراما کی کسی دوسری جہت کے ہو سکتے ہیں۔ بنیادی طور پر کسی واقعے کا براہ راست اثر سب سے پہلے انسان کے دماغ پر اور پھر رد عمل کے طور پر اس کے جذبات پر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یہ رد عمل کس قسم کا ہو سکتا ہے اس کے حوالے سے دو ماہر نے نفسیات لارنس روبن سنز اور میلنڈا اسمتھ اپنے ایک آرٹیکل "Emotional and Phycological Trauma" میں لکھتے ہیں

"Emotional and psychological trauma is the result of extraordinarily stressful events that shatter your sense of security, making you feel helpless in a dangerous world. Psychological and emotional Trauma leave you struggling

with unsetting emotions, memories and anxiety that would not go away. It can also leave you feeling numb, disconnected and unable to trust others".[1]

قدرتی آفات، زلزلے، سمندری طوفان، آتش فشاں وغیرہ ایسے محرکات ہیں جن کا تعلق قدرت سے ہے اور ان کا براہِ راست انسانی جذبات واحساسات اور نفسیات پر اثر ہوتا ہے۔ اس کے بعد سنگین سانحات میں کسی گاڑی یا جہاز کا حادثہ، جنگ، ایٹم بم کا استعمال، جنسی تشدد، وسیع پیمانے پر اموات، مسلسل کسی اذیت ناک صورت حال میں رہنا بھی انسان کے نفسیاتی اور جذباتی ڈھانچے کو بری طرح متاثر کرتے ہیں۔ اس ساری صورت حال میں انسان اپنے اپنے تجربے، مشاہدے اور مزآج کے مطابق اثر قبول کرتا ہے اور رد عمل کا اظہار کرتا ہے۔ ٹراما بعض اوقات انفرادی نوعیت میں ظاہر ہونے کی بجائے مجموعی معاشرتی رویوں کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کسی گروہ یا قوم کا مسلسل تناؤ کی صورت میں رہنا، جنگی حالات کا سامنا کرتے رہنا، معاشی اور معاشرتی بدحالی کا شکار رہنا بھی ایسے عوامل ہیں جو من جملہ پوری قوم، افراد یا پورے سماج کو اپنے ٹرانس میں لے لیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے میں پوری قوم یا متاثرہ گروہ نفسیاتی اور جذباتی لحاظ سے ایسے رد عمل کا اظہار کرتے ہیں جو ہرگز نارمل نہیں ہوتے۔ وہ اس قدر ذہنی اور نفسیاتی، جذباتی لحاظ سے تناؤ اور دباؤ کا شکار ہوتے ہیں کہ پورے کا پورا ماحول ہی ٹروما کے اندر جکڑا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال میں لوگوں کے اندر بے چینی بے قراری، غصہ، بغاوت، نفرت اور جنون جیسی علامات ظاہر ہوتی ہیں جو یہ ظاہر کر رہی ہوتی ہیں کہ پورے کا پورا ماحول اور سماج بری طرح تباہی کا شکار ہو چکا ہے۔ ایسے ٹروما کو سماجی یا کلچر ٹراما بھی کہا جاتا ہے جس میں ملک کا ملک یا قوم کی قوم مبتلا ہو چکی ہوتی ہے۔ تحقیقی کام میں شامل منتخب ناولوں میں جہاں انفرادی سطح پر ایسے کردار پائے جاتے ہیں جن میں نفسیاتی اور جذباتی یا دوسری کسی جہت کے ٹروما کے آثار ملتے ہیں وہیں ان میں ایسی معاشرتی یا سماجی لاچارگی اور بے بسی کا مشاہدہ بھی ہوتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مابعد نائن الیون شدید جنگی حالات میں اقوام کے مجموعی مزآج کو بھی خطرناک حد تک تباہ کیا ہے۔

ج۔ اجتماعی ٹراما

ٹراما کے ماہرین نے ٹراما کے اثرات کو صرف افراد اور فرد تک ہی محدود نہیں رکھا بل کہ انہوں نے اسے ایک ایسی سیریز یا چین قرار دیا ہے جو پیچیدہ صورت میں مجموعی طور پر سارے کے سارے معاشرے اور سوسائٹی کو مکمل طور پر بگاڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اس کے اثرات نہ صرف انسان کی نفسیات اور جذبات و احساسات کو مجروح کرتے ہیں بل کہ اس کے اس اخلاقی، فطری اور تنظیمی ڈھانچے کو بھی بری طرح مجروح کرتے ہیں جس پر کسی معاشرے کی بنیاد ہوتی ہے۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اجتماعی ٹراما ایک ایسا تباہ کن حادثہ ہے جو جانوں کے علاوہ معاشرے کے بنیادی تانے بانے کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ اس کی مزید وضاحت اس طرح بھی کی جا سکتی ہے کہ اجتماعی صدمے کی اصطلاح سے کسی تکلیف دہ واقعے پر وہ نفسیاتی رد عمل ہے جو پورے معاشرے کو متاثر کرتا ہے۔ اجتماعی ٹراما محض ایک تاریخی حقیقت ہی نہیں بل کہ یہ لوگوں کے ایک پورے گروہ کے ساتھ کسی پیش آنے والے حادثے کو بھی بیان کرتا ہے۔ یہ اس پر بات اس پر بھی دھیان دیتا ہے کہ کسی حادثے یا سانحے نے متاثرہ معاشرے یا فرد کی یادداشت کو کس طرح متاثر کیا ہے؟

اجتماعی ٹروما کا مطالعہ انفرادی یاداشت اور اجتماعی یادداشت کے سائیکو میٹرز کو بھی مد نظر رکھتا ہے اجتماعی ٹراما میں افراد یا گروہوں کی یادداشتوں کو مختلف اشکال میں پرکھا جاتا ہے، مثلاً یہ کہ براہ راست سانحے سے بچ جانے والے متاثرہ گروہ کی نفسیات اور جذبات میں کس قسم کا صدمہ پیدا ہوا ہے؟ بچ جانے والے متاثرہ افراد کس طرح اس واقعے کو اپنی نئی نسلوں میں منتقل کرنے کر کے انہیں بھی متاثر کرتے ہیں اور پھر یہ کہ سانحے کی جگہ سے دور موجود لوگوں کی نفسیات پر سانحے یا حادثے کی روایات اور خبروں نے کس قسم کا اثر ڈالا ہے؟ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اجتماعی ٹروما میں دور یا نزدیک کے لوگوں کے باہم ربط کی تلاش کے ذریعے ان میں ٹراما کے اثرات کو دیکھا جاتا ہے۔ وال کن وی ماہر نفسیات اجتماعی ٹروما کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے

> "The term collective drama refers to the psychological reactions to a traumatic event that affect an entire society, it does not merely reflect and historical fact ,the recollection of a terrible event that happened to a group of

people. It suggests the tragedy is represented in the collective memory of the group."[2]

اجتماعی ٹراما تھیوری درج ذیل پہلوں کو مد نظر رکھتی ہے سانحہ کیا تھا اور اس کی شدت کیا تھی؟ سانحے سے بچ جانے والے لوگوں میں کس قسم کے انفرادی صدمات نے جنم لیا؟ سانحے نے کلی طور پر پورے معاشرے کے افراد کے جذبات واحساسات کو کیسے متاثر کیا اور اجتماعی یادداشتوں کی کیا صورت حال بنی؟ متاثرہ گروہ اور معاشرے کی زندگی کے دوسرے اسباب یعنی معیشت، سیاست، اخلاقیات، روزگار وغیرہ کس طرح اور کس حد تک متاثر ہوئے ہیں؟ اجتماعی ٹراما وقت اور علاقے کی دوری یا قربت کے لحاظ سے اپنے تحقیقی دائرے کو وسعت دیتا رہتا ہے۔

د۔ کیتھی کروتھ کی ڈبل ٹراما تھیوری :

ٹراما کے مطالعے کے دوران اہم ترین نام کیتھی کراؤتھ کا ہے کیتھی نے 1995 اور 9 میں اپنے دو تحقیقی کاموں

Trauma exploration in memory (1995)

Unclaimed experience: trauma and history (199)

میں ڈبل ٹراما تھیوری کا ماڈل پیش کیا۔ یہ ایک اہم ترین تحقیقی کام تھا جو بعد میں ٹروے کی تفہیم کے حوالے سے بہت سود مند ثابت ہوا۔ کراؤتھ کا کہنا ہے کہ تکلیف دہ واقعہ اس لیے تکلیف دہ ہے کیونکہ وہ انسان کے معمول کے تجربے سے ہٹ کر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی سنگین واقعے سے بچ نکلنے والا اس واقعے کو فوری طور پر سمجھنے سے قاصر رہتا ہے اور بعد میں یہ واقعہ فلیش بیک کی صورت میں اس کے لیے اذیت ناک بن جاتا ہے۔ کیتھی کراؤتھ کے نظریہ ڈبل ٹرامہ کے حوالے سے ڈاکٹر عنایت اللہ اپنے تحقیقی مقالے میں لکھتے ہیں

"According to double trauma theory, the survivors of a traumatic incident experience a double trauma in the sense that he or she has witnessed the trauma of other people's death, and paradoxically, the survivor sees his very survivor as a trauma itself. The survivor sees his existence

as a trauma because he is constantly hunted by flashback of others people's death"[3]

کیتھی کراؤتھ نے ٹراما کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ایک ہولناک واقعے سے بچ جانے والا دوہرے صدمے کا شکار ہوتا ہے۔ ایک تو اس نے حادثے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ متاثر شخص اپنے زندہ رہنے کو بذات خود ایک صدمے کے طور پر دیکھتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ گزرے ہوئے واقعے کو فلیش بیک کی صورت سوچتا رہتا ہے اور پریشان رہتا ہے۔ یعنی دوران حادثہ کی یادیں اور بعد میں ان یادوں کی خوفناکی اس کو دوہرے ٹروما میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ کوئی بھی خوفناک حادثہ ایسے لوگوں کے دل و دماغ میں پوری شدت کے ساتھ منقش رہتا ہے جس کو وہ بہ طور حقیقی تاریخ کے بیان بھی کرتے ہیں۔

ہ۔ ڈومینک لاکیپرا کا نظریہ:

رڈومینک لاکیپرا نے اپنے تحقیقی کام "Writing drama writing history" میں ٹراما سے متاثرہ فرد کے حوالے سے اپنا نظریہ پیش کیا۔ اس نے ایکٹ آؤٹ یعنی بار بار کسی خوفناک صورت کو دہرانا اور ورکنگ تھرو یعنی حادثے کو یاد رکھتے ہوے اپنے روزمرہ کی شناخت کرنا، جیسے ہم نکات پیش کر کے ٹراما سے متاثر فرد کے عمل اور رد عمل کو سمجھنے کے لیے فریم ورک دیا۔ ڈومینک لاکیپرہ ایکٹ اؤٹ کو ایک ایسی حالت قرار دیتی ہے کہ کسی شدید حادثے کا شکار فرد مجبور ہے کہ وہ اس حادثے کو اپنے دل و دماغ میں مسلسل دوہر آتا رہے۔ یعنی یہ واقعہ اس کے دماغ میں پیوست ہو کر اس کے دماغ کی سکرین پر چلتا رہتا ہے۔ ٹروما سے متاثرہ شخص جب اس ٹرومیٹک صورت سے نکلنے کا کوئی راستا نہیں پاتا اور مسلسل اسی صورت میں رہتا ہے تو اسے ایکٹ آؤٹ ٹراما کہتے ہیں۔ ڈومینک کیپرہ کا دوسرا نقطہ ورکنگ تھرو ٹراما ہے۔ ورکنگ تھرو سے مراد یہ ہے کہ کسی حادثے سے بچ جانے والا فرد اس قابل ہوتا ہے کہ وہ صدمآتی لمحوں اور روزمرہ زندگی کے لمحات میں فرق کر سکے، لاکیپرہ کے مطابق ایسا فرد دوسرے لوگوں سے بات کر سکتا ہے کہ دراصل ٹرامیٹک حادثے کے وقت ہوا کیا تھا؟ ورکنگ تھر ٹروما کا مریض اپنے ماضی اور حال کے درمیان تمیز بھی کر سکتا ہے اور اپنے غم اور دکھ کا اظہار کر سکتا ہے۔ لاکیپرہ اپنی ایک کتاب میں ایکٹ آؤٹ اور ورکنگ تھرو ٹراما کی وضاحت وضاحت کچھ یوں کرتی ہے۔

"In which one is haunted or possessed by the past and performatively caught up in compulsive repetition of traumatic scenes. Acting out is as if one were back there in the past reliving the traumatic scene."[4]

ڈومینک لاکیپرہ ورکنگ تھرو کے تصور کو مزید یوں واضح کرتی ہے۔

"The survivor of trauma is able to separate the moment of trauma from the moments of everyday life." [5]

ناولوں کی تفہیم کے دوران ڈومینک لاکیپرہ کا ایکٹ آؤٹ اور ورکنگ تھرو کا نظریہ بھی شناخت کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ کچھ کردار ایسے ہوتے ہیں کہ وہ وقوعی کے وقت سے آگے نہیں نکل پاتے اور اسی واقعہ کے اندر پھنس کر رہ جاتے ہیں اور کچھ کردار ایسے ہوتے ہیں جو حادثے کے وقت کو دہر آتے تو ہیں مگر اپنے روزمرہ معاملات کا خیال بھی رکھتے ہیں۔

و۔ کائی ایریکسن کا درجہ دوم ٹروما کا نظریہ

کائی ایریکسن نے ٹراما کے ایک اور لطیف پہلو کو واضح کیا ہے۔ اس کے اس نظریے کا اہم پہلو وہ لوگ ہیں جو حادثے کے وقت موجود تو نہیں ہوتے مگر اس کے باوجود حادثے کے اثرات سے متاثر ہو جاتے ہیں ۔کائی ایریکسن کے مطابق وہ لوگ جو براہ راست کسی حادثے کا مشاہدہ کرتے ہیں وہ تو درجہ اول کے ٹراما میں مبتلا لوگ ہوتے ہیں مگر کچھ لوگ حادثے کی کہانی اور تفصیل سن کر بھی خوف، ڈر اور ہجان کو محسوس کرتے ہیں اور ٹروے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لہذا کائی ایریکسن ٹروے کو افراد اور معاشروں کے زاویے سے پیش کرتا ہے اور ٹراما کی وضاحت کرتا ہے۔ درجہ دوم کے لوگ اگرچہ اس شدت سے حادثے کے اثرات کو نہیں قبول کرتے جس طرح کے حادثے سے گزرنے والوں نے کیا ہوتا ہے۔ تاہم ان پر سننے سنانے سے بھی اتنے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں جو ان کو کسی نفسیاتی یا جذباتی صدمے کا شکار کر دیں۔ جس طرح نائن الیون کو براہ راست مشاہدہ کرنے والوں کے بعد اس حادثے کے بارے میں پڑھنے، سننے اور اس کی تباہی کے اثرات کو محسوس کرنے والے افراد کو بھی ذہنی صدمات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ درجہ دوم یا ثانوی ٹروے کے اثرات درج ذیل ہو سکتے ہیں

کسی فرد کا حد سے زیادہ سنجیدہ ہو جانا یا اخلاقی انحطاط کا شکار ہو جانا۔

حساسیت کا بہت زیادہ بڑھ جانا۔

غم، مایوسی اور قنوطیت کا محسوس کرنا۔

تھکاوٹ اور جذباتی شکست وریخت۔

ثانوی صدمایا ٹراما سے مراد دراصل وہ رویہ اور جذبات ہیں جو قدرتی طور پر کسی دوسرے فرد کے تکلیف دہ واقعے کے تجربات سنانے کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ آسان لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی ایسے فرد کے ذریعے دوسرا فرد متاثر ہو جو کسی شدید تناؤ میں مبتلا ہو۔ یہ اثرات بھی اس قدر طاقت رکھتے ہیں کہ سننے والے فرد کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں کائی ایریکسن کے مطابق

"Secondary traumatic stress is the emotional duress dress that results, when an individual hears about the first-hand trauma experience of another." [6]

ٹراما کی کیفیات اپنی مرکزی جگہ سے نکل کر مختلف صورتوں میں دیگر لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیں تو یہ درجہ دوم کا ٹراما کہلاتا ہے۔

و۔ مابعد نائن الیون اردو ناولوں میں ٹراما کے آثار

انسانی نفسیات اور اس کی الجھنیں ادب کا حصہ بنتی رہی ہیں۔ انسان کی نا آسودہ خواہش کسی نہ کسی طریقے سے اظہار کا روپ دھار کر بہ صورت تحریر یا تقریر سامنے آتی رہتی ہیں۔ ایک فکر کے مطابق انسان بولتے یا لکھتے وقت اپنی ذات کی تحلیل کرتا رہتا ہے۔ انسان کے تجربات، مشاہدات، خدشات اور صدمات وغیرہ کسی بھی صنفِ ادب میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر نازیہ لکھتی ہیں۔

"نفسیات اور ادب ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں اور ایک دوسرے کا آئینہ بھی۔ نفسیات، شعور، تحت الشعور، لاشعور اور اجتماعی شعور سے بحث کرتی ہے۔ تخلیق کی شکل میں ادب ہمیشہ نفسیات کے انھی عناصر کے زیرِ بار رہا ہے"۔ 7

مابعد نائن الیون حالات نہ صرف عالمی سطح پر مخدوش ہوے بل کہ پاکستان میں شدید دہشت اور وحشت کا ماحول بنا رہا۔ آئے روز خودکش حملوں نے پاکستانی سماج کو مکمل طور پر ایک غیر یقینی کی صورت میں لا

کھڑا کیا۔ ہر وہ فرد جو صبح کو گھر سے نکلتا تھا اسے یہ یقین نہیں ہوتا تھا کہ وہ عافیت کے ساتھ گھر واپس پلٹ بھی سکے گا یا نہیں۔ عجیب ذہنی اذیت اور کش مکش اس خطے کے مکینوں پر مسلط رہی۔ اس لیے یہ امر لازمی تھا کہ اردو ناول میں کہیں نہ کہیں اس صدمے، المیے یا دکھ کا اظہار کہانیوں میں پایا جاتا۔ اردو ناول نے مابعد نائن الیون ہر طرح کے مسائل کو بہت اچھے انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے سید مظہر جمیل نجیبہ عارف کی کتاب پر کیے گے تبصرے میں لکھتے ہیں۔

> "اکیسویں صدی کے پہلے برس 2001ء نیویارک میں واقوع پذیر خونی واقعے میں، جسے عرفِ عام میں نائن الیون کا نام دیا گیا ہے اور جس میں امریکی قوت وستوت کی دو عظیم اور بلند عمارتوں کو نامعلوم دہشت گردوں نے منہدم کر کے نو زائیدہ عالمی نظام (نیو ورلڈ آرڈر) کے تانے بانے اور یک قطبی معاشرتی، سماجی اور معاشی کائنات کے بیخ وبن کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس محیر العقول واقعے کی ہلاکت آفرینی جنگ عظیم دوم کی ہلاکت آفرینی اور خون آشامی کا مقابلہ تو نہیں کرتی لیکن عالمی تناظر میں اس کے نتائج و عواقب جنگ عظیم سے کہیں زیادہ مہلک اور دور رس ہیں اور اس کے رد عمل میں دنیا بھر کے ادب میں نئے مزاحمتی رویوں نے جنم لیا ہے "[8]

منتخب اردو ناولوں کے حوالے سے اردو ناول میں ٹراما کی نوعیت کے بارے میں ایک جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

میں دہشت گرد ہوں از محسنہ جیلانی

محسنہ جیلانی ہندوستان میں علی گڑھ کے ایک ادبی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے آباؤ آجداد کا تعلق مشہور صوفی شاعر مرزا مظہر جانِ جاناں سے تھا۔ یونیورسٹی میں آپ نے سارے اتر پردیش میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ 192 میں علی گڑھ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں گریجویشن کیا۔ 195 میں اپنے شوہر ممتاز آصف جیلانی کے ہمراہ برطانیہ آ گئیں۔ 1970 میں جب روزنامہ جنگ لندن سے نکلنا شروع ہوا تو اس میں خواتین کے صفحے کی ادارت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ آپ نے نوائے وقت کے صفحے کی ادارت کی ذمہ داریاں بھی نبھائیں۔ اسی دوران آپ بی بی سی لندن اردو سروس سے خواتین کے لیے نشر ہونے والے پروگرام برگ گل کا حصہ بنیں۔ ستر کی دہائی میں آپ نے ایشیائی خواتین کی پہلی اردو ادبی تنظیم "برگ گل"

کی بنیاد رکھی جس کا مقصد برطانیہ میں مقیم اردو لکھنے والی خواتین کو ایک جگہ اکٹھا کرنا اور انہیں اپنی تخلیقات شائع کرنے کے لیے فورم مہیا کرنا تھا۔ محسنہ جیلانی برطانیہ میں اردو زبان و ادب کا ایک معتبر حوالہ رہی ہیں ۔آپ نے مختلف اصنافِ ادب میں اپنی بہترین تخلیقات قارعین کے ذوق کی نذر کی ہیں۔" میں دہشت گرد ہوں" محسنہ جیلانی کا وہ شاہکار ناولٹ ہے جس میں انہوں نے نائن الیون اور اس کے اثرات کا جائزہ ایک خاندان کی زندگی کا نقشہ پیش کر کے کیا ہے۔

تہذیبی کش مکش اور مشرق و مغرب کا فرق ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انسان ہمیشہ سے ان تہذیبوں کے تصادم کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔ ہزاروں خاندان ایسے ہیں جو برصغیر سے تاج برطانیہ کے دوران یورپ جا بسے اور اس کے بعد بھی یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ جنوبی ایشیا سے ہجرت کر کے یورپ چلے جانے والوں کو یورپ میں وہ درجہ آج تک نہیں مل سکا جو وہاں کے آبائی لوگوں کو حاصل ہے ۔مگر اس کے باوجود اچھے اور بہترین مستقبل کی امید اور اپنے بچوں کے محفوظ مستقبل کی خواہش جنوبی ایشیا کے لوگوں کو یورپ کی طرف دھکیلے جا رہی ہے۔ مغرب جس میں کالے اور گورے کا نسلی تعصب کبھی نہ ختم ہو سکا ایک اور نسلی تعصب کو فروغ دے چکا ہے اور وہ ہے ایشیائی ملکوں سے مغرب جا کر آباد ہونے والے افراد کی ایک تیسری نسل ،اس کے باوجود کہ یہ ایشیائی نسل سالوں سے وہاں مقیم ہے اور اسے وہاں کی شہریت بھی حاصل ہو چکی ہے مگر آج بھی مقامی لوگ ان کو تعصب ، نفرت اور شک کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ خصوصی طور پر وہ مسلمان جو اپنے وطن اور سرزمینوں کو چھوڑ کر مغرب میں سہانے مستقبل کے خواب سجائے جا بسے، ان کو بے حد مشکل اور سخت حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ نائن الیون کے بعد تو برطانوی مسلم کمیونٹیز کو جن سخت ترین مسائل کا سامنا کرنا پڑا ان کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ نائن الیون وہ ٹرانس مشین ثابت ہوا جس کے اندر سے نفرت، تعصب، دہشت اور جنگ جیسی لہریں نکلی کہ جنھوں نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پہلی نسل جو اپنے وطن کو چھوڑ کر مغرب آباد ہوئی اور اپنی نسلوں کی بقا کو محفوظ سمجھتی رہی وہ باوجود وہاں کی شہریت کے مغرب کے لیے کبھی قابل قبول نہیں رہی۔ مگر المیہ یہ ہے کہ وہاں پیدا ہونے والے بچے اور نئی نسل جو خالص یورپی یا مغربی شہری ہیں کو بھی اپنی شناخت کے حوالے سے شدید مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے آئے روز اس نسل کے بچوں کو کسی نہ کسی طعنے یا نسلی تعصب کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ یہ بچے جن کا حقیقی اور اصلی وطن مغرب ہے، اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر ان کو کس وجہ سے مذہبی یا نسلی تعصب کا نشانہ بنایا جا رہا ہے ؟کالج ہو یا یونیورسٹی، کوئی تفریح گاہ ہو یا گلی محلہ، ایشیائی لوگوں خصوصا مسلم لوگوں کو یورپ کے

خاص نسلی تعصب اور نفرت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔نائن الیون نے اس تعصب اور نفرت کو اتنی ہوا دی کہ ہزاروں مسلمان مرد، خواتین، لڑکے، لڑکیاں شدید ذہنی صدمے کا شکار ہو کر ایک قابل رحم حالت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ محسنہ جیلانی جو کہ خود یورپ ہی میں قیام پذیر ہیں۔ آپ نے نائن الیون کے بعد برطانیہ میں مسلمانوں کے ساتھ شدید نفرت آمیز برتاؤ کو نہ صرف دیکھا بلکہ اس کا تجربہ بھی کیا اور پھر اس کو اپنے تخلیقی ذہن کی مدد سے اپنی تخلیقات میں پیش ۔"کیا میں دہشت گرد ہوں" ناولٹ آپ کے انھی مشاہدات اور تجربات کا مرقع ہے جو نائن الیون کے بعد پیش آئے۔

ناولٹ "میں دہشت گرد ہوں" پر تبصرہ کرتے ہوئے قیصر تمکین لکھتے ہیں

> "محسنہ جیلانی نے ایک تاریخی دور کی نسل کو اس کے مرزبوم سے قطع تعلق کر کے بہتر حالات و پر سکون زمان و مکاں کی تلاش و جستجو میں بالکل ہی الگ اور جداگانہ حالات و مسائل سے نبرد آزمائی کرتے دکھایا ہے۔ایک تاریخی جبریت کے دوراہے پر کھڑی درماندہ اور پھٹکی نسل کے دو نمائندہ سجیدہ اور احمد علی (ناول کے دو کردار) اپنے اصل وطن کو چھوڑ کر اپنے دکھوں کا مداواڈھونڈنے کے لیے ہندوستان سے پاکستان جآتے ہیں اور وہاں بھی حالات کے تغیر و تبدل سے بددل ہو کر ایک نئ ہجرت پر مجبور ہوتے ہیں۔ انگلستان میں قیام کرنے اور روٹی روزی کمانے کے بعد وآپس جانے کا ارادہ کر کے آتے ہیں لیکن ان کے خوابوں کے تصور میں بھی یہ گمان نہ تھا کہ مغرب میں پیدا ہونے والے ان بچے، گویا ایک نئ نسل کیا اداب و معاشرت اختیار کریں گے ؟اس نئ نسل کی آئینہ دار زرینہ انگلستان میں پیدا ہو کر جس ہوا اور فضا میں سانسیں لیتی ہے اور تضادِ تشخص کے ہفت خواں طے کرتی ہے۔ دوسری طرف زرینہ کا بیٹا تیسری نسل جو کچھ مزید آگے بڑھ کر امریکہ میں گویا ببول کے درخت پر کار آشیاں بندی کرتا ہے۔ تینوں نسلوں کی ٹوٹ پھوٹ ،اقدارِ انسانیت کے انہدام اور ایک تازہ جنون تعمیر کی داستان قلم بند کرتے ہوئے محسنہ جیلانی نے ایک بہت ہی اہم مسئلے کو ایسا فکر انگیز، جرات آزما اور عصری دورِ اضطراب کی پیچیدگیوں سے مامور رنگ عطا کیا ہے کہ ناولٹ نئ صدی کے نئے مسائل کا اشاریہ بن جاتا ہے"۔[9]

اس ناول میں دوہرے المیہ کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ پہلا یہ کہ ایک نسل یعنی علی احمد اور اس کی بیوی سعیدہ اچھے مستقبل اور بچوں کے محفوظ مستقبل کے لیے پاکستان سے ہجرت کرتے ہیں۔ ان کو وہاں جن حالات و واقعات کا سامنا کرنا پڑا وہ تقریباً ہر خاندان کو ابتدا میں سیٹل ہونے کے لیے کرنا پڑتا ہے۔ ان کے بچے زرینہ اور حامد جو برطانیہ میں پیدا ہوئے ہیں اور جن کی پاکستان کے ساتھ کوئی جذباتی وابستگی نہیں، کو برطانیہ میں باوجود برطانوی شہری ہونے کے اپنی حقیقی شناخت کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اس بات کو نہیں سمجھ پائے کہ مکمل برطانوی شہری ہونے کے باوجود ان کو تعصب اور مذہبی نفرت کا سامنا کیوں کرنا پڑ رہا ہے؟ یہ درد یا دکھ یہی ختم نہیں ہوتا آگے چل کر تیسری نسل (زرینہ کا بیٹا) جو ہے ہی مکمل یورپی ماحول کی پیداوار وہ بھی یورپ کو الوداع کہ کر امریکہ جابسنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ زرینہ کا بچہ خالص یورپی انداز فکر کے ساتھ ماں باپ اور خاندان کو چھوڑ کر امریکہ میں الگ تھلگ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یعنی یہ ناولٹ کشمکشِ حیات کی وہ تکون بناتا ہے جس کے ہر کونے پر ایک الگ انداز فکر والی نسل موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان سب کا ایک دکھ مشترک نظر آتا ہے اور وہ ہے ان کی شناخت کا مسئلہ۔ ان کو آئے روز جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا رہا وہ تھا ان کو غیر برطانوی اور ایشیائی سمجھ کر مقامی لوگوں کا ان سے نفرت کرنا، ان کو دہشت گرد قرار دینا، ان کے مذہب اسلام پر آوازے کسنا، یہ وہ ناقابل برداشت چیزیں تھی جو ان تینوں نسلوں کو بے چین اور بے قرار رکھے ہوئے تھی۔ اس ناول میں مابعد نائن الیون جگہ جگہ ان مسائل کا ذکر ملتا ہے مثلاً

> "پولیس کی طرف سے "سٹاپ اینڈ سرچ" کی مہم جاری تھی۔ مسلمانوں پر خوف طاری تھا۔ ریڈیو رات دن کھلا رہتا، ہر دوسرے دن خبر کا انتظار رہتا تھا کہ دیکھیے اب کیا سننے کو ملتا ہے۔ بہت سے معصوم مسلمان دہشت گردی کے الزام میں پکڑے گئے، اذیتوں کا شکار ہوئے اور پھر انہیں خاموش چھوڑ دیا گیا۔ ان کا جرم صرف اتنا تھا کہ وہ مسلمان تھے۔ ان کے نام پر ایک دھبہ لگ گیا اب انہیں ملازمتیں نہیں ملیں گی ان کا مستقبل خطرے میں ہے"[10]

ناول میں بہت وضاحت کے ساتھ نائن الیون کے بعد مسلمانوں کو پیش آنے والے واقعات کو بہ طور کہانی پیش کیا گیا ہے، "میں دہشت گرد ہوں" کہانی ایک پاکستانی خاندان کی ہے جو اچھے مستقبل کی امید لگائے برطانیہ آباد ہوا۔ احمد علی اور اس کی بیوی سعیدہ کو وہاں ابتدا میں بہت سے مالی مسائل کا سامنا کرنا پڑا مگر وہ اس امید کے ساتھ برطانیہ مقیم رہے کہ ان کے بچے زرینہ اور حامد جو برطانیہ ہی میں پیدا ہوئے اور مکمل برطانوی

شہری بھی ہیں کو ایک محفوظ اور روشن مستقبل ملے گا۔ زرینہ اور حامد کی جذباتی وابستگی برطانیہ ہی سے ہوتی ہے اس لیے کہ انہوں نے اسی سرزمین پر آنکھ کھولی ہوتی ہے۔ وہ یہیں کے ماحول میں پرورش پاتے ہیں اور اپنی شناخت بطور برطانوی شہری ہی تصور کرتے ہیں۔ وقت پلٹا کھاتا ہے، نائن الیون نے حالات یکسر تبدیل کر دیے ،سالوں سے مغرب میں آباد مسلمانوں کو طرح طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہیں ہر جگہ دہشت گرد کہہ کر پکارا جانے لگا، نفرت اور غصے سے ان کے ساتھ برا سلوک کیا جانے لگا، زرینہ اور اس کے ساتھ اسی طرح کے ہزاروں مسلمان لڑکے اور لڑکیاں اس نفرت انگیز رویے کا سامنا کرتے ہیں۔ ان کو یہ بات سخت تکلیف دے رہی تھی کہ آخر وہ بھی یہاں کے مقامی باشندے ہیں لہذا ان سے ایسا رویہ کیوں رکھا جا رہا ہے؟ کیا صرف مذہب کے اختلاف پر ان کو اذیت کا نشانہ بنانا کوئی انسانیت ہے؟ احمد علی اور سعیدہ بچوں کو لے کر پاکستان جانا چاہتے ہیں مگر ان کے بچے جانے پر بالکل تیار نہیں ہوتے۔ آئے روز کے نسلی اور مذہبی تعصب کے رویے نے اس کے ذہن پر منفی اثرات مرتب کرنا شروع کر دیے۔ راستے میں مسلمان لڑکیوں کے حجاب چھیننے اور ان کو گالیاں دینے کے واقعات آہستہ آہستہ زرینہ کے دماغ میں پیوست ہوتے چلے گئے۔ زرینہ کے نفسیاتی اور جذباتی تناو کے اسباب میں بہت سارے واقعات غیر محسوس طریقے سے شامل ہو رہے تھے۔ آئے روز خوف ناک خبریں مغرب میں رہائش پذیر مسلمانوں کی نیندیں حرام کر رہی تھی۔ مثلاً ناول میں ایک اسی طرح کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔

> "لندن کی ایک نرم گرم صبح تھی، اتوار کا دن تھا، زرینہ کا خاندان صبح صبح بی بی سی ٹیلی ویژن پر ہونے والا پروگرام "نئی زندگی نیا جیون" دیکھ رہا تھا نیوز ریڈر نے خبر سنائی "مشرقی لندن کے علاقہ والتھم اسٹو میں نسل پرستوں نے رات کو ایک گھر میں آگ لگا دی نتیجا میں ایک پاکستانی ماں اور اس کے تین بچے جل کر خاک ہو گے، باپ یونس خان نے کھڑکی سے کود کر اپنی جان بچائی کچھ عرصہ وہ ہسپتال میں رہے لیکن پھر وہ بھی اس جہانِ فانی کو خیر آباد کہہ کر اپنے خاندان سے جا ملے۔ اس خبر نے پورے خاندان بل کہ پوری ایشیائی کمیونٹی کو ہلا کر رکھ دیا"[11]

ناول میں زرینہ کے کردار کو خصوصی طور پر نفسیاتی اور جذباتی تناو میں ظاہر کیا ہوا ہے۔ اس کی ازدواجی زندگی میں ناکامی نے بھی اسے ٹروما کی طرف مزید دھکیلا، اس نے ضد کر کے منصور نامی لڑکے سے شادی کی مگر وہ دھوکا باز نکلا، اسی لیے زرینہ کی زندگی مزید الجھنوں کا شکار ہو جاتی ہے۔

"زرینہ بے حد خاموش ہو گئی تھی جیسے اسے چپ لگ گئی ہو یہ سب کیسے ہوا دیکھتے دیکھتے سارے خوبصورت خواب بکھر گئے وہ اندر سے بالکل ٹوٹ گئی تھی زرینہ کو زبردست ذہنی دھچکا لگا تھا اسے یوں لگتا جیسے اس کی دنیا اصل پتھر ہو گئی ہو ازدواجی زندگی کی شکست نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا پڑھائی کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اس کا بچہ تھا اور تنہا زندگی وہ اکثر خاموش بیٹھی سوچتی رہتی تھی" [12]

ناول میں زرینہ کے کردار سے ایک تو ٹراما کی کیفیات کو بیان کیا گیا ہے تو دوسری طرف مغرب کی مسلمانوں کے لیے موجود نفرت کا اظہار بھی موجود ہے۔ زرینہ جب کھانے کی چیزیں خریدنے دکان پر جاتی ہے تو وہ بہت سہمی ہوتی ہے، لوگ اسے بہت عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کچھ شریر لڑکے اسے بہت بری طرح چھیڑتے ہیں، جس کی وجہ سے سے وہ بہت حواس باختہ ہو جاتی ہے۔

"باری آنے پر اس نے فش اینڈ چپس کا ایک پورشن خریدا اور تیزی سے گھر کی طرف جانے لگی، قریب کے شراب خانے سے لوگ نکل رہے تھے، کئی نوجوان چیختے، چلاتے، گاتے ہوئے جا رہے تھے۔ اچانک بالکل اچانک اس کے پیچھے کوئی آیا اور اس کا حجاب سر سے کھینچ لیا اور بھاگتا چلا گیا۔ "You terrorist Paki go home" وہ چلا رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں رک گئیں اچانک حملے سے اس کی آواز حلق میں بند ہو گئی۔ حجاب کھینچنے کی وجہ سے گردن میں خراشیں آ گئیں جیسے خون رسنے لگا ہو۔ وہ بے تحاشہ گھر کی طرف بھاگ رہی تھی ہانپتی کانپتی سڑک پر سناٹا تھا کانپتے ہاتھوں سے اس نے دروازہ کھولا اور وہی کوریڈ اور میں بیٹھ گئی کھانے کا پیکٹ ہاتھ سے چھوٹ کر سڑک پر گر گیا تھا اسے اس وقت رونا بھی نہیں ایا وہ اس اچانک حادثے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی اس پر پاگلوں ایسی کیفیت طاری ہو گئی ساری رات سوتے جاگتے گزری اور پھر وہی ڈراؤنگ نے خواب جو وہ دیکھتی رہتی تھی" [13]

ان حالات سے وہ اس قدر خوف زدہ ہوتی ہے کہ وہ بھیانک اور ڈراونے خواب دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ یعنی وہ نفسیاتی اور جذباتی طور پر دہشت کے ٹرومے کا شکار ہو جاتی ہے اور چیخ چیخ کر سب کو بتاتی ہے کہ وہ دہشت گرد نہیں، وہ ایک عام انسان ہے۔ مگر وہ جس گلی محلے سے گزرتی ہے یا اپنی ملازمت کی جگہ جاتی ہے اسے یہی ایک آواز سنائی دیتی ہے کہ وہ دہشت گرد چلی آ رہی ہے اس کا یہ صدمہ اب اس کے ڈراونے خوابوں

کی صورت میں نمودار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ محسنہ جیلانی نے یہاں زرینہ کی نفسیاتی اور جذباتی کش مکش کے ذریعے اس کے اس جذباتی صدمے کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کا سامنا زرینہ جیسی ہزاروں لڑکیوں نے کیا اور وہ کسی نہ کسی صدماتی یا ٹرومیٹک کیفیات سے دوچار ہوئیں۔ ناول کے ابتدا ہی میں زرینہ کی ذہنی کیفیت کی عکاسی کرتے ہوئے لکھا گیا ہے، ناول میں زرینہ کا نفسیاتی اور جذباتی ٹراما جس کیفیت کو پیش کر رہا ہے وہ ایک ماہرِ نفسیات ڈومینک لاکیپرہ کے ورکنگ تھروٹراما کے مطابق نظر آرہا ہے کہ جس میں ایک انسان کسی دہشت ناک کیفیت سے گزرنے کے بعد ذہنی اور جذباتی طور پر متاثر ہو کر کرونک ٹرومے کا شکار تو ہوتا ہے مگر اپنی مکمل شناخت کو نہیں بھولتا۔ زرینہ کو مسلسل ہر اس منٹ کی کیفیت سے دوچار تو ہونا ہی پڑ رہا تھا مگر ایک واقعے نے اسے مزید الجھن کا شکار کرتے ہوے ٹرومے کی طرف دھکیل دیا۔ ناول میں اس صورت کو ناول نگار نے یوں پیش کیا ہے۔

> "جولائی کا ایک گرم دن تھا زرینہ نیوب اسٹیشن میں ایکسکلیٹر سے جیسے ہی نیچے اترتی ہے اس نے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر ایک ہنگامہ ہے اور بلا کی افر تفری ہے پولیس افسروں کے گھیرے میں ایک نوجوان کی لاش پڑی ہوئی ہے لوگ چیخ رہے تھے اور عورتیں دل تھامے کھڑی تھی زرینہ یہ منظر دیکھ کر خوف کے مارے ساقت ہوئی ہو جاتی ہے ایک پتھر کی مانند اور یہ خونی منظر اس کے تحت و شعور میں ان منٹ نقش کی طرح کندہ ہو جاتا ہے۔"[14]

خوف و ہراس کے ساتھ یہ سانحہ زرینہ کو اس قدر اپنے حصار میں لے لیتا ہے کہ اسے کی ذہنی حالت کم زور ہوتی چلی جاتی ہے اور ڈراونے خواب اس کو مزید خوف زدہ کرنے لگے

> "رات پھر اس نے وہی بھیانک خواب دیکھا وہ چیخ مار کر مار کر اٹھ بیٹھتی ہے۔ گھبرا گھبرا کر اپنے جسم کو دیکھتی ہے۔ دل ہے کہ شدت سے دھڑک رہا ہے اور ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں۔ وہ اٹھ کر کچن میں جاتی ہے، ٹھنڈے پانی کا گلاس ایک حساب میں چڑھا جاتی ہے"[15]

مصنفہ نے زرینہ کے کردار میں سنگین مشاہدے کے جو اثرات دکھائے ہیں وہ دو طرح کے ہیں۔ ایک حادثے کی وجہ سے اس کے حواس کا بالکل جام ہو جانا اور سکتے میں چلے جانا اور جو دوسرے اثرات جو اس پر مرتب ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کو ہم پوسٹ ٹرومیٹک سٹریس ڈس آرڈر کہہ سکتے ہیں۔ سانحے یا حادثے

کے بعد انسان کا سانحے یا واقعے کو فراموش نہ کر سکنا، بار بار ڈرنا اور ذہنی اذیت کا شکار ہونا اس کی شدید صدماتی کیفیات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یعنی زرینہ دوہرے صدمے کا شکار نظر آتی ہے، ایک واقعے کے عین موقع پر اور دوسرا بعد از واقعہ۔ ایک اور جگہ زرینہ کی ٹرومیٹک صورت حال کا مصنفہ نے یوں ذکر کیا ہے۔

"اس منظر کا زرینہ پر اس قدر خوف طاری ہو گیا تھا کہ وہ بستر پر جاتے ہوئے کانپتی تھی۔ رات بھر جاگتی مگر جب بھی ذرا سی آنکھ لگتی اسے وہی ڈراونے خواب آنا شروع ہو جاتے۔ لیکن خواب کی نوعیت اب بدل گئی تھی وہ دیکھتی کہ وہ زمین پر پڑی ہے اور پولیس اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر رہی ہے وہ تڑپ کر اٹھ جاتی ہے اور اپنے جسم کو چھو کر دیکھتی ہے اپنا چہرہ تلاش کرتی ہے مگر اسے چہرہ نہیں ملتا"[16]

زرینہ کے صدماتی نروس بریک ڈون کی وجہ سے صرف لاش کو دیکھنا ہی نہیں تھی مصنفہ نے اس کی ذہنی کش مکش اور نفسیاتی کیفیت کے الجھنے کے اسباب کو ایک سیریز کے ساتھ دکھایا ہے۔ نائین الیون کے بعد پہلے پہل زرینہ کو گوروں کے سخت لہجوں اور نفرت سے بھری نظروں کا سامنا کرنا پڑا جو اس کے لیے بالکل ہی ایک نیا تجربہ تھا۔ بحیثیت انسان اسے بھی دکھ تھا کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے تباہ ہونے میں جو انسانی اور مالی نقصان ہوا ہے وہ نہیں ہونا چاہیے۔ مگر وہ اپنی صفائی نہ دے پا رہی تھی کہ اس حادثے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اوپر سے سات جولائی 2005 کو لندن میں انڈر گراؤنڈ بم دھماکوں نے اس جیسے ہزاروں مسلمانوں کے لیے زندگی کو مزید مشکل بنا دیا۔ وہ سر پکڑ کے بیٹھ جاتی ہے کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ مگر جو ہو رہا تھا اس کے اثرات برطانیہ میں مسلمانوں پر بہت برے مرتب ہو رہے تھے۔ ان کو تضحیک کا نشانہ بنایا جا رہا تھا، چھوٹے چھوٹے بچوں کو غیر انسانی طریقے سے مخاطب کیا جا رہا تھا۔ یہی وہ حالات ہیں جن کی وجہ سے زرینہ ذہنی تناؤ کا مزید شکار ہو جاتی ہے۔ اس کا صدمہ پہلو دار تھا ایک یہ کہ حادثات میں قیمتی جانوں کے ضیاع کا دکھ، دوسرا اس کے ساتھ مسلمان ہونے کی وجہ سے نفرت کا برتاؤ، تیسرا یہ کہ وہ بھی برطانوی شہری تھی مگر اس سے اس کے باوجود تعصب کا نشانہ بننا پڑ رہا تھا۔ اس کے علاوہ آئے روز ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کی خبروں نے بھی اس کے دماغ پر بہت زیادہ منفی اثرات مرتب کرنا شروع کر دیے تھے۔ روزمرہ زندگی میں اس کے ساتھ کیا جانے والا برتاؤ اسے ہر روز ذہنی شدید ذہنی صدمے کی طرف دھکیل رہا تھا مثلاً ناول میں ایک اور جگہ لکھا گیا ہے

"زرینہ کو لائبریری آتے جاتے کتنی بار لوگوں نے دہشت پرگرد کہہ کر پکارا تھا۔ ایک دن اس نے ہائی گیٹ سے مسول کے لیے بس لی، مسول ہل براڈوے آتے آتے بس

خالی ہو گئی۔ شاپنگ سینٹر کے پاس بس سٹاپ پر دو تین نوجوان چڑھے۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ریمارکس پاس کرتے رہے، زرینہ نے کوئی توجہ نہ دی مگر جاتے جاتے ایک نے اس کا سکارف کھینچا اور دہشت گرد دہشت گرد کہتے ہوئے اتر گیا۔ زرینہ اپنی سیٹ پر بے جان ساکت بیٹھی رہ گئی "[17]

یہ وہ حالات تھے جو زرینہ ہر روز سہ رہی تھی اس پر مزید یہ کہ روز سنائی جانے والی خبروں میں بھی وہ دہشت تھی کہ زرینہ جیسی حساس لڑکی ذہنی دباؤ کا شکار ہوتی چلی گئی اور ڈراونے خوابوں کی اذیت کا شکار ہو گئی۔ ایک اور خبر زرینہ کے لیے سوہانِ روح بن جاتی ہے اور وہ جذباتی لحاظ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔

"مسجدوں پر حملے ہو رہے تھے، مسلمان قبرستانوں میں توڑ پھوڑ ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب ایک منظم طریقے سے مسلمانوں کے خلاف مہم چلائی جا رہی ہے۔ ہر روز ایک نئی خبر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سنائی جاتی۔ ایک لوکل اخبار میں زرینہ نے ایک چھوٹی سی خبر پڑھی کہ شمالی لندن کے نرسری سکول میں ایک پانچ سالہ بچے نے لکھا، Please do not kill me just because I am a Muslim زرینہ کی آنکھیں بیگ گئیں اور دل جیسے حلق میں آ گیا "[18]

یہ وہ واقعات تھے جو زرینہ کو ٹروما کی کیفیات میں دھکیل رہے تھے اور آخری کسر تو پلیٹ فارم پر نظر آنے والی لاش نے پوری کر دی۔ اب ایک مسلسل خوف ڈر اس کے دل و دماغ میں پیوست ہو جاتا ہے اور وہ ٹروما کی ابتدائی صورت سے نکل کر دوسرے درجے کے ٹروما جسے کرونک یا دائمی صدمہ کہتے ہیں، تک پہنچ جاتی ہے۔ یہاں وہ اب وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتی ہے، روتی ہے چلاتی ہے۔ خوابوں سے خوفزدہ ہوتی ہے اور اس اذیت ناک کیفیت سے فرار چاہتی ہے۔ وہ ایک ایسے صدمے کا شکار ہوتی ہے جہاں خوف ہے، ڈر ہے، جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا خوف ہے۔ اس کی شخصیت اپنی شناخت کے صدمے کا دکھ جھیلتے جھیلتے کمزور پڑ رہی ہوتی ہے۔ محسنہ جیلانی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایک کہانی کے ذریعے ان تمام تر کیفیات کو بیان کیا ہے جو زرینہ جیسی ہزاروں لڑکیوں نے جھیلی ہوں گی۔ بے شمار ان ٹرومیٹک کیفیات سے لڑتے لڑتے مر بھی گئی ہوں گی۔ بہر حال مختصر الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ مصنفہ نے ایک مختصر فیملی اور ناولٹ کے ذریعے جذباتی اور نفسیاتی صدمات کو موثر انداز میں پیش کیا ہے اور ان مشاہدات اور تجربات کو بیان کیا ہے جو مسلمانوں کو یورپ کے بعد نائن الیون کے بعد پیش آئے۔ مختصراً اگر زرینہ کے کردار کے نفسیاتی اور جذباتی ٹروما کو بیان کیا

جائے تو وہ ٹروما کے اس سٹیج پر نظر آتی ہے جہاں انسان ایکویٹ ٹروما سے نکل کر کرونک ٹروما میں داخل ہو جاتا ہے۔ ٹروما کی یہ قسم قابلِ علاج ہوتی ہے۔ ڈومینک لاکیپر ا اسے ورکنگ تھروٹرا ما کہتا ہے جس میں انسان کسی گہرے صدمے کے ساتھ اپنے روزمرہ کے معمولات کو بھی چلا سکتا ہے۔

طاوس فقط رنگ

نیلم احمد بشیر کا ناول " طاؤس فقط رنگ " اقبال کے شعر کا ایک حصہ ہے۔ یہ ناول اپنے پلاٹ، کردار، قصہ پن، منظر نگاری اور مشاہدات کے ساتھ ساتھ ایک نئے اور دلچسپ اسلوب کی رنگینیوں سمیت جدید طرز تکلم رکھتا ہے۔ عالمی سطح پر ادب کے لیے یہ ناول ایک نئی اور خوب صورت آواز ہے۔ اس ناول میں تہذیب اور ثقافت کے ٹکراؤ کے ساتھ ساتھ مختلف اقوام اور افراد کے باہمی میل جول اور مشرق و مغرب کی سوچ کے تفاوت کے بیان یا ڈسکورسمنٹ کو پیش کیا گیا ہے۔ نیلم احمد بشیر نے نہایت کامیابی کے ساتھ ان نسلوں کی دماغی الجھنوں اور رویوں کو موضوع بنایا ہے جن کی پیدائش مغربی ماحول اور سرزمینوں میں ہوتی ہے۔ مگر والدین کی صورت میں ان کی جڑیں خالص مشرقی زمینوں میں پیوست ہوتی ہیں۔ یہ ناول جہاں مشرق اور مغرب کی تہذیب کے تصادم کی نشان دہی ہے وہی نائن الیون کے سانحے کے بعد امریکہ اور یورپ میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا خلاصہ نامہ بھی ہے۔ بیانیہ طرز میں نیلم احمد بشیر نے ناول میں ایسے کردار پیش کیے ہیں جو ہمہ پہلو نفسیاتی بے ترتیبیوں کا شکار ہوتے ہیں اور منتشر فکر و افکار کے ساتھ ناول میں ایسی فضا کو ترتیب دیتے ہیں کہ ہر سمت افر تفری ہیجان، بے قراری، خوف، ڈر وغیرہ جیسی ٹرومیٹک خصوصیات نظر آتی ہیں۔ امریکہ کی سرزمین پر جنم دینے والا یہ ناول اپنے اندر بے شمار ایسے پہلو رکھتا ہے جن کا براہ راست تعلق نائن الیون سے ہے۔ نیلم احمد بشیر جو کہ امریکہ ہی میں مقیم ہیں، نے بہت خوب صورتی کے ساتھ امریکہ میں مقیم مسلمانوں خصوصا پاکستانیوں کی کش مکشِ حیات کا نقشہ پیش کیا ہے۔ ناول کی ابتدا نائن الیون کے حادثے سے کچھ قبل عرصے سے کی ہے۔ ایک پاکستانی خاندان کا ذکر ہے جس میں ایک میاں بیوی ان کے دو بچے مراد اور کنول وغیرہ کے روزمرہ خیالات کی عکس بندی کی گئی ہے۔ سجیلا جو پیشے کے لحاظ سے صحافی ہے اور اپنے میاں کے ساتھ 1970 کے قریب امریکہ کے شہر نیویارک کے ایک نواہی ٹاؤن میں آباد ہوئی، دونوں میں اختلافات کی وجہ سے علاحدگی ہو جاتی ہے۔ سجیلہ کا میاں اچھے کاروباری پس منظر سے تعلق رکھتا ہے، سجیلہ علاحدگی کے بعد کبھی پاکستان اور کبھی اپنے بیٹے مراد کے پاس امریکہ میں رہتی ہے۔ ان کی بیٹی کنول الگ ایک کالج میں

گریجویشن کر رہی ہوتی ہے، سجیلہ کی مرضی کے خلاف مراد کا والد مراد کی شادی ایک لڑکی شمع سے کر دیتا ہے۔ شمع ایک آزاد خیال اور بگڑے مزاج کی لڑکی ہوتی ہے، جو اپنے ماں باپ کی لڑائیوں کی وجہ سے نفسیاتی الجھنوں کا شکار رہتی ہے۔۔ناول کے دیگر کرداروں میں ڈیلائیلا جس کو مختصراً ڈی کہا جاتا ہے، اس کی ماں جولیا ، شیری، اور اس کی ماں مسز چین وغیرہ اہم کردار ہیں۔ یہ کردار شروع ہی سے پراسراریت کا شکار ہوتے ہیں۔ ناول کے آخر میں ان کرداروں کی حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ اور ناول کے آخر ہی میں ان کرداروں کی نفسیاتی اور جذباتی الجھنوں کی سمجھ بھی آتی ہے۔ خصوصاجب ڈیلائیلا، شیری اور مسز چین کے آپس کے تعلق کا پتاچلتا ہے تو پھر معلوم ہوتا ہے کہ ڈی کا کردار کیوں ابنارمل خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ڈی ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں مراد اور اسفند کی کولیگ بھی ہوتی ہے۔ اسی دوران ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی کا سانحہ ہو جاتا ہے۔ مراد جو کہ انھی ٹاورز میں موجود ایک کمپنی میں ملازم ہوتا ہے کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھنا پڑتا ہے۔ اس کا دوست اسفند اس حادثے میں مارا جاتا ہے۔ اچانک ہی پورے امریکہ میں وہ صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے کہ جس کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس صورتِ حال کو ناول نگار نے یوں پیش کیا ہے

> "نائن الیون کے بعد امریکہ میں بہت سخت معاشی مراجعت کا دور چل رہا تھا کمپنی آؤٹ اف بزنس ہو رہی تھی ملازمین کو پنک سلپ دی جا رہی تھی لوگ بے روزگار ہوتے جا چلے جا رہے تھے ہندو مسلم سے سبھی کو شک کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا امریکنز کے دماغوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو چکے تھے ایک بے یقینی کی فضا تھی جس کا کوئی انت نظر نہیں ارہا تھا" [19]

نائن الیون کے بعد پاکستانی نژاد لوگوں کو شدید ذہنی اور نفسیاتی صدمات کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہاں تک کہ ان کو ملازمت کے لیے شک و شبہات کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ ناول نگار نے ایک جگہ اس صورت حال کو اس طرح پیش کیا ہے۔ مراد جب ایک ملازمت کے لیے ایک امریکی خاندان سے رابطہ کرتا ہے تو اسے اس طرح کی باتیں سننے کو ملتی ہیں۔

> "تم پاکستانی ہو اور پاکستانی دہشت گرد ہوتے ہیں ابھی تو نائن الیون کا زخم تازہ ہے۔ مجھے اپنے ماں باپ کی فکر ہے تمہیں اپنا سوشل سیکیورٹی نمبر، آئی ڈی وغیرہ سب ہمیں دینا ہو گا۔ میرے ماں باپ معصوم ہیں، تم ان کی عمر کا فائدہ اٹھانہ لینا، میں ایک فون کال کے فاصلے پر ہوں سمجھے "[20]

تمام ایشیائی خصوصا پاکستانیوں اور مسلمانوں کو شدید ذہنی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کو تمام امریکن شک کی نظر سے دیکھتے ہیں جیسے یہ حملہ انھوں نے کیا ہو۔ یہیں سے ناول میں وہ حالات بتائے گئے ہیں جو کسی نہ کسی نفسیاتی یا جذباتی ٹروما کی صورت میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ ناول کے مختلف کردار اپنی اپنی نوعیت میں جذباتی اور نفسیاتی عارضوں کا شکار نظر آتے ہیں۔ وہ پاکستانی جو امریکہ میں پیدا ہوئے تھے اور اپنے آپ کو امریکن تصور کرتے تھے اور امریکہ ہی کو اپنا حقیقی وطن مانتے تھے۔ کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں کو بھی باقی امریکیوں کی طرح وہ تمام حقوق حاصل تھے جو امریکن شہریوں کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ مراد کی ماں جو اپنے وطن سے محبت کو کبھی نہ بھلا سکی، اپنے بیٹے کے دل میں پاکستان کی محبت جگانے میں ناکام رہتی ہے۔ سجیلا کو اس بات کا دکھ ہوتا ہے کہ میری اولاد پاکستان کے لیے ویسے نہیں سوچتی جیسے میں۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اولاد اور ماں کے درمیان ایک مکمل نفسیاتی الجھن زیر کار رہتی ہے یہ وہ نفسیاتی الجھن ہوتی ہے جو ماں اور اولاد کے درمیان ایک فرق کو لا کھڑا کر دیتی ہے۔ ماں اپنے بچوں کے امریکی مزاج کے ہاتھوں پریشان ہوتی ہے مگر کچھ کہہ نہیں پاتی۔ اپنے جذباتی احساسات کی عدم ترسیل کی وجہ سے ایک صدمے یا ٹراما کا شکار رہتی ہے۔ مثلا ایک موقع پر سجیلہ کے خیالات ناول میں یوں دکھائی گئے ہیں۔

> "یہ صحیح تھا کہ وہ اپنے بچوں سے بے انتہا محبت کرتی تھی اور ان کی مرضی کے آگے سر جھکا دیتی تھی۔ کافی حد تک ان کی دوست بھی تھی مگر دوست ہونے کے چند فائدے اور نقصان بھی تو ہوتے ہیں۔ فائدہ یہ کہ بچے جس موضوع پر چاہیں ماں سے آسانی کے ساتھ بات کر سکتے ہیں، جھجکتے نہیں مگر پھر آپ کی پیرنٹ اتھارٹی کو تسلیم کرنے سے بھی قطعا انکاری ہو جاتے ہیں۔ ماڈرن ماں باپ کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ پیرنٹ بنے یا دوست" [21]

یہ وہ المیہ ہے جو مشرقی ماں باپ اور مغربی پیداوار کے درمیان ایک شدید ترین رکاوٹ کے طور پر سامنے آتا ہے۔ مشرقی اقدار کے حامل ماں باپ کے لیے یہ سوہانِ روح ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہی اولاد پر اس طرح کنٹرول نہیں کر سکتے جیسے کہ مشرق کی میں روایت ہے۔ ناول کے کردار اور سماجی حالات کی پیش کش مجموعی طور پر اس ٹروما کا اظہار ہے جس میں ہر چیز ہر سوچ اور ہر کردار کسی نہ کسی نفسیاتی صدمے کا شکار نظر آتا ہے اور جسے نفسیات کی زبان میں اجتماعی ٹراما کہا جاتا ہے۔ یہاں ہم چند کرداروں کا ذکر کرتے ہیں

ناول میں سجیلا کا کردار ایک ایسی خاتون کے طور پر سامنے آتا ہے جو پڑھی لکھی ہے صحافی ہے مگر اس کا خاوند عاقل اس پر بے جا پابندیاں لگاتا ہے۔ یہ اپنے شوہر کے ساتھ ستر کی دہائی میں امریکہ آباد ہوتی ہے۔ ایک پڑھی لکھی خاتون ہونے کے ناطے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ بھی ایک آزاد خاتون کی طرح اپنی پیشہ وارانہ خدمات سرانجام دے مگر اس کا شوہر اس کے سخت خلاف ہوتا ہے جیسا کہ ناول میں ایک جگہ بتایا گیا ہے

> "سجیلہ ایک پڑھی لکھی ذہین، باشعور عورت تھی۔ وہ شادی کے بعد بھی اپنا جرنلزم کا کیریئر جاری رکھنا چاہتی تھی۔ مگر اس کے شوہر اس کے اس فیصلے سے متفق نہیں تھے ۔ سجیلہ شادی سے پہلے پاکستان میں بھی بطور جرنلیسٹ بہت فعال زندگی گزار چکی تھی۔ اخباروں میں لکھنا، گاؤں گاؤں گھوم کر مواد اکٹھا کرنا، بین الاقوامی میڈیا میں رپورٹیں بھیجنا، یہ وہ سب کر چکی تھی اور اسے اس کا شوق بھی تھا۔ عاقل بیگ کو ایک روایتی گھریلو بیوی چاہیے تھی۔ ورکنگ وومن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر روز اپنی بیوی سے دور ہوتا چلا گیا" [22]

اب ایک ایسی خاتون جو پڑھی لکھی ہو بطور صحافی کام بھی کر چکی ہو تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ایک گھریلو عورت کی طرح زندگی بسر کرتی۔ لہذا یہیں سے ان کے دماغوں میں ایک خلش پیدا ہونا شروع ہوئی جو بالاخر ان دونوں کی علاحدگی پر منتج ہوئی۔ یہ صدمہ سجیلا جیسی خاتون کے لیے نہایت مشکل تھا اس لیے وہ ری ایکشن کے طور پر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان چلی جاتی ہے۔ یہاں اس کی زندگی ایسے دہرائے پر کھڑی ہوتی ہوئی نظر آتی ہے جہاں وہ اپنی ذاتی انا اور بچوں کے لیے محبت کے درمیان نفسیاتی اور جذباتی دباؤ کا شکار ہو جاتی ہے۔ اسے اپنی زندگی کے برباد ہونے کا دکھ اور صدمہ تو اپنی جگہ تھا ہی مگر اپنے بچوں کی محبت اور دوری نے بھی اس کے دل میں ایک آگ لگا رکھی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پاکستان اور امریکہ کی سرزمینوں میں پنڈولم کی طرح جھولتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مزید یہ کہ نائن الیون نے اس کے اپنے بچوں کے حوالے سے خدشات کو مزید بڑھوتری دی۔ اپنے بیٹے کی شادی کے حوالے سے بھی وہ مطمئن نظر نہیں آتی۔ شمع جو اس کے بیٹے کی بیوی ہوتی ہے اگرچہ ہوتی بہت خوب صورت ہے مگر وہ بھی ایک شدید نفسیاتی عارضے کا شکار ہوتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنے کی بجائے اپنے ماں باپ کے گھر رہنا پسند کرتی ہے۔ شمع کا کردار شدید نفسیاتی الجھنوں کا شکار نظر آتا ہے۔ وپ اپنے ماں باپ کی مسلسل تلخیوں اور لڑائیوں کی وجہ سے جذباتی ٹروما میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ماں باپ کی نگرانی کے لیے وہ انھی کے ساتھ رہتی ہے۔ ایک مرتبہ ان کی لڑائیوں سے تنگ آ کر گھر سے بھاگ

جاتی ہے اور جنسی تشدد کا سامنا کرتی ہے۔ یہ بات سجیلہ کے دل و دماغ پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ اپنے بچے کی اکیلی زندگی کے لیے بہت فکر مند رہتی ہے، مزید یہ کہ شمع کو سجیلہ کے بیٹے کے گھر رہنے کی حرکت بھی اچھی نہیں لگتی۔ سجیلا مجبور ہوتی ہے کہ وہ اس عمر میں کہاں جائے۔ وہ بچے کو بھی نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ بیٹی کنول اس قابل نہ تھی کہ اس کے ساتھ رہا جاسکے اور اگر بیٹے کے ساتھ رہے تو اس کی بیوی طعنے مارتی ہے کہ اس نے بیٹے کے گھر پر قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ اگرچہ ایک مشرقی ساس ہوتی ہے مگر امریکی اقدار نے اسے بے بس کر رکھا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ سب کچھ ہوتا دیکھ کر بھی کچھ نہ کرنے پر مجبور تھی۔ وہ بیٹے کی محبت میں اپنے ذاتی احساسات و جذبات کو سختی سے کچل دیتی ہے اور بہو کی منت کرتی ہے کہ وہ اس کے بیٹے کے ساتھ رہے اور اس کا خیال رکھے مگر بہو اپنے پیچیدہ نفسیاتی مسائل کی وجہ سے اپنے شوہر کے قریب نہیں ہو سکی۔ شمع جو مراد کی بیوی ہے اپنے والدین کے لڑائی جھگڑے کی وجہ سے بچپن ہی سے چائلڈ ہڈ ٹراما میں مبتلا ہو کر سخت نفسیاتی اور جذباتی الجھن کا شکار ہوتی ہے۔

اس ناول کے سارے کردار ہی تقریباً کسی نہ کسی طرح کے ٹروما کا شکار نظر آتے ہیں۔ ناول کا ایک کردار مسز چین فلیش بیک کے سنگین اثرات میں جی رہی ہوتی ہیں۔ انہیں رہ رہ کر اپنی پرانی زندگی یاد آتی ہے اور وہ اپنے زندگی کے ابتدائی دور میں چلی جاتی ہیں۔ مسز چین کا اصل وطن گیانا ہوتا ہے جہاں وہ اپنے شوہر کے ساتھ بہت اچھی زندگی بر کر رہی ہوتی ہیں۔ شوہر کے ساتھ بہت محبت کا تعلق ہوتا ہے مگر گیانا کے حاکم نے ان سے زبردستی جنسی تعلق قائم کیا جس کی وجہ سے وہ ایک بیٹی کو جنم دیتی ہیں جس کا نام میری گولڈ ہوتا ہے۔ گیانا کا حاکم عجیب ذہن کا مالک ہوتا ہے وہ مسز چین کے شوہر کو بھی مجبور کرتا ہے کہ وہ بھی کسی عورت سے جنسی تعلق قائم کرے۔ اسی تعلق کی وجہ سے اس کی ایک بیٹی پیدا ہوتی ہے جس کا نام شیری ہوتا ہے۔ مسز چین اپنی حقیقی بیٹی میری گولڈ کو کبھی دل سے نہ اپنا سکی۔ وہ اپنے شوہر کی بیٹی سے زیادہ محبت کرتی ہیں اور جب امریکہ کی مداخلت پر وہ لوگ گیانا سے امریکا آئے تو مسز چین اپنی بیٹی میری گولڈ کو گیانا ہی میں کھو دیتی ہیں۔ لہذا وہ اپنے شوہر کی بیٹی شیری کو لے کر امریکا آجاتی ہیں۔ گیانا میں گزرنے والے حادثے نے مسز چین کو بھی نفسیاتی اور جذباتی لحاظ سے توڑا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ کچھ دیر کے لیے حال اور مستقبل سے بیگانہ ہو کر ماضی کے ورق پلٹ کر ان کے اندر محو سفر ہو جاتی ہیں۔ وہ اکثر فلیش بیک کا شکار ہو کر گیانہ کی یادوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور ناسٹالجیا کا شکار ہو جاتی ہیں۔ مسز جی چین کا گھر قدیم ساز و سامان سے بھرا ہوتا ہے اور وہ ہر اس چیز کو محفوظ رکھنا چاہتی ہیں جس کے ساتھ ان کی زندگی کا کوئی نہ کوئی واقعہ جڑا ہوتا ہے۔ ماہرین نفسیات کے مطابق انسان کی یہ

حالت ماضی پرستی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ایک فرد جذباتی طور پر اپنی پرانی اقدار یا اپنی زندگی سے جڑی ہوئی پرانی اشیا سے اس قدر گہری وابستگی رکھتا ہے کہ ان چیزوں کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ شیری کی ماں مسز چین بھی اسی فوبیا کا شکار نظر آتی ہیں۔ مراد جب مسز چین کے ہاں ان کی دیکھ بال کے لیے ملازمت اختیا کرتا ہے تو وہ اور شیری کو مسز چین کی اس صورت حال سے سخت تشویش محسو کرتے ہیں۔ وہ کوشش کر کے مسز چین کو پرانی یادوں سے نکالنا چاہتے ہیں مگر مسز چین اپنی ماضی کی یادوں سے نہیں نکل پاتی اور اکثر ایک بڑی مدت کے لیے زمانہ حال سے بے گانہ ہو کر ماضی کے اندر کھو جاتی ہیں۔ مسز چین کے کردار پر ٹراما کاورکنگ تھرو نظریہ (ڈومینک لاکیپرہ کا نظریہ) صادق آتا ہے جس کے مطابق ایک انسان اپنی اذیت اور نفسیاتی الجھن کے ساتھ ساتھ اپنی روزمرہ زندھی کی شناخت بھی کر سکتا ہے۔اس ناول کا ایک اور کردار ناول کے مرکزی کردار مراد کے ساتھ ساتھ ہی نظر آتا ہے یہ کردار ایک خوب صورت لڑکی ڈلائیلا ہے جس کو مختصر اڈی کہا جاتا تھا۔ڈی اپنے آپ میں ایک منتشر المزاج لڑکی تھی۔اس کی ماں جولیا تھی جس نے بہت محبت سے ڈی کو پالا ہوتا ہے۔ڈی کسی خاص نفسیاتی عارضے کا شکار تھی،شاید محبت کی کمی نے اس کی شخصیت کے اندر ایک پراسراریت اور ایک خلا چھوڑ رکھا تھا۔پہلے پہل وہ ایک پاکستانی لڑکے اسفند کے قریب ہوتی ہے مگر ساتھ ساتھ مراد کو بھی پسند کرتی ہے۔ڈی جنسی لحاظ سے بہت شعلہ مزاجی رکھتی تھی۔جوان اور خوب صورت لڑکے خصوصا ایشیائی لڑکے اس کی خاص کمزوری تھے۔وہ بات بات پر بھڑک اٹھنے والی لڑکی ہوتی ہے اور اپنی کسی خاص کمزوری پر قابو پانے کے لیے شراب نوشی کرتی ہے اور جنسی بھڑک کے لیے خاص قسم کی گولیاں کھاتی رہتی ہے ڈی کی ماں جولیا خود بھی پراسرار قسم کی خاتون ہوتی ہے۔اس نے ڈی سے اس کے بچپن کی بہت ساری باتیں چھپا رکھی ہوتی ہیں۔ڈی کو اپنے ماں باپ اور خاندان کا علم نہیں ہوتا۔یہی چیز اس کی شخصیت میں شکست وریخت کا سبب بنتی جارہی تھی۔ایک دن جب وہ چپکے سے ماں کی باتیں سن لیتی ہے جو ماں نے اسے کبھی نہیں بتائی ہوتی تو وہ جذباتی اور نفسیاتی طور پر شدید صدمے کا شکار ہو جاتی ہے۔اسے اپنی ذات کے بارے میں نئی معلومات نے توڑ کر رکھ دیا ہوتا ہے ڈی کو اپنی بے مقصد اور بے نتیجا زندگی پر دکھ ہوتا ہے اور وہ سوچتی ہے کہ

> "میری ساری زندگی ایک فریب ایک مفروضہ ہے۔یہ میرے لیے کیسے بہتر ہو سکتا ہے؟ مگر مجھے کچھ کرنا ہو گا،اپنے لیے،اپنی زندگی کے لیے،اپنی حقیقت کے لیے۔میں آرام سے نہیں بیٹھوں گی۔آخر میں میری زندگی کا کوئی تو مقصد ہونا چاہیے،مجھے میرا

مقصد مل رہا ہے، لیکن میرا دل کیوں کٹ رہا ہے، میری ذات کیوں ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہے؟ میری روح زخمی ہو کر کیوں سسک رہی ہے؟ مجھے چین کیوں نہیں پڑ رہا۔ کیا مجھے چین نصیب نہیں ہو گا؟ ڈی نے اپنے آنسو پونچھے اور لمبی سانس لی۔ اس نے اپنے بیگ سے اپنی پسندیدہ گولی نکالی اور پانی سے حلق کے نیچے اتار لی" [23]

ڈی اپنی زندگی کی شکستگی سے فرار کے لیے جنسی گولیاں کھاتی ہے اور نوجوان لڑکوں سے اپنی مراد پوری کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ بالکل ایک نارمل لڑکی کی طرح زندگی نہیں جی رہی ہوتی۔ ڈی مراد کی دوست شیری سے بھی اس لیے حسد کرتی ہے کہ وہ اسے اپنی راہ کا کانٹا سمجھتی ہے۔ مراد چوں کہ شیری کے بہت قریب ہوتا ہے اور اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ یہ بات ڈی کو بالکل بھی پسند نہیں تھی کہ شیری اس سے مراد کو چھین لے۔ حالاں کہ شیری اور مراد کے درمیان وہ خود آئی ہوتی ہے۔ ڈی کا کردار بہت الجھا ہوا اور کسی سچی، پکی اور ابدی محبت کا متلاشی تھا مگر اسے ہر طرف سے ناکامیوں اور نامرادیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے دماغ میں بغاوت آنا شروع ہو جاتی ہے اور وہ زبردستی اپنی مرضی اور خواہش کو پورا کرنے کے طریقے اختیار کرتی ہے۔ گولیوں کے سہارے اپنے جنسی تسکین کو پورا کرتی ہے اور اس حرکت کو اپنا حق سمجھتی ہے اور اس پر ذرا بھی نادم نہیں ہوتی۔ ہمیں ڈی کے کردار میں ابنارمل خصوصیات پوری طرح عیاں نظر آتی ہیں۔ وہ اپنی ذات میں محرومیوں کے صدمے کا غصہ مختلف انداز میں نکالتی ہے۔ مراد کو بھی مشروب میں جنسی گولیاں کھلا کر وہ اپنی خواہش کو پورا کرتی ہے اور مراد کو شیری سے الگ ہونے کے لیے دھمکاتی ہے۔ دوسری طرف اسے اپنی ماں جولیا سے بھی سخت شکایت ہوتی ہے جو اسے اس کی اصل حقیقت نہیں بتا رہی ہوتی۔ ڈی کا مزاج کسی سماجی پابندی کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا، ایسے لگتا ہے کہ وہ اپنی ذات کا انتقام ہر انسان اور ہر اصولِ زندگی کو توڑ کر لینا چاہتی ہے۔ مراد سے زبردستی جنسی تعلق قائم کرنے کے بعد اس کے بولے جانے والے جملے نہ صرف اس کے نفسیاتی ٹراما کا ثبوت ہیں بل کہ اس بات کا بھی ثبوت ہیں کہ وہ جذباتی لحاظ سے بے حد ٹوٹ چکی ہوتی ہے مثلاً اس موقعے پر مراد کو مخاطب کرتے ہوئے وہ کہتی ہے

"یہ فری ورلڈ ہے، ہم سب آزاد پیدا ہوئے تھے، اکیلے آئے تھے اور اکیلے ہی جائیں گے راستے میں کوئی ایک پل مل جائے تو ساتھ ہو لینا چاہیے میری تو یہی فلاسفی ہے" [24]

ڈی دو محاذوں پر اپنے اعصاب کو لڑا رہی تھی۔ مگر اس کی شخصیت میں کمی کی اصل وجہ اس کی زندگی کی وہ محرومی تھی جس نے اسے ذہنی طور پر اس صورت حال میں پہنچا دیا ہوا تھا۔ ڈی جو ڈیلائلہ کے نام سے ناول

میں نظر آتی ہے اسے اپنی حقیقت کی عدم دریافت نے ذہنی طور پر توڑ کر رکھا ہوتا ہے۔ ڈیا یک دن اپنی ماں جولیا کی اپنے بھائی کو کی جانے والی کال کی باتیں سن لیتی ہے اور شدید دماغی صدمے میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اسے جب اپنی اس حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ وہ جولیا کی بیٹی نہیں تو وہ کمرے میں بند ہو کر چیخنا شروع کر دیتی ہے اور شدید ٹرومیٹک کیفیت میں چلی جاتی ہے۔ مثلاً جب اس کی ماں جولیا اسے کمرے میں یوں چیختے سنتی ہے تو وہ پتا کرنے ڈی کے کمرے کی طرف آتی ہے، اس ساری کیفیت کو ناول نگار نے یوں بیان کیا ہے

"جولیا کو ڈی کی ایک چیخ نما آواز سنائی دی۔ جولیا سے رہا نہ گیا اس نے پورا پٹ کھول دیا ،ڈی اپنی ایک ریگ ڈول کے چھیتھڑے اڑا رہی تھی، یہ وہ گڑیا تھی جو بچپن میں اس کے ساتھ سوتی تھی۔ ڈی ایک پل بھی اس کو جدا نہ کرتی تھی، کہتی تھی میری بہن ہے، سہیلی ہے۔ میں اسے دل کی ہر بات کر لیتی ہوں۔" یہ کیا کر رہی ہو"؟ ڈی! جولیا نے جب پوچھا تو وہ چیخ کر بولی "میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی، برباد کر دوں گی، یہ مجھ سے بچنے نہیں پائے گی۔ ماں نے پوچھا کس کو؟ ڈی نے قہر آلود آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا شیری!! وہ کمینی کب سے میرے ساتھ چپکی ہوئی ہے، میری ہر خوشی مجھ سے چھین لیتی ہے، مگر اب نہیں، اب میں اپنا حق لے کر رہوں گی۔ شیری کو سزا ملے گی تم دیکھنا۔ ڈی دیوانی سی ہو رہی تھی جولیا کی آنکھوں میں آنسو آ گے۔ پاس بیٹھ کر اپنے قریب کرنا چاہا تو ڈی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا" جولیا تم میری فکر نہ کرو میں ٹھیک ہوں بس آج بتاؤ کہ میرا باپ کون تھا؟ کیا کرتا تھا؟ تم نے مجھے ایڈاپٹ کیا تھا؟ گود لیا تھا۔ مجھے میرے ماں باپ کا نہیں بتایا، مجھے بتاؤ ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا جولیا۔ ڈی نے ماں کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑا تو جولیا رونے لگی "[25]

یہ ڈائیلاگ ڈی کی نفسیاتی الجھنوں کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دوہرے دکھ یا ٹرومے کا شکار ہوتی ہے۔ ایک اس کو اس کے ماں باپ اور اپنی ذات کا علم نہ ہونا دوسرا مراد سے محبت میں شرکت نے اسے شدید جذباتی بنا دیا تھا۔ ماہرِ نفسیات کیتھی کراوتھ کے پیش کردہ دوہرے ٹراما کے نظریہ کے مطابق ایک فرد دو صدموں کا شکار ہو سکتا ہے۔ ایک وہ سانحہ جس سے وہ فرد گزرا ہوتا ہے اور جس کا خوف اسے خوف زدہ کیے رکھتا ہے۔ دوسرا صدمایا ٹراما یہ ہوتا ہے کہ ایسا متاثرہ انسان مسلسل اس خوف ناک تجربے کو بار بار اذیت محسوس کرتا ہے۔ اس نظریے کی روشنی میں ڈی کے کردار کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں معلوم ہوتا

ہے کہ وہ بھی دوہرے ٹروما کا شکار تھی۔ ایک اس کی اپنی شخصیت میں محبت اور والدین کی شفقت کی کمی اور دوسرا اس کمی کی اذیت جو مسلسل اس کے دماغ کو منتشر کر رہی تھی۔ ڈی ناول میں پہلے ایک ذیلی کردار کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے مگر پھر سارا ناول تقریباً اس کے گرد گھومتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ڈی کی شخصیت کا خلا اس کے بچپن سے جڑا تھا اور اس کا پتہ ناول کے آخر میں چلتا ہے جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ جولیا جس نے اسے ماں کی طرح پالا وہ اس کی اصل ماں نہیں ہوتی بل کہ اس کی ماں مسز چین ہے جو گیانہ میں سو کے نام سے رہتی تھی۔ ڈی دراصل مسز چین کی وہ بیٹی تھی جو گیانا کے شہر کے حاکم جونز کے زبردستی کے تعلق سے پیدا ہوئی تھی۔ بعد میں جب جونز کے ستم بڑھے تو وہاں امریکی مدد پہنچی تو بے شمار لوگ اس امدادی سرگرمی کے تحت امریکہ چلے آئے۔ مسز چین اپنی اس بیٹی جس کا نام میری گولڈ تھا کو کبھی قبول نہ کر سکی۔ ڈی جو درحقیقت میری گولڈ تھی، مراد کی وجہ سے اپنی ماں تک پہنچنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ ڈی مراد سے محبت کرتی ہے مگر جب مراد اسے صرف وقت گزاری کے طور لیتا ہے تو ڈی آپے سے باہر ہو جاتی ہے اور مراد پر دہشت گردی کے الزامات لگا کر اسے جیل میں بھجوا دیتی ہے۔ اس سارے منظر میں ڈی کا کردار بالکل ایک نفسیاتی صدمے والے انسان جیسا نظر آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ہر اس انسان سے متنفر ہے جس نے اس سے اس کا بچپن اور اس کی محبت چھینی۔ ڈی پر اکثر جنون کے دورے پڑتے اور وہ اکثر جنونی حرکات کرتی رہتی اور مراد جو کہ شیری کو پسند کرتا تھا، جب ڈی کی طرف مائل نہیں ہوتا تو وہ جنون میں اس کے ان بالوں کو کاٹ دیتی ہے جن سے اسے پیار ہوتا ہے۔ اس موقعے پر اس کی شدید صدماتی کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

> "ڈی نے ہونٹوں کو سکیڑا اور اپنے مخصوص انداز میں وہی سیٹی بجانی شروع کر دی جس کی دھن سے کسی قدیم زمانے اور تہذیب کی یاد آتی تھی۔ پھر اچانک اس نے قینچی اٹھائی اور بے خبر مراد کے بالوں کو کترنا شروع کر دیا۔ کالے کالے چمکتے لمبے بال دیکھ کر ڈی کے جسم میں چونٹیاں سی رینگنے لگی۔ ان کو ہاتھوں کے پیالے میں لے کر چومنے لگی پھر اس نے سوئے ہوئے بے خبر محبوب کی بہت سی تصویریں کھینچنا شروع کر دی اسے بہت مزہ آرہا تھا"[26]

ناول کے اندر ڈی کے کردار اور ڈی کے گرد گھومنے والی ساری فضا المیاتی اور نفسیاتی دکھ سے ترتیب دی گئی ہے۔ ڈی کو جب مکمل طور پر پتا لگتا ہے کہ مسز چین اصل میں اس کی ماں ہے اور شیری مسز چین کے شوہر کی وہ بیٹی ہے جس کو لے کر مسز چین گیانا سے امریکا آتی تھی تو ڈی غصے اور اذیت سے زیادہ انتشار کا شکار ہو

جاتی ہے۔ وہ اپنی ماں کو اغوا کر کے اسی آئی لینڈ لے آتی ہے جس کی یادوں میں مسز چیں گم رہا کرتی تھی۔ ماں نے واپس شیری کے پاس جانے کی ضد کی تو اس نے کے بالوں کا بھی وہی حال کیا جو مراد کے بالوں کا کیا تھا۔

"اب میں آپ کو اپنی مرضی کے لُک دوں گی۔ فرسٹ کلاس اور ونڈر فل ڈی اٹھی اور
مسز جین کی گردن کے چادر لپیٹی اور قینچی لے کر ان کے برسوں سے پالے ہوئے لمبے
لمبے سرمئی بال کاٹ کاٹ کر نیچے گرانا شروع کر دیے " [27]

ڈی کے کردار کا اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو وہ ارلی چائلڈ ہوڈ ٹروما (Early Childhood Trauma) کا شکار نظر آتی ہے. بچپن سے ماں کی محبت کی محرومی نے اس کے نفسیاتی ڈھانچے کو اس طرح ترتیب دیا کہ اس کی شخصیت کے اندر ایک خلا بن جاتا ہے اور جس کو پور کرنے کے لیے وہ انتہائی متشدد اقدامات بھی کرتی ہے۔ اس کی تمام تر لایعنی اور بے ہنگم حرکات کی وجہ بچپن ہی سے محبت اور شفقت کی محرومی تھی۔ یہ محرومی اس کے دماغ میں پیوست ہو کر اسے ایک ابنارمل زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس کے تمام تر اقدامات اسی محرومی کے خلاف ایک ردِ عمل تھے۔ محبت کی تڑپ اس کو بے طرح پریشان کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ ڈی کا سارا کردار شدید ذہنی تناؤ کا شکار نظر آتا ہے جس میں سوائے تخریب کاری کے کچھ اور نظر نہیں آتا۔ ڈی کے ٹروما کو ہم دوسرے درجے کا ٹراما بھی قرار دے سکتے ہیں جسے دائمی صدمہ یا کرونک ٹراما کہا جاتا ہے۔ یہ وہ ٹراما ہے جو انسان کی ذات کے ساتھ ساتھ طویل ہوتا جاتا ہے اور آخر کار کسی پیچیدہ ترین صورت میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس ناول میں مراد کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کردار مشرق و مغرب کی تہذیبی کش مکش کی بہترین عکاسی ہے۔ مراد ایک پاکستانی جوڑے کا بیٹا ہے جو امریکہ ہی میں پیدا ہوا اور امریکہ ہی میں پرورش پاتا ہے۔ اس کی بہن کنول بھی امریکن فکر کی حامل لڑکی ہوتی ہے۔ ان دونوں کی ماں سجیلہ خالص پاکستانی ہے اور اسے اپنی اولاد کی بلا کی حقیقت پسندی سے خوف آتا ہے اور وہ اسے ان کی بے باکی سے تعبیر کرتی ہے۔ مراد کا کردار ایک لبرل امریکن مسلمان کے طور پر بیان کیا گیا ہے جسے امریکہ سے محبت ہوتی ہے۔ نائن الیون سے پہلے وہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں کمپنی میں جاب کرتا ہے مگر نائن الیون کے بعد اسے اپنی جاب سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ سانحہ نائن الیون اس کی زندگی میں ایک ایسے حادثے کے طور پر سامنے آتا ہے کہ اس کے بعد اس کی زندگی میں پے در پے مسائل آن پڑتے ہیں اور وہ سخت اذیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے دوست اسفند کی موت اسے اکثر غمناک کر دیتی ہے وہ ماں باپ سے الگ ایک فلیٹ میں رہتا ہے۔ نوکری چلی جانے کے بعد وہ مسٹر اور مسز چین کے گھر کیئر ٹیکر کی نوکری کرتا ہے۔ یہی شیری

اس کی زندگی میں آتی ہے۔ شمع سے اس کی شادی ہوئی ہوتی ہے جو نائن الیون کے بعد علاحدگی پر ختم ہو جاتی ہے۔ شیری اس کی زندگی کا ایک خوب صورت اضافہ بنتی تو ہے مگر ڈیلائلہ جو ڈی کے نام سے جانی جاتی ہے اس کی زندگی اس قدر تلخ بنا دیتی ہے کہ وہ خوف اور ڈپریشن میں چلا جاتا ہے۔ ڈی جب دیکھتی ہے کہ مراد شیری کا پیچھا نہیں چھوڑتا تو وہ اس کو سخت ذہنی تکالیف پہنچاتی ہے۔ مراد کے ساتھ اس سے جڑے جو لوگ بھی تھے ڈی ان کو طرح طرح کے طریقوں سے ذہنی اذیت میں مبتلا کرتی ہے۔ مراد کی بہن کنول کی زندگی کو بھی ڈی نے انتقاماً مکمل خراب کیا۔ ایسے میں مراد شدید ذہنی اذیت کا شکار ہو کر نفسیاتی طور پر الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ ڈی سے اپنے گزارے ہوئے لمحات کو کوستا ہے مگر ڈی اب اس کے گلے کا پھندہ بن چکی ہوتی ہے۔ ڈی مراد کو شیری کا پیچھا نہ چھوڑنے پر ایک فرضی کیس میں بطور دہشت گرد پھنسا دیتی ہے اور مراد کو جیل جانا پڑتا ہے۔ مراد کا سارا عرصہ جو جیل میں گزرتا ہے سخت اذیت والا ہوتا ہے۔ مراد اگرچہ صدمے میں اپنے مکمل ہوش و حواس نہیں کھوتا مگر وہ ٹرومیٹک صورت کا سامنا کرتا ہے۔ وہ وقتی طور پر شدید تناؤ کا شکار ہوتا ہے جس سے نفسیات کی زبان میں ایکیوٹ ٹراما کہتے ہیں۔ مراد پر بھی ایسی بے شمار ساعتیں گزری جب وہ ان حالات سے فرار ہو کر کسی پر سکون گوشے کو تلاش کرنا چاہتا ہے۔ جیل میں اسے مسلم دہشت گرد کہہ کر دیگر قیدیوں زدوکوپ کرتے ہیں اور مار مار کر زخمی کر دیتے ہیں۔ یہ کیفیت اسے شدید صدمہ میں مبتلا کرتی ہے کہ وہ ایک محب وطن امریکن ہے تو اس پر ایسے الزامات کیوں لگائے جا رہے ہیں اس صورت حال کو ناول نگار نے ایسے بیان کیا ہے۔ جیل میں جانے نے مراد کو جذباتی لحاظ سے بہت صدمے کا شکار کر دیا ہوتا ہے۔ جب اس کے ماں باپ جیل میں اسے ملنے جاتے ہیں تو وہ سخت اضطراری کیفیت میں ان سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔

"مام، ڈیڈ پلیز مجھے یہاں سے نکالیں، میں مر جاؤں گا یا پھر اپنے آپ کو مار ڈالوں گا ۔مراد لرزتی آواز میں بولا "پلیز ہیلپ می" میری جان پہلے یہ بتاؤ کہ یہ چھوٹیں کیسی ہیں؟ مام نے پوچھا "مام یہاں کچھ قیدیوں نے مجھے دہشت کر پکارا اور چھیڑا اور میرا مذاق اڑایا۔ آتے جاتے مجھے مسلم ٹیررسٹ کہہ کر تھپڑ جڑتے ہیں " [28]

مراد کو مارے جانے کا خوف بہت زیادہ محسوس ہوتا ہے اور وہ موت کے خوف سے چلاتا ہے دہشت اور موت کا خوف اسے سخت ذہنی اذیت کا صدمے کا شکار کرتا ہے

"ڈیڈ، مام میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ اگر انہوں نے مجھے دھر لیا اور مجھے رہائی نہ ملی تو میں بھاگ جاؤں گا۔ یہ لوگ مجھے گوانتاناموبے بھیج دیں گے، وہاں سے کبھی بھی کوئی بچ کر

نہیں نکل سکتا۔ میں وہاں گل سڑ کر مر جاؤں گا، میں پکڑا نہیں جانا چاہتا، میں امریکہ سے بھاگ جاؤں گا " [29]

مراد کا خوف بے جانہ تھا ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کو گوانتاناموبے میں لے جا کر غیر انسانی سلوک کے ساتھ تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور مار دیا گیا۔ اس لیے وہ بھی اس خوف سے ڈر رہا تھا کہ اسے بھی ایسے ہی سلوک کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مراد کے کردار اور اس کے خوف، ڈر اور ذہنی صدمے کو اگر ٹراما تھیوری کے مطابق پرکھا جائے تو مراد اگرچہ پوری طرح کسی مخصوص نفسیاتی الجھن کا شکار نہیں ہوتا مگر وہ حادثے اور سانحے کے اثرات سے بری طرح متاثر ہوتا ہے اور ٹراما کے ابتدائی مراحل سے گزرتا ہے۔ اس کے اس ٹرومے کو ایکیوٹ ٹراما کہا جاتا ہے۔ چنانچہ مراد بھی اس ناول کے ان کرداروں میں شامل ہے جو کسی نہ کسی طرح ٹروميٹک اسٹریس سے متاثر ہوئے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس ناول کا کردار شمع ہو یا جولیا، مسز چین ہو یا ڈی ہر ایک پر گہرے صدماتی اثرات نظر آتے ہیں۔

جاگنگ پارک

یہ ناول 2010 میں شہزاد پبلشرز، کراچی نے شائع کیا۔ نکہت حسن اپنے منفرد انداز، اسلوب اور اندازِ بیان میں اردو ادب اور اردو ناول نگاری میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ دورِ جدید کے مسائل کو آپ نے ایک نئے انداز سے سمجھا اور بیان کیا ہے۔ آپ کی تحریر کا کینوس بہت وسیع ہے، آپ کے بیان میں زندگی کے تمام پہلو اور زندگی کے ہر طبقے کا شعور ملتا ہے۔ آپ جس ہیجان انگیز معاشرے میں جی رہی ہیں تو اس کا آپ کی تحریروں میں بھی اثر ہونا لازمی تھا اور اس کا منطقی نتیجا یہ تھا کہ تمام معاشرتی افراتفری ایک موضوع کی صورت آپ کی تحریر میں شامل ہو۔ جاگنگ پارک ایک ایسا ناول ہے جس کو مختلف رنگوں کی دنیا کا ایک مرکز سمجھا جا سکتا ہے۔ کہنے کو تو جاگنگ پارک ایک ناول ہے اور ناول میں ایک پارک کا ذکر ہے۔ مگر فی الحقیقت یہ پارک اپنی فکر اور اصطلاح میں ایک وسیع تر معنی رکھتا ہے۔ یہ پارک اصل میں زمزمہ حیات کا وہ کونا ہے جس میں زندگی کا ہر رنگ مل سکتا ہے۔ البتہ یہ بات طے ہے کہ اس پارک کی ہر شے زندگی کی ایک کُلبلاتی تصویر پیش کر رہی ہے، جو کسی حقیقی سکون کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ چھوٹے چھوٹے معاشرتی کرداروں کو جاگنگ پارک کی دنیا میں لا کر بیان کیا گیا ہے جو کسی نہ کسی بے چینی اور بے قراری کا شکار ہیں۔ ایسے لگتا ہے کہ ہر فرد و بشر بکھرا ہے اور ذہنی طور پر منتشر المزاج ہے۔ غفور احمد اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"جاگنگ پارک ہیت اور موضوع کی جدت کی بنا پر ایک منفرد ناول ہے۔ یہاں مصنفہ دورِ جدید کے انسان کی ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کی گرہ کشائی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ حالیہ برسوں میں ہونے والی بے پناہ مادی ترقی اور اخلاق و اقدار کی شکست و ریخت نے زندگی کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بنا دیا ہے۔ گلوبل ویلج کی اصطلاح نے دنیا کو مزید سمیٹ دیا ہے۔"[30]

نائن الیون کے بعد رونما ہونے والے عالمی حالات میں ہر طبقہ انسانی پر بری طرح کے اثرات مرتب ہوے۔ ناول نگار نے اس ناول کے اندر پارک کو بھی ایک جیتے جاگتے کردار کی صورت میں پیش کیا ہے۔ پارک در اصل وہ مرکز ہے جہاں ہر فکر و نظر کا انسان آتا ہے اور اپنے اپنے انداز میں حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ آرائی کرتا ہے۔ جنگ، امن، سیاست، معشت، جہاد اور امریکہ، پاکستان، افغانستان، دہشت گردی وغیرہ جیسے بیانیے آئے روز اس پارک کے اندر مختلف کرداروں کی صورت بتائے جاتے ہیں۔ ناول میں زبیدہ کا کردار ایک ایسی عورت کے طور پر بتایا گیا ہے جو ذہنی اور قلبی سکون کے لیے پارک میں جاتی ہے اور وہاں موجود طرح طرح کی مخلوق کی باتیں سن کر مزید ذہنی کوفت اور ذہنی تکلیف کا شکار ہو جاتی ہے۔ جاگنگ پارک ایک ایسے سماجی ٹرومے کی صورت اور ایک زندہ کردار کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ یہ پارک نہیں بل کہ ہمہ قسم کی ایک آباد دنیا ہے جو کسی نہ کسی نفسیاتی عارضے کا شکار نظر آتی ہے۔ افر تفری، حالات کا منتشر ہونا، حالات کا بے قابو ہونا ،زندہ زندہ باد مردہ باد کی صدائیں، جہاد، قتل و غارت گری کی صدائیں اور مکمل غیر یقینی صورت حال کو اس پارک کی وساطت سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ ہر انسان بے کل ہے اور نفسیاتی اور جذباتی لحاظ سے صدمات کا شکار ہے۔ مثلاً ایک جگہ زبیدہ جو اس ناول کا مرکزی کردار ہے پارک کے مالی سے اس کی بیوی کی صحت اور زیادہ بچوں کی پیدائش کا سوال کرتی ہے تو مالی کا مکالمہ اس پوری فضا کو بیان کر دیتا ہے جس کے اندر اس دور کا ہر انسان جی رہا ہے۔ ایک تلخی اور ایک ذہنی کرب کی عکاسی ہوتی ہے۔ جب زبیدہ مالی سے کہتی ہے کہ اتنے بچے کیوں پیدا کر رہے ہو تمہاری عورت مر جائے گی

"کوئی نہیں مرتی، سب بے فضول باتیں ہیں، ہر جی اپنا رزق اپنے ساتھ لے کر آتا ہے ۔تم لوگوں کا کیا ہے؟ تمہارے بچے نہ گھر کے نہ گھاٹ کے، پیدا ہوتے ہیں تو ان کو امریکہ بھیج دیتے ہو، وہاں سے کوئی طالبان بن کر آتا ہے اور کوئی اسامہ اور کوئی ملا عمر۔ گولیاں تو ہمارے بچے کھاتے ہیں، ہم بچے پیدا نہیں کریں گے تو گولیاں کھانے کے لیے

بچے کہاں سے آئیں گے۔ ملبے تلے دبنے کے لیے بچے کہاں سے آئیں گے۔ سمندر میں
ڈوبنے کے لیے بچے کہاں سے آئیں گے۔ بس کرو بی بی اپنے گھر جاؤ"[31]

ایسا لگتا ہے کہ ہر کردار کسی شدید ذہنی کرب اور اذیت میں مبتلا ہے اور زندگی کی حقیقتوں کو تسلیم کرنے سے نظر چرا رہا ہے۔ پارک کی وساطت سے نوجوان نسل کے ذہن کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ جو ملکی اور بین الاقوامی حالات سے تنگ اور اپنے مستقبل سے مایوس جھنجلاہٹ، تلخی اور غصے کا شکار ہے۔ ملکی حالات کی ابتری نئی نسل کے لیے ایک ایسی بیماری کے طور پر نمایاں ہوتی ہے جو بہت تیزی سے نوجوان کے مستقبل اور حواس کو نگل رہی ہے۔ فاروق کا کردار جو مرکزی کردار زبیدہ کا بیٹا ہے۔ نائن الیون کے بعد ملکی اور بین الاقوامی حالات کے تناظر میں ہر نوجوان کی سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔ ایسی سوچ کی عکاسی جس میں مایوسی اور صدمہ دونوں شامل ہیں۔ ناول میں فاروق پر تبصرہ کرتے ہوے مصنفہ لکھتی ہیں

"فاروق کی بول چال میں ہمیشہ غصے اور جھنجھلاہٹ کی کیفیت ہوتی تھی وہ اپنے ماحول
، اپنے گھر اور اپنے ملک تک سے بے زار ہو چکا تھا۔ نوجوان نسل اور ان کی سوچ کا انداز
تیزی سے بدلہ تھا اور فاروق بھی آج ہی کا نوجوان تھا"[32]

اس ناول میں اگرچہ ٹروما کی وہ علامتیں نہیں ملتی جو ٹروما کی کسی قسم پر مکمل پوری اتر رہی ہوں۔ مگر جس طرح کے منتشر اور بکھرے ہوئے حالات بتائے گئے ہیں وہ کسی بڑے المیاتی اور صدماتی روگ کی علامت ہیں۔ ایسے لگتا ہے کہ معاشرے کا ہر فرد ہی برنگیختہ ہے، منتشر ہے اور غیر یقینی میں جی رہا ہے۔ آئے روز کے حالات نے انسانوں کے اذہان کو اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ وہ ایک ٹرانس یعنی نیم دیوانگی کی حالت میں جی رہے ہیں۔ ناول کا یہ ٹکڑا حالات کی ابتری کا آئینہ دار لگتا ہے۔

"دہشت، وحشت ،زنا بالجبر ، ظلم ، تشدد، غربت، سنگسار، کار وکاری، خودکش حملے،
بارودی سرنگیں، دھماکے دہشت گردی، جبر، ظلم، فاقہ، جہالت، قتل، المجاہد، القاعدہ،
اسامہ بن لادن، صدام حسین، عراق وغیرہ اور جانے کیا کیا؟ کچھ بھی تو نہیں سمجھ آتا
۔ یہ سب کیوں لکھا جا رہا ہے"[33]

یہ ٹکڑا مابعد نائن الیون، پیدا شدہ سنگین صورت حال کی مکمل وضاحت ہے جس میں انسانوں میں تلخی حیات کا احساس اس قدر بڑھ چکا ہے کہ وہ اب ساری صورت حال سے فرار چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ ایک

ایسی جگہ بھاگ جائیں جہاں یہ سب اذیتیں نہ ہوں اور وہ ایک سادہ اور پر سکون زندگی بسر کر سکیں۔ جاگنگ پارک نہ صرف انسانوں کے نفسیاتی ٹروما کی داستان ہے بل کہ ایک ایسی داستان ہے جس کا ہر کردار ہی بے قرار ہے اور حقیقی سکون کا متلاشی نظر آتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار زبیدہ بھی اسی بکھرے ہوئے معاشرے کا حصہ ہوتی ہے۔ اس کی نفسیاتی ترکیب بھی موجودہ زمانے کی افراتفری سے متاثر نظر آتی ہے۔ زبیدہ امریکا کی عالمی دہشت گردی کی کارروائیوں سے بے حد متنفر ہے۔ جب ناول کا ایک اور کردار جو صحافی ہے جب زبیدہ سے نائن الیون کے حادثے کے بارے میں پوچھتا ہے تو اس کا جواب طنزیہ لہجے میں کچھ یوں دیتی ہے

"ٹوئن ٹاور تو اب گرے ہیں بیٹا جی میں تو 1945ء کا واقعہ تاریخ میں پڑھ کر رو رہی ہوں۔ جب 14 اگست 1945ء کی صبح کو سوا اٹھ بجے ہیروشیما کی ہستی بستی، بستی پر حقوقِ انسانی کے دعویداروں نے سب سے پہلا ایٹم بم گرا کر دو لاکھ معصوموں کا قتل کیا تھا۔ اور بربریت کا نیا عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔۔۔۔ اور اس کے بعد سال ڈیڑھ سال کے وقفے سے دنیا کے مختلف ممالک پر کچھ اسی قسم کے حملے ہو رہے ہیں۔ کون سا ایسا ملک ہے جو ان حملوں سے محفوظ ہے۔ کیا چین، کیا کوریا، گواٹے مالا، انڈونیشیا، کیوبا، کانگو، ویتنام، کمبوڈیا، لیبیا، پناما، عراق، سوڈان، فلسطین، بوسنیا ہرزو گوینا اور اب افغانستان۔ رونے کے لیے تو پوری زندگی بھی ناکافی ہے اور میری مقدرت اتنی نہیں کہ کسی نوحہ گر کو ہی ساتھ رکھ سکوں"[34]

بنیادی طور پر یہ ساری صورتِ حال جذباتی اور سماجی ٹراما کی کیفیت کو واضح کر رہی ہے۔ ماہرینِ نفسیات کے مطابق جب سارا معاشرہ ہی کسی کرب ناک کیفیت اور آشوب میں مبتلا ہو جائے تو اسے سماجی ٹراما کہا جاتا ہے، جاگنگ پارک بھی سماجی ٹروما کی ایک مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔

ایک لو سٹوری ایک ایٹمی قیامت

ایم اختر کا ناول "ایک لو سٹوری اور ایک ایٹمی قیامت" پاکستان اور بھارت کی ممکنہ ایٹمی جنگ کی ہولناکیوں پر لکھا ہوا ناول ہے۔ ناول نگار کے ناول دنیا وسیع ہے جو کینیڈا، پاکستان، افغانستان امریکہ، بھارت اور دیگر اہم ترین ممالک کے درمیان جڑی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ناول کے اہم نکات میں نسلی تعصب، جنگی جنون، مذہبی منافرت، وغیرہ شامل ہیں۔ ناول کا ہیرو اسامہ ایک صحافی ہے اور کنیڈا میں ایک نیوز ایجنسی میں کام کرتا ہے۔ اس کے ساتھ کچھ مقامی اور کچھ بھارتی افراد بھی کام کر رہے ہوتے ہیں۔ ناول کی کہانی مابعد نائن

الیون دنیا کی صورت حال اور خصوصا پاکستان کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی صورت حال کی پیش کش کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ ناول کا ایک بڑا حصہ پاکستان اور بھارت کے لوگوں کے رویوں اور سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔ چند کرداروں کی مدد سے جہاں بھارتی انتہا پسند تحریکوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے وہیں پاکستان میں جہاد کے نام پر طالبان کی سرگرمیوں کا ذکر بھی اس ناول میں موجود ہے۔ اسامہ جو ناول کا مرکزی کردار ہے، لاہور کا رہنے والا ہے اور اس کا سارا خاندان لاہور ہی میں رہائش پذیر ہوتا ہے۔ نائن الیون کے بعد اسامہ کو کینیڈا میں آئے روز مختلف طریقوں سے طنز اور تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پاکستانی اور خصوصا مسلمان ہونے کی وجہ سے اسے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طنز و تلخ جملوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہاں تک کہ اس کے کچھ کینیڈین دوست بھی اسے مزاح میں دہشت گرد کہہ کر پکارتے ہیں۔ ناول میں اسامہ بن لادن کے خلاف ایبٹ آباد میں امریکی فوج کے خفیہ آپریشن کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس آپریشن کی خبر مغربی ممالک میں رہائش پذیر پاکستانی مسلمانوں کے لیے بہت حیران کن ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان کن بھی ثابت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس خبر کے بعد جہاں امریکہ اور کنیڈا میں اپنے دشمن اسامہ کے مارے جانے کی خوشی تھی وہی یہ تبصرے بھی چل رہے ہوتے ہیں کہ پاکستان کا کول اکیڈمی کے ساتھ کیسے ممکن ہے کہ اسامہ بن لادن چھپا رہے اور پاکستانی فوج کو علم نہ ہو؟ اس خبر پر مختلف قسم کے رد عمل آتے ہیں۔ کچھ لوگ اس آپریشن کو فرضی قرار دے کر امریکہ کی افغانستان سے نکلنے کی چال قرار دیتے ہیں اور کچھ امریکہ کی ناکامی قرار دے کر اس سارے آپریشن کو مشکوک سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے پاکستان کی دہشت گردوں کے ساتھ ہمدردیوں کے ساتھ جوڑ رہے تھے کہ پاکستان ڈبل گیم کرتے ہوئے ایک طرف امریکہ سے ڈالر وصول کر رہا ہے اور دوسری طرف دہشت گردی کو نہ صرف پناہ دے رہا ہے بل کہ انہیں اسلحہ اور ٹریننگ بھی فرام کر رہا ہے۔ اس ساری صورت حال میں یورپ یا مغربی مالک میں رہائش پذیر مسلمانوں کو شدید ذہنی اذیت کا شکار ہونا پڑا ان کو یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ اس سب کے ذمہ دار نہیں ہیں اور یہ کہ وہ بھی دہشت گردی کو پسند نہیں کرتے ایک طویل جدوجہد کرنا پڑی۔ اسی طرح ناول میں پاکستانی معاشرے کا ذکر ملتا ہے جو بری طرح سے ذہنی، اخلاقی، سماجی اور سیاسی انحطاط کا شکار نظر آتا ہے۔ فرسٹریشن کا مارا معاشرہ تہذیبی ثقافتی معاشی معاشرتی اور اخلاقی لحاظ سے ایک تباہ کن معاشرے کی تصویر پیش کرتا ہے۔ ایک ایسے مفلوک الحال معاشرے کی تصویر جو غربت، جہالت اور ذلالت کی آخری حدوں کو چھو رہا ہوتا ہے۔ سارا ناول انفرادی ٹراما کی بجائے ساری قوم کے نفسیاتی صدمے اور انتشار کا آئینہ دار نظر آتا ہے۔ مثلا ناول کے مرکزی کردار اسامہ کی دوست ڈونیا جب لاہور شہر کی گندگی اور کچی گلیوں میں گھومتی ہے تو اسے

شدید غیر انسانی رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو کہ کسی نارمل اور تن درست افراد کا ہر گز نہیں ہو سکتا۔ یہاں ناول میں سارا معاشرے کا معاشرہ ہی مکمل ٹرومیٹک اسٹرس ڈس آرڈر کا شکار نظر اتا ہے ناول کا کردار ڈونیا جب لاہور کی سیر کے لیے نکلتی ہے تو لاہور کے حوالے سے اس کے ذہن میں نقشہ ترتیب پاتا ہے ناول نگار نے اسے کچھ یوں پیش کیا ہے۔

"اس کے پورے جسم اور روح پر تھکن نے غلبہ جما لیا، کنیڈا میں وہ سارا دن بھی چلتے ہوئے اس نے کبھی ایسی تھکن محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن یہاں پہ بے پناہ شور اور آلودہ ماحول ،گندگی غربت، انسانیت کی بدترین حالت اور مخدوش ترین ہیومن معیارات کو دیکھ کر وہ بہت جلد تھکاوٹ سے ٹوٹ چکی تھی"[35]

ناول نگار نے ڈونیا کے کردار کے ذریعے کچھ مزید ایسے واقعات اور مناظر گنوائے ہیں جو پاکستانی معاشرے کی ابتری اور نفسیاتی بے ترتیبی کا احوال پیش کرتے ہیں ڈونیا جب شاہی قلعے سے واپس جا رہی تھی تو ہجوم میں پہلے اسے چند اوباش لوگوں کی طرف سے ہراسانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہجوم میں لوگ اس کے جسم کو چھیڑ رہے تھے اور وہ لاچار خاموشی سے آگے گزرتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہاں کے لوگوں کی آنکھوں میں ہوس اپنے پورے عروج پر ہے۔ اس کا یہ تجربہ نیا تھا کنیڈا میں اگرچہ جنسی آزادی حاصل ہے مگر یوں کسی لڑکی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھنا اس کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ قلعے سے واپسی پر وہ جن علاقوں سے گزرتی ہے تو ان علاقوں اور لوگوں کے بارے میں اس کے تاثرات کچھ ایسے ہوتے ہیں جو ہر گز کسی نارمل اور صحت مند ذہن کے نہیں ہو سکتے۔

"اس علاقے میں سوائے بوسیدہ عمارتوں ، تنگ و تاریک راستوں، ٹوٹی پھوٹی سڑکوں بدحال لوگوں کے اور بے تحاشا ٹریفک اور شور کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہر طرف بھکاری، نشئی ،بدحال اور مفلوک الحال لوگوں کے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا، وہاں سے گزرتے ہوئے ڈونیا کو عبرت، رحم، حقارت اور کراہت کے ملے جلے احساسات کے ساتھ یہ تمام مناظر دیکھ رہی تھی۔ جگہ جگہ کوڑے کے ڈھیر، انسانی فضلہ اور پیشاب دکھائی دے رہا تھا۔ "ارضی جہنم" بڑبڑاتے ہوئے ڈونیا کے منہ سے نکلا"[36]

اس ٹکڑے میں جو نقشہ ماحول اور اس کے باسیوں کا پیش کیا گیا ہے وہ نہایت ہی تباہ کن ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے سارے کا سارا معاشرہ اور اس کے باسی کسی منتشر، بکھری اور پراگندہ ذہنی کیفیت اور سوچ کا حامل

ہے۔ سارے کا سارا منظر شدید صدماتی ٹرانس میں مبتلا نظر آتا ہے مزید آگے چل کر ڈونیا پر جب لاہور میں ایک نہر کی سیر کے دوران ریپ کرنے کا حملہ ہوتا ہے تو وہ اتنی سخت ذہنی اذیت کا شکار ہوتی ہے کہ وہ اسی وقت پاکستان چھوڑ کر واپس کنیڈا جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ ناول میں یہ منظر ڈونیا کو جنسی تشدد کے دوران ٹروماٹک صورت میں مبتلا پیش کرتا ہے جس کے لیے وہ ہرگز تیار نہ تھی۔ اس کے لیے یہ صورت حال بالکل غیر یقینی اور اچانک ہوئی۔ لڑکے ڈونیا کو نہر میں دھکا دے کر اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں، اس کے جسم کو نوچنا شروع کر دیتے ہیں اور اس کے کپڑوں کو پھاڑنے لگتے ہیں ڈونیا شدید ترین صدمے کا شکار ہوتی ہے، اسے لگتا ہے کہ اس کا ریپ کیا جائے گا وہ چیختی چلاتی ہے مگر کوئی بھی اس کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ خوش قسمتی سے اچانک پولیس موبائل کے سائرن کی آواز اتی ہے اور وہ سارے لڑکے ایک دم اسے چھوڑ کر غائب ہو جاتے ہیں۔ ڈونیا اس صورت حال سے شدید ذہنی اذیت کا شکار ہو جاتی ہے وہ پولیس کو اپنا واقعہ سنانا چاہتی ہے مگر پولیس والے انگریزی نہیں سمجھ رہے تھے وہ بے بسی اور لاچارگی محسوس کرتی ہے ڈونیا کے ذہنی کرب اور ٹراما کی کیفیت کا اندازہ ناول کے اس پہرے سے کیا جا سکتا ہے۔

> "لڑکوں نے چیخیں مارتے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے پانی میں گری ڈونیا کو پکڑ لیا۔ اس دوران ڈونیا کا توازن خراب ہوا اور وہ پانی میں گر گئی اس شدید غوطہ محسوس ہوا۔ وہ غوطے کی وجہ سے کھانسنے لگی تو لڑکے اور زور زور سے ہنسنے لگے لاتعداد لڑکوں نے ڈونیا کو پکڑ لیا اور اس سے لپٹ گئے ڈونیا اب چلا رہی تھی اور مدد کے لیے پکار رہی تھی لیکن اس کے ساتھ چمٹے ہوئے لڑکے نہایت نازیبا اور گری ہوئی حرکتیں کر رہے تھے کچھ بدمعاشوں کو تو شاید زندگی میں پہلی بار موقع ملا ماحول ڈونیا کی چیخوں سے گونج رہا تھا مگر لڑکے اسے چھوڑنے پر تیار نہ تھے "[37]

اس موقعے پر ڈونیا کی ذہنی اور نفسیاتی حالت شدید تناو میں چلی جاتی ہے۔ اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرنا، بے گھر محسوس کرنا اس کے لیے اذیت ناک ہوتا ہے۔ وہ پولس کو اپنی رپورٹ لکھوانا چاہتی ہے مگر اس کی زبان کوئی بھی نہیں سمجھ پا رہا ہوتا، اس لیے وہ چیختی اور چلاتی ہے۔ اسے اپنا دماغ پھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے، اس کا فشارِ خون پر ھ جاتا ہے اور وہ بے بسی محسوس کرتی ہے۔

یہ وہ صورت حال ہے جو ایک دوسرے ملک میں اکیلے سیر کرنے والی ایک نہتی لڑکی کو پیش آئی جس نے اسے ہلا کر رکھ دیا اس صورت حال کو ناول نگار مزید یوں پیش کرتا ہے۔

"ڈونیا کی چھٹی حس اب اسے شدید خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی وہ شدید خوفزدہ تھی کہ اس سے گینگ ریپ کا نشانہ بنا دیا جائے گا اگرچہ وہاں سینکڑوں کی تعداد میں لڑکے اور مرد نہر میں نہانے میں مصروف تھے لیکن کسی نے بھی اس کی مسلسل چیخوں کے باوجود اسے بچانے کی کوشش نہیں کی "[38]

پولیس کے آنے پہ اگرچہ ڈونیا کی جان بچ تو گئی مگر وہ اپنے آپ کو شدید خطرے میں محسوس کر رہی ہوتی ہے اس کی پہچان والا کوئی فرد وہاں نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اپنی صورت حال پولیس والوں کو بیان کر پا رہی تھی۔ پولیس والے اسے یہ بتاتے ہیں کہ رپورٹ کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا کیوں کہ ملزموں کی کوئی پہچان نہیں، ڈونیا اتنی ذہنی اذیت کا شکار ہوتی ہے کہ اسی وقت اپنے دوست اسامہ کے گھر جاتی ہے اور واپس کنیڈا جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ اس ناول میں اگرچہ ٹراما کی کلی صورت حال موجود نہیں مگر ڈونیا کردار کا یہ واقعہ ٹرومے کی پہلی قسم یعنی ایکوٹ ٹرومے (شدید وقتی صدمے) کی قسم پر پورا اترتا ہے۔ ٹراما کی یہ ابتدائی صورت ہوتی ہے جس میں کوئی فرد مبتلا ہوتا ہے اور کچھ دیر بعد واقعہ میں بچ جانے والے یا ریسکیو ہو کر جانے کے بعد نارمل ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر ناول میں پیش معاشرے کے پہلو سے دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ سارا معاشرہ اجتماعی ٹراما کا شکار ہے اور جذباتی لحاظ سے تناو میں جی رہا ہوتا ہے۔ اس ناول میں نائن الیون، دہشت گردی، اسلاموفوبیا اور گلوبلائزیشن جیسے دیگر موضوعات بھی پائے جاتے ہیں۔

بادل از شفق

بادل ایک سو اٹھائیس صفحات پر مشتمل ایک مختصر ناول ہے۔ ناول کے کرداروں اور شہروں کا تعلق انڈیا کے شہر پٹنہ سے ہے۔ ناول نگار کا اپنا تعلق بھی پٹنا کے ہی ایک ذیلی علاقے سے ہے۔ ناول میں خالد، نعیم، سلمی اور رامو مرکزی کردار ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر ذیلی کردار بھی ہیں۔ مگر ناول کی ساری کہانی خالد، سلمی، نعیم، رامو اور سلمی کی ماں اور نعیم کی ماں اور بہن کے درمیان چلتی ہے۔ خالد بہ طور کلرک ایک کمپنی میں ملازمت کرنے دوسرے شہر جاتا ہے جہاں اس کی ملاقات ایک ڈری سہمی لڑکی سلمی سے ہوتی ہے۔ یہ افس مخلوط مذاہب کے ماننے والے ملازمین پر مشتمل تھا، جس میں مسلمان، ہندو، سکھ وغیرہ سب کام کر رہے ہوتے ہیں۔ خالد کی ملاقات اس آفس میں ایک مسلمان لڑکے نعیم کے ساتھ ہوتی ہے جو جلد ہی بہترین دوستی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ آفس چپراسی رامو ایک پراسرار شخصیت کا حامل ہوتا ہے اور کسی جرائم پیشہ گروہ کا ممبر لگتا

ہے۔ خالد رامو سے خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ رامو سلمی کے ساتھ بہت زیادہ انس رکھتا ہے۔ ناول میں دو کہانیاں اکھٹی چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، ایک کہانی سلمی خالد اور نعیم کے درمیان چل رہی ہوتی ہے اور دوسری کہانی یا صورت حال کا تعلق نائن الیون کے واقعے سے ہے جس میں ٹوئن ٹاورز پر اغواشدہ جہازوں کے ٹکرانے اور تباہ کن مناظر کے بیان کے حوالے سے ہوتا ہے۔ یہاں ناول کے اندر خالص سیاسی اور جنگی صورت حال کو بیان کیا گیا ہے۔ آفس کے بریک ٹائم میں کیفے پہ مسلمان، ہندو ورکر کے آپس کے تبصرے ایک متعصب اور مذہبی منافرت سے بھرپور بیانیے کو واضح کرتے ہیں۔ ناول نگار نے یہاں بہت باریک بینی سے ہندو اور مسلمانوں کو ذہنی کیفیت کو پیش کیا ہے۔ امریکہ کی طالبان کو دھمکیوں اور جنگ مسلط کرنے کے اعلانات پر جہاں ہندو خوش نظر آتے ہیں وہی مسلمان افغانستان کو ایک بار پھر جنگ کی آگ میں جلتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ پاکستان کے حوالے سے بھی ان کے خدشات بڑھ رہے تھے۔ یہاں ناول کے افق پر نائن الیون اور اس سے متعلق خبروں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ نائن الیون کے بعد مشرق اور مغرب کے کروڑوں انسانوں کے دل و دماغ میں ایک بے قراری کی لہر جنم لے رہی تھی۔ ناول میں دوسری طرف سلمی اور خالد کی محبت کی کہانی بہت دل نشین انداز میں پیش کی گئی ہے۔ ناول کے اندر کرداروں کے لحاظ سے اگر ٹرومیٹک عناصر کی تلاش کی جائے تو اس ساری کہانی میں ایک کردار سلمی کا نظر اتا ہے جو اپنی بہن اور باپ کی اچانک موت پر جذباتی ٹرومے کا شکار ہو جاتی ہے۔ ایک خوف، ڈر اور کھو جانے کا کھٹکا ہر وقت اس کے دل و دماغ میں چل رہا ہوتا ہے۔ اس کی ذہنی اور جذباتی اذیت کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب اس کی معصوم سی بہن کی شادی ایک فریب کار امیر زادے ماجد سے ہوتی ہے۔ ماجد ایک چالاک اور مکار انسان ثابت ہوتا ہے، اس نے بہت مکاری کے ساتھ اپنا بہترین امیج سلمی کے ماں باپ کے سامنے بنایا اور سلمی کی بہن سے شادی میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مگر چند مہینوں کے بعد اس کی اصلیت سامنے آجاتی ہے، وہ اپنی بیوی کو قتل کر دیتا ہے اور یہ صدمہ نہ برداشت کرتے ہوئے سلمی کا باپ بھی اچانک وفات پا جاتا ہے۔ ناول میں اس جگہ سلمی کی جو ذہنی نفسیاتی اور جذباتی صورت حال لکھی گئی ہے وہ شدید تناؤ والی اور اعصاب شکن محسوس ہوتی ہے۔ سلمی کے اندر ایک خوف اور ڈر پیدا ہو جاتا ہے جو اسے زندگی سے بیزاری کی طرف دھکیل رہا ہوتا ہے۔ وہ مجبور تھی کہ اپنا اور اپنی ماں کا گزر بسر کرنے کے لیے ملازمت کرے۔ جس آفس میں وہ کام کر رہی ہوتی ہے وہاں اس کا سامنا ایک ہندو کولیگ راجیشن سے ہوتا ہے جو سلمی کا جنسی لحاظ سے ہراساں کرتا ہے اور سلمی کو ذہنی اور اعصابی طور پر شدید اذیت کا شکار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ راجیشن سلمی کے عصاب پر اس قدر سوار ہوتا ہے کہ وہ اس کے خوابوں میں آکر اسے جذباتی

طور پر مزید اذیت کا شکار کرنے لگا۔ سلمی خواب میں مسلسل راجیش کو اپنے ساتھ دست درازی اور غلط حرکات کرتے دیکھتی ہے جس کی وجہ سے وہ گھبرا کر جاگ جاتی ہے، ایسی کیفیت میں اس کی سانس اور دھڑکن بے طرح چل رہی ہوتی ہے وہ خوف زدہ ہو کر ماں سے چمٹ جاتی ہے۔ راجیش کا مکروہ سلوک سلمی کو اس قدر اذیت میں مبتلا کر دیتا ہے کہ وہ ہر وقت اس کے خیال میں جکڑی رہتی اور ڈراونے خوابوں کی وجہ سے اکثر شدید ذہنی صدمے کا شکار ہوتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ ناول میں یہ وہ واحد صورت حال ہے جس کو ہم ٹراما کے معنوں میں لے سکتے ہیں۔ سلمی کی صدماتی حالت کو ورکنگ تھروٹراما قرار دیا جا سکتا ہے۔ ڈومینک لاکیپرا کے مطابق جب ایک مریض اپنے ذہنی صدمے کے ساتھ اس صدمے کی ازیت کو محسوس کر رہا ہو اور اپنے روزمرہ کے معاملات کو بھی لے کر چل رہا ہو تو اسے ورکنگ تھروٹراما کہا جاتا ہے۔ کسی مریض کی یہ کیفیت ٹراما کی عمومی تعریف میں ایکیوٹ ٹراما بھی کہلاتی ہے۔ سلما کے ذہنی خلفشار کو ناول میں کو یوں پیش کیا گیا ہے۔

> "اس رات اس نے خواب میں دیکھا ہے کہ اچانک ایک دبلا پتلا، دراز قد ہیولہ نمودار ہوا، سفید لبادے میں ملبوس پر وقار ہیولہ دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھنے لگا، وہ انکھیں بند کیے دنیا اور مافیھا سے بے خبر کیوپڈ کے سامنے بیٹھی رہی۔ نزدیک آکر ہیولہ خباثت سے بھری ہنسی ہنسا تو اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ دبلا پتلا سانولا چہرہ آنکھوں میں ہوس، ہونٹوں پر سفاکانہ مسکراہٹ لیے اس پر جھک چلا تھا، لمبے سوکھے بازو اُسے گرفت میں لے چکے تھے، پھر ہونٹ اس کے ہونٹ سے مس ہوئے اور اس کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکلی، نہیں نہیں!! کیا ہوا؟ ماں نے گھبرا کر بلب روشن کیا وہ ماں کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے پہچانے کی کوشش کر رہی ہو، پھر اسے دور سے ماں کی آواز سنائی دی "تو اس نے آج پھر وہی خواب دیکھا" [39]

اگر اس صورت حال کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ناول میں سلمی کا جو کردار ہے وہ نفسیاتی اور جذباتی اعتبار سے ایک ایسے صدمے کا شکار نظر اتا ہے جو آئے روز اس اذیت ناک صورت حال کو مزید بڑھاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ انسانی لاشعور میں بعض اوقات کچھ خدشے، ڈر اور محرومیاں اس طرح پیوست ہو جاتی ہیں کہ وہ پھر کسی نفسیاتی اور جذباتی صدمے کی صورت میں انسان کے رویے اور مزاج سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے ایم اے قریشی اپنی کتاب "فرائیڈ اور لاشعور" میں لکھتے ہیں۔

"جب کسی کو اپنے تمام خیالات و جذبات اور اعمال پر شعوری اختیار ہو تو نفسیاتی طور پر وہ بالکل صحت مند ہوتا ہے، جب لاشعوری دبے ہوئے جذبات طاقت حاصل کرنے پر دباؤ کو ہٹا کر سیدھے شعور میں آجاتے ہیں تو انسان اپنے ہی جذبات سے ڈرنا شروع ہو جاتا ہے کیونکہ جذبات کے دبے رہنے سے وہ زیادہ خطرناک ہو جاتے ہیں " [40]

جب جذبات اور احساسات کا کامل اظہار نہ ہو سکے اور انسان مسلسل دکھ اور غم کی صورت حال میں رہے تو یہ تکلیف دہ عمل اس کے لیے سوہانِ روح بن کر اذیت ناک بن جاتا ہے۔ وہ ایک ایسے خوف اور ڈر میں مبتلا ہو جاتا ہے جو کسی نہ کسی ہیجان آمیز صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ خالد سے راہ ورسم بڑھانے اور محبت ہو جانے کے بعد سلمی کے اندر ایک مزید خوف اور ڈر پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ خالد کو اپنی بہن اور باپ کی طرح کھو نہ دے۔ اس کی یہ ذہنی صورت حال اس وقت مزید بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جب خالد پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے اور وہ اس صورت حال کو دیکھ کر بالکل اپنے حواس کھو بیٹھتی ہے اور خالد کی زندگی کے حوالے سے بے یقینی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد خالد کی گمشدگی اسے مزید ذہنی اذیت کا شکار کر دیتی ہے۔ ناول میں یہ واحد کردار ہے جو نفسیاتی اور جذباتی ٹراما کا شکار نظر آتا ہے۔ سلمی کا خوف، ڈر، کھو جانے کا کھٹکا، اس کے وہ ذہنی صدمات ہیں جو ٹراما کی ابتدائی شکل سے بھی مماثلت رکھتے ہیں۔ ناول میں نائن الیون کے حالات اور واقعات اور مابعد نائن الیون کے جنگی حالات کا ایک بیانیہ بھی نظر آتا ہے۔

آخری زمانہ

آمنہ مفتی کا ناول "آخری زمانہ 2015" کو منظر عام پر آیا۔ یہ ناول زمانی وسعت کے اعتبار سے ستر اور اسی کی دہائی سے شروع ہو کر نائن الیون اور اس کے بعد امریکہ کے افغانستان پر حملے، عراق پر حملے اور پاکستان میں پیدا شدہ دہشت گردی کی لہر اور لال مسجد آپریشن تک کو محیط ہے ۔ناول آمنہ مفتی کے گہرے مطالعے اور حالات پر ان کی گہری نظر کا ثبوت ہے۔ ناول کی کہانی قصہ در قصہ آگے چلتی ہے۔ مصنفہ نے ناول کے اندر دو کہانیاں اکٹھی بنی ہیں، ایک کہانی گھریلو زندگی اور اس کی جزیات سے متعلق ہے اور دوسری کہانی ایک صحافتی جدوجہد اور صحافتی روز و شب سے متعلق ہے۔ جنرل ضیا کے حادثے سے لے کر نوے کی دہائی میں حکومتوں کے آنے جانے سے لے کر مشرف کے مارشل لاء تک تمام سیاسی حالات بھی ناول کے اندر موجود ہیں، ناول کے اہم کرداروں میں خالد، راحیلہ، میاں جی، جانس اور جمیل اہم گنے جاسکتے ہیں۔ خالد جو کہ غریب

خاندان سے تعلق رکھتا ہے، بچپن ہی سے محرمیوں کا شکار نظر آتا ہے۔ماں باپ اور ساس بہو کی لڑائی میں خالد کا حساس ذہن اپنی عمر کے لحاظ سے بڑے معاملات کو سوچنا شروع کر دیتا ہے۔اس کا بچپن نا آسودہ حالات کا نذر ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے خالد کے اندر غصہ، نفرت اور عدم برداشت کا جذبہ پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ بکھیرے ہوئے بچپن نے خالد کے اندر ایک منتشر شخصیت اور مزاج کو جنم دیا۔ ایسی شخصیت جس کے اندر نہ ٹھہراؤ ہوتا ہے اور نہ برداشت، یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی سکول سے بھاگ جاتا ہے اور کبھی مدرسے سے اور کبھی ماں باپ کے گھر سے۔انہی حالات میں اسے کچھ ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو اس کے منتشر ذہن کو ایک نئی راہ دکھا کر، جہاد اور اللہ کے نظام نافذ کرنے کا خواب سجا کر دہشت گردی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ خالد اپنے جذباتی پن اور بچپن میں محبت کی محرومی کے سبب ذہنی نا آسودگی کی وجہ سے پاگل پن کے دورے میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ بابری مسجد کے شہید کرنے پر خالد گاوں والوں کو جمع کر کے ایک مندر پر حملہ کر دیتا ہے۔ناول میں اس کے جنون اور ذہنی خلفشار کا نقشہ ایک جگہ یوں پیش کیا گیا ہے۔

> "شرم کرو یہ ہنسنے کا نہیں رونے کا موقع ہے مٹادو اس کفر کے نشان کو نعرہ حیدری یا علی خالد کڑک کر بولا اور لوگ مندر پر پل پڑے۔۔۔۔۔۔چیختے چیختے خالد کا گلا بیٹھ گیا پھر اسے ہجوم میں مولانا صاحب نظر آئے اور زم زم اور کب اس نے رونا شروع کیا اور کب وہ بے ہوش ہوا اسے کچھ نہ معلوم ہوا"[41]

خالد جذباتی لحاظ سے بہت تیز مزاج ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ہنگامے کے دوران اس کے اعصاب شدت کے غصے سے اس قدر شل ہوتے ہیں وہ صدمے اور دکھ سے بے ہوش ہو جاتا ہے۔ یہاں اگر ہم خالد کے کردار کے اندر پائے جانے والے ٹراما کا تجزیہ کریں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ خالد ٹرومے کی اس کیفیت میں مبتلا ہے جس میں متاثرہ شخص کسی وجہ سے نفسیاتی اور جذباتی ٹراما کا شکار تو ہوتا ہے مگر اس کی قوت ارادی ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنے روزمرہ کے معاملات کا شعور اور ادراک بھی رکھ سکتا ہے۔اس ٹراما کو اور کنگ تھروٹراما کہا جاتا ہے۔ خالد اپنی بکھری اور شکستہ شخصیت کی وجہ سے ذہنی مریض بن جاتا ہے اور سات سال پاگل خانے گزارتا ہے۔

اس کے بعد واپس اکر ایک فقیرانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ناول کے اندر دوسرا کردار جو نفسیاتی اور جذباتی لحاظ سے منتشر نظر آتا ہے وہ ہے رحیلہ کا، رحیلہ ایک لڑکی ہے جس کے ماں باپ کے درمیان اس وقت علاحدگی ہو جاتی ہے جب وہ چار سال کی تھی، چار سال کی بچی جسے ماں اور باپ کا مشترکہ پیار چاہیے ہوتا ہے وہ نہ

صرف ماں باپ کے پیار سے محروم ہو جاتی ہے بل کہ وہ اس کی ذمہ داریاں اٹھانے پر بھی تیار نہیں ہوتے۔ رحیلہ اپنے دادا اور دادی کے پاس پرورش پاتی ہے مگر ماں باپ کی محبت کی کمی اس کی شخصیت میں ایک بڑے خلا کو جنم دیتی ہے۔ وہ عام اور نارمل لڑکیوں کی طرح نہیں سوچتی بل کہ اس کی سوچ فکر اور عمل میں ایک ضد، چڑچڑا پن اور بغاوت ہوتی ہے۔ بچپن کی محرومیوں نے رحیلہ کو عام انسانی جذبوں سے ہٹا کر اس کے جذبات میں انتشار اور بے قاعدگی پیدا کر دی تھی۔ راحیلہ کا کردار بھی ورکنگ تھروٹرومے کا شکار نظر آتا ہے جس میں ایک فرد کلی طور پر ٹرومے میں مبتلا نہیں ہوتا بل کہ اپنے درد، صدمے اور عام زندگی کے درمیان فرق کرنا جانتا ہے۔ رحیلہ اس قدر تضاد، ضد اور ذہنی انتشار کا شکار ہوتی ہے کہ اپنی منگنی پر ایسے اقدامات کرتی ہے کہ اس کا رشتہ مانگنے والے بغیر رشتہ اور منگنی کے بھاگ نکلتے ہیں۔ رحیلہ کا اپنے والد اور والدہ کے ساتھ کوئی جذباتی تعلق نہیں ہوتا جو عموماً اولاد کا اپنے والدین کے ساتھ ہوتا ہے۔ راحیلہ کے کردار میں ہمیں ایسی کوئی جذباتیت نظر نہیں آتی جس سے یہ پتہ چلے کہ اسے اپنے والد اور والدہ کے ساتھ محبت انس اور پیار ہے یہ چیز بھی اس کے نفسیاتی اور جذباتی صدمے کا ثبوت ہے۔ اس ناول کے کردار خالد کو ہم اگر ٹراما تھیوری پر پرکھیں تو اس کی زندگی کا پہلا حصہ مکمل ٹراما میں مبتلا نظر آتا ہے۔ کیوں کہ اس دور میں وہ اپنے حواس سے مکمل بے گانہ ہو چکا ہوتا ہے اور پاگل خانے میں قیام پذیر ہوتا ہے۔ خالد کی اس کیفیت کو ٹراما کی دوسری قسم یعنی کرونک ٹراما (دائمی صدمہ) قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ٹراما بھی قابلِ علاج ہوتا ہے اور مکمل نگہداشت میں رہتے ہوے صحت یاب ہو جاتا ہے۔

برف از محمد الیاس

یہ ناول سنگ میل پبلشر، لاہور سے 2010 میں شائع ہوا۔ ناول جہاد کشمیر اور کشمیر کی وادیوں کی تفصیل کو بیان کرتا ہے۔ مصنف کا مطالعہ جہاد کشمیر اور اس کے ثمرات یا مضمرات کے حوالے سے بہت گہرا ہے۔ مصنف محمد الیاس سارے نظم اور ترتیب کی باریکیوں کو بخوبی جانتے ہیں جو جہاد کشمیر کے دوران مرتب کی جاتی رہی ہیں۔ حیران کن طور پر جہادی تنظیموں کے اندر کے ماحول اور مجاہدوں کی انفرادی زندگیوں کا جو نقشہ اس ناول میں پیش کیا گیا وہ کافی حد تک حقیقت پر مبنی ہے۔

ناول میں پہلو بہ پہلو بہت سی کہانیاں چل رہی ہوتی ہیں۔ ناول کی کہانی ایک دیندار گھرانے اور اس کے سرپرست حاجی شیخ نور الاسلام اور اس کی اولاد سے شروع ہوتی ہے۔ شیخ صاحب کے چار بچے اور ایک بیٹی ہوتی ہے۔ بیٹی کا نام فخر النساء ہے جو اکلوتی ہونے کی وجہ سے بہت لاڈلی ہے۔ شیخ صاحب ایک خالص کاروباری

شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت راسخ العقیدہ مسلمان بھی تھے ،گھر میں دین اسلام کی پابندی کو اولین رکھا گیا تھا، پردے کے حوالے سے بھی گھر کی خواتین پر سخت پابندیاں تھیں۔

شیخ صاحب شدت کی حد تک اسلام پسند تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے لڑکوں کی شادیاں میٹرک میٹرک کے باہر بعد کرادی تھی اور کاروبار کے لیے سب کو الگ الگ دکانیں بھی ڈال کر دی ہوئی تھی۔ فخر النساء سب سے چھوٹی بچی ہونے کی وجہ سے ابھی مڈل کی تعلیم حاصل کر رہی ہوئی ہوتی ہے۔ شیخ صاحب بیٹی کو خود سکول پہنچاتے اور واپس لاتے۔ بچی کو طرح طرح کی وعظ اور نصیحت کرتے رہتے اور پردے کی اہمیت کا بتاتے رہتے تھے۔ اس ناول کا اہم ترین کردار فخر النساء ہی ہے اور پھر اس کے گرد گھومتے ہوئے چند اور کردار ہیں جو کسی نہ کسی طرح سے فخر النساء سے جڑے ہوتے ہیں۔ ان میں ظفر اہم ترین کردار ہے جو ناول کے آخر تک فخر النساء کے ساتھ ساتھ کہانی میں نظر آتا ہے۔ قاری عمر فاروق، زبیر، حاطب وغیرہ بھی وہ کردار ہیں جو ناول کی کہانی میں موجود ہیں۔ فخر النساء اس ناول کا وہ واحد کردار ہے جو ٹراما کی شرائط پر اترتا ہے۔ فخر النساء جب مڈل پاس کرتی ہے تو باپ اسے سکول سے اٹھالیتا ہے اور اس کی شادی مسجد امام کے بیٹے مولوی عمر فاروق سے زبردستی کرادیتا ہے۔ فخر النساء اور اس کے بھائی ادب اور احترام کی وجہ سے اپنے والد کے فیصلے پر کچھ بولتے تو نہیں مگر ان کو اس فیصلے کا سخت دکھ ہوتا ہے۔ فخر النسا اپنے سکول کی ذہین ترین اور قابل ترین طالبہ ہوتی ہے مگر اس کے باوجود اسے اس کی مرضی کے خلاف بیاد یا جاتا ہے۔ یہاں اسے اپنی تعلیم حاصل کرنے کے خواب بکھر جانے پر پہلا جذباتی اور نفسیاتی صدمہ پہنچتا ہے۔ وہ باپ کے فیصلے پہ اگرچہ سر جھکا لیتی ہے مگر دل سے وہ شدید کرب اور دکھ کا شکار ہوتی ہے۔ مولوی عمر فاروق کا کردار نہایت منافقانہ ہوتا ہے، شکل و صورت میں بھی وہ فخر النساء کے مقابلے میں کچھ نہیں ہوتا، اوپر سے مزاج ایسا لالچی اور حریص تھا کہ فخر النساء کو اس کے سے گھن آتی۔ فخر النسا کے محلے میں ایک اور لڑکا ظفر بھی رہا کرتا تھا۔ ظفر فخر النسا کو بہت پسند کرتا ہے اور اسے فخر النساء کی شادی کا بہت دکھ ہوتا ہے اور وہ ایک خط فخر النسا کو لکھ کر اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے اور پھر جہادِ کشمیر کے لیے آزاد کشمیر چلا جاتا ہے۔ فخر کو اس خط میں محبت کے اظہار پر ایک خوشی محسوس ہوتی ہے اور اسے بھی ظفر کے بارے میں پہلی بار انکشاف ہوتا ہے کہ اس کے دل میں بھی ظفر کی پسندیدگی کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ فخر کا شوہر عمر فاروق بھی جہاد کشمیر کے حوالے سے سرگرم ہوتا ہے مگر فخر النسا کو اس وقت حیرت ہوتی ہے جب وہ دیکھتی ہے کہ جہاد کے نام پر جمع ہونے والی رقم اور زیورات بجائے جہادی تنظیم کے حوالہ کرنے کے عمر فاروق انہیں اپنے گھر میں چھپا دیتا ہے۔ یہ وہ دوسرا سٹیج ہے جہاں فخر النساء صدماتی (ٹراما)

کیفیت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کی زندگی میں نیا موڑ اس وقت آتا ہے جب اسے اپنے شوہر کے بارے میں خبر ملتی ہے کہ وہ کشمیر کی وادی میں شہید ہو گیا۔ یوں وہ بہت کم عمری میں بیوگی کا داغ لیے واپس اپنے باپ کے گھر آ جاتی ہے۔ اب فخر النساء چاہتی ہے کہ اسے اپنی پڑھائی مکمل کرنے دی جائے مگر اس کا باپ حاجی نور الاسلام سخت مزاج اور شریعت کو سختی سے اختیار کرنے والا انسان تھا۔ اس لیے اس نے اپنی بیٹی کا نکاح ایک اوباش لڑکے جو بظاہر فخر النساء سے شادی کے لیے نمازی بنا تھا سے کرا دیا۔ گھر والوں نے احتجاج کیا مگر اس نے سب کو چپ کرا دیا، بیوی نے جب کہا نہ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی تو شیخ نے اسے طلاق کی دھمکی دے کر بیٹی کا نکاح زبردستی زبیر سے کر دیا۔ زبیر حاجی کی نظروں میں اچھا بنا ہوا تھا مگر وہ نہایت گھٹیا اور کمینے کردار کا مالک تھا۔ شراب نوشی، چوری کی وارداتیں اور لڑکیوں سے دوستیاں اس کی عادت تھی۔ رخصتی سے قبل ہی وہ اپنے دوستوں کے ساتھ لڑکیوں کے اڈے سے گرفتار ہو جاتا ہے لہذا اب فخر النساء کے پاس معقول وجہ تھی شادی سے انکار کی مگر اس دوران زبیر ضمانت پہ رہا ہو کر آتا ہے اور اپنے بدمعاش دوستوں کے ساتھ مل کر فخر النساء کو اغوا کر لیتا ہے۔ اس کے مطابق فخر النساء اس کی بیوی ہے وہ حق رکھتا ہے اسے لے جانے کا یہ وہ تیسرا پوائنٹ ہے جہاں سے ہمیں فخر انساء کا کردار ٹراما کے اندر مکمل مبتلا ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ زبیر فخر النساء کے ساتھ نہایت غیر انسانی سلوک کرتا ہے، اس نے اسے ایک ویرانے میں رکھا ہوتا ہے۔ فخر انساء ایک نہایت صالح اور صحت مند اخلاقی ماحول میں پرورش پانے والی لڑکی تھی مگر یہاں اس کے احساسات اور جذبات بری طرح مجروح ہو رہے تھے۔ زبیر اس کو زبردستی شراب پلاتا ہے، سگریٹ پلاتا ہے اس کو جنسی تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ فخر النسا اپنے ہوش و حواسے بے گانا ہوتی چلی جاتی ہے اور یہاں تک کہ وہ اس قدر ذہنی صدمے کا شکار ہوتی ہے کہ اب اس کے اندر سے قوتِ مدافعت ختم ہو جاتی ہے بھی اور وہ بھی اب بخوشی شراب نوشی جیسا کام کرنا شروع کر دیتی ہے۔ نماز، روزہ، پردہ سب فخر النسار چھوڑ دیتی ہے۔ وہ ہر وقت نشے کی حالت میں شدید اذیت کی کیفیت میں مبتلا رہتی ہے۔ ایک بے چینی اور بے قراری اندر ہی اندر اسے کھا رہی ہوتی ہے۔ ماہرینِ نفسیات کے مطابق انسانکی یہ حالت شدید جذباتی صدمے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں متاثرہ فرد اپنے آپ کو مکمل تباہ کر دینے پر تیار ہو چکا ہوتا ہے۔ یہی صورتِ حال فخر النسا کی بھی ہو جاتی ہے۔ وہ ہزیانی کیفیت میں چلی جاتی ہے شراب نوشی اس کی عادت بن جاتی ہے۔ آخر کار وہ اسی حالت میں ایک دن زبیر کو جو پسٹل سے اسے فائر کرتا کرنا سکھا رہا ہوتا ہے، کو گولیاں مار کر قتل کر دیتی ہے۔ گولیاں مارنے کے بعد نروس بریک ڈون ہونے کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ پولیس اسے چوری کی واردات ظاہر کر کے کیس کو نپٹا دیتی ہے۔ یوں فخر

النسا ایک مرتبہ پھر بیوہ ہو کر واپس اپنے باپ کے گھر آ جاتی ہے۔ مگر یہ فخر النساء پہلے جیسی فخر النسا نہیں ہوتی ۔اس فخر النساء کو نہ پردے کا ہوش ہوتا ہے نہ نماز اور قران کا۔ اس کے بھائی اور باپ اس کی اس حالت پر سخت پریشان ہوتے ہیں۔ جب اسے باپ نے کہا کہ بیٹا اپنا بدن چادر سے ڈھانپ لو تو فخر کا جواب کچھ یوں تھا

"ہاں جی کیوں نہیں ضرور ڈھانپیں گے سر، کیوں نہیں ڈھانپنا، ان شاءاللہ آپ دیکھیں گے کہ ہم نے کیسے اپنے آپ کو ڈانپ رکھا ہے۔ سب سے بہترین پردہ کفن کا ہے لیکن بندے کو قبر ہی نہ ملے تو کفن پہن کر کہاں بھٹکتا پھرے۔ زبیدہ اور ضیا آبدیدہ ہونے لگے لیکن شیخ صاحب نے اپنے دل کو مضبوط کرتے ہوئے کہا نہیں میری بچی یہ بڑا سخت گناہ ہے موت کی خواہش کرنا کفرانِ نعمت ہے "[42]

فخر النساء کی پسندیدہ ٹیچر جب اس کا پتا کرنے اس کے گھر آتی ہے تو مس راجا فخر النساء کی حالت دیکھ کر رونا شروع ہو جاتی ہیں اور اسے اپنے سینے سے لگا لیتی ہے اس صورت حال میں فخر النساء ان کو مخاطب کر کے بولتی ہے

"میم مجھ سے آنسو چھپا رہی ہیں لیکن مجھے یہ دکھائی دے رہے ہیں، مجھے اور بھی بہت کچھ دکھائی دے رہا ہے ماسوائے اپنی قبر کے وہ زمین پر کہیں نہیں یوں لگتا ہے جیسے ظفر میرا جسدِ خاکی باہوں میں اٹھائے ہوئے کہیں بادلوں میں لیے جا رہا ہے دفن کرنے کے لیے، وہ کب آئے گا میں تو کب کی مری پڑی ہوں "[43]

اسی سے آگے ناول نگار نے فخر النساء کردار کی مزید ٹرومیٹک صورت کو یوں بیان کیا ہے

"فخر النساء نے اپنی ٹیچر کو مخاطب کرتے ہوئے دوبارہ کہا میں نے حساب کتاب کا پہلا مرحلہ طے کر لیا ہے، میرے نامہ اعمال کا ابتدائی جائزہ لیتے ہوئے بڑی معمولی لغزش کو سرخ روشنائی سے نشان زد کر دیا گیا، تب حاکم وقت کا اعمال نامہ بھی پرکھا جا رہا تھا سرسری سماعت میں میری اور حاکم وقت کی لغزش کو ترازو میں تولا گیا ایک پلڑے میں پیاز کی ایک گٹھی رکھی گئی تو دوسرے میں لاکھوں کروڑوں سونے کی اشرفیاں لیکن دونوں پلڑے برابر ہو گئے "[44]

یہ ذہنی کیفیت کسی طرح بھی ایک نارمل انسان کی نہیں ہو سکتی۔ فخر النسا اب عموما اپنے حواس سے بے گانہ سگرٹ پینے والی آزاد خیال لڑکی لگ رہی ہوتی ہے۔ گھر واپسی پر فخر النسا کو پتا چلتا ہے کہ اس کی ماں اس کا غم لے کر مر چکی ہے تو وہ مزید صدمے کا شکار ہو جاتی ہے۔ ایک اور دماغی چوٹ اسے محسوس ہوتی ہے۔ فخر کے دماغ میں لاشعور میں کہیں ظفر موجود ہوتا ہے۔ اس لیے اب وہ بار بار اپنے اور ظفر کے عشق کا اظہار کرتی ہے۔ بھائی اور بھابیاں اس کی ذہنی حالت پر بہت آزردہ ہوتے ہیں۔ فخر النساء اسی حالت میں ماں کی قبر جو جملے بولتی ہے وہ اس کے شدید صدماتی (ٹرومیٹک سٹریس) صورتِ حال کی عکاسی ہے۔

"مار دیا نہ میری ماں کو، اماں چھوڑ کر چلی گی، بڑی باتیں کرتی تھی کہ بیٹی سے پیار ہے۔ خود قبر میں بیٹھی مزے لوٹ رہی ہے میں کب سے مری پڑی ہوں، جنازہ حلال ہو گیا ہے، دو دفعہ حلال ہوا ہے۔ مجھے کوئی قبر نصیب نہیں ہو گی۔ اپنا مردہ گھسیٹتی پھروں گی، ظفری آجاتا تو میرے لیے قبر کہیں کھود دیتا مگر کیا پتہ ظفر بھی مر چکا ہو"[45]

گورکن سے اس کی مزید گفتگو بھی اس کے جذباور نفسیاتی ٹراما کی علامت سمجھی جا سکتی ہے۔ وہ گورکن کو یوں مخاطب کرتی ہے۔

"بابا جی میرے پاس ناسونے کی بڑی بڑی چادریں ہیں، میرے قد سے تقریبا چھ انچ زیادہ، کم از کم چھ فٹ لمبی اور دو فٹ چوری، ان کا وزن کم از کم 20 کلو ہو گا، میں در اصل کب کی مر چکی ہوں۔ جنازہ میرا سو فیصد حلال ہو چکا ہے بل کہ دو بار حلال ہو چکا ہے"[46]

یہاں فخر النسا بار بار جنازہ حلال کا لفظ استعمال کر رہی ہے۔ دراصل یہی وہ ابتدائی جملہ تھا جو اس کے جذبات کا پہلا قاتل ثابت ہوا تھا۔ یہ جملہ اس کے باپ کا تھا۔ اس کے باپ کے مطابق جوان بیٹی جب گھر میں ہو تو اس کی شادی کی فکر کرنی چاہیے اگر بغیر شادی کے جوان بچی مر جائے تو جنازہ حلال نہیں ہوتا۔ یہی وہ نقطہ ہے جو فخر النساء کے دماغ میں ناسور بن کر اس کی زندگی کو چاٹ لیتا ہے۔

اس کا باپ نور الاسلام بجائے بیٹی کی حالت پر افسوس اور دکھ کرنے کے وہ پھر سے فخر النسا کی شادی کی فکر میں ہوتا ہے اور بالآخر وہ اس کی شادی ایک عربی سے کر دیتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اچھے شخص کے ساتھ اس کی بیٹی ٹھیک ہو جائے گی۔ مگر اس کا یہ خیال اس وقت وہ ہوا ہو جاتا ہے جب اسے خبر ملتی ہے کہ اسلام آباد میں حاطب کو کسی نے گولیاں مار کر قتل کر دیا ہے۔ اب فخر النساء پر نہ شادی کا کوئی اثر ہوتا ہے نہ تیسرے شوہر

کے مارے جانے پر کوئی افسوس یا دکھ۔ وہ بس اپنی ہی دنیا میں رہتی ہے، اس کے بھائی اسے جب ماہر نفسیات کے پاس لے جاتے ہیں کہ علاج شروع کر دیا جائے تو فخر النساوہاں ایک ایسی کہانی بیان کرتی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر نے جب پوچھا کتابوں کے علاوہ آپ کی کیا دلچسپی ہے اس پر فخر النسا اسے یوں مخاطب کرتی ہے:

"کوئی خاص نہیں میں ان دنوں عبوری دور سے گزر رہی ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ میں مر چکی ہوں لیکن قبر نہیں مل رہی اس لیے سوچا تھا کہ شادی کر لوں میرا اصل شوہر ظفر ہی ہے باقی کے خاوند ابا جی کی خوشی سے قبول کر لیتی ہوں وہ ریپ تو کرتے ہیں مگر عورت گنہگار نہیں ہوتی جب تک میرا اصلی شوہر میری قبر کا معمہ حل نہیں کرتا میں بھٹکتی رہوں گی" [47]

ڈاکٹر جب اسے سمجھنے کے لیے مزید سوالات کرتا ہے تو وہ پھر کسی اور دنیا کی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے جواب دیتی ہے

"کچھ واقعات کی صحیح ترتیب یاد نہیں، بات ذرا پرانی ہے نا، ساڑھے تین ہزار سال پہلے کا قصہ ہے اس وقت شراب حرام نہیں تھی۔ میں اور ظفر نے 3 ہجری میں اسلام قبول کیا جب اسلامی فوج نے مدینہ کا محاصرہ کر رکھا تھا ساٹھ ہزار سوار اور پندرہ ہزار پیادہ فوج تھی۔ لشکر اسلام کے سپاہی مسجد نبوی میں پناہ لیے ہوئے بچوں اور عورتوں پر بل پڑے، بچوں کو باہر ویرانوں میں لے گئے اور عفت مآب خواتین کی بے حرمتی کی گئی " [48]

فخر النسا کا یہ مکالمہ اصل میں اس کے شدید صدماتی عارضہ کا ثبوت ہے۔ اس کی زندگی میں اس کی مرضی کے خلاف تین نکاح کیے گئے اور ان تینوں سے جنسی طور پر مجروح ہوتی رہی اب اس کا یہ صدمہ اسے اپنی ذات کو واقعہ حرہ سے منسلک کر لینے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ واقعہ حرہ کی طرح اپنی ذات کو بھی پیش کرتی ہے کہ اس کے ساتھ بھی وہی ہوا جو مدینہ کے عفت مآب خواتین کے ساتھ ہوا تھا۔ ناول کی کہانی کے ساتھ ساتھ فخر النسا کی ذہنی حالت مزید بگڑتی چلی جاتی ہے۔ ظفر کو اگرچہ اس نے صرف ایک مرتبہ دیکھا تھا مگر اس کے محبت نامے نے اس کے دل میں اس کی محبت کا بیج لگا دیا تھا۔ فخر النسا کو اپنی اور ظفر کی محبت کا شعوری ادراک نہ تھا مگر جب وہ پے در پے صدمات کا شکار ہوئی تو اس کے لاشعور میں چھپی یہ محبت اس کی زبان پر بھی آجاتی

ہے۔ یہ اقرار اب کسی فائدے کا نہیں تھا کیوں کہ وہ ہر لحاظ سے مجروح ہو چکی تھی۔ وہ اس قدر ٹرومیٹک سٹریس ڈس آرڈر کا شکار ہو جاتی ہے کہ ظفر کا بچہ اس کی کوکھ میں پل رہا ہے۔ حالاں کہ نہ اس کی شادی ظفر سے ہوئی ہوتی ہے نہ ہی ظفر اسے کبھی ملا ہوتا ہے۔ فخر النسا کی یہ حالت ٹرومے کی سنگین اور پیچیدہ ترین شکل ہے جہاں وہ ہر احساس سے بے گانہ ہو چکی ہوتی ہے۔ ٹرومے (صدمے) کی یہ کیفیت وہ ہے جسے ٹرومے کی پیچیدہ ترین شکل کہا جاتا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جس سے کسی متاثرہ شخص کا باہر نکل آنا ایک معجزہ ہو سکتا ہے۔ ناول میں فخر النساء کا کردار جذباتی نفسیاتی اور پیچیدہ ترین ٹرومے کے اندر مبتلا نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ باوجود کوشش کے فخر النساء آخر تک اس صدمے سے باہر نہ آ سکی ناول میں دیگر کردار بھی ہیں مگر وہ وقت اور ضرورت کے مطابق اپنا کردار ادا کرنے کے بعد گم ہو جاتے ہیں۔

قلعہ جنگی

مستنصر حسین تارڑ کا ناول قلعہ جنگی 2002 یعنی نائن الیون اور امریکا کے افغانستان پر حملے کے فورا بعد شائع ہوا۔ ناول میں چند مجاہدین کا ایک نہایت کرب ناک منظر پیش کیا گیا ہے۔ نائن الیون کے بعد امریکا نے کس ظلم و بربریت سے معصوم مسلمانوں کو قتل کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس ناول کا انتساب ہی اس ناول کے تھیم اور زیرِ سطح موجود کرب کو واضح کر رہا ہے۔

"ان افغان بچوں کے نام جو بارودی سرنگوں کا شکار ہو کر اپاہج ہو گے
اور جو کسی فٹ بال میچ میں کھلاڑی نہیں ہو سکتے صرف گول کیپر ہو سکتے ہیں" [49]

ناول میں ایک قلعے کے تہہ خانے میں محصور چند مجاہدین کی اعصاب شکن اور شدید صدماتی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس ناول میں اگرچہ ٹراما کو کسی شخصی یا نفسی صورت میں پیش نہیں کیا گیا ہے مگر اس میں جس بے کسی، لاچارگی اور صدماتی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے وہ کسی بھی دردِ دل رکھنے والے کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ جہاد کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول دراصل ان لاکھوں لوگوں کی داستان کا نمائندہ ہے جو نہایت بے کسی میں مارے گے۔ قلعے میں موجود مجاہدین اور ان کے دریدہ ماحول کی عکاسی قاری کے دل و دماغ میں سرد سی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ یہ ناول ایک المیاتی کہانی ہے جس میں جذبہ جہاد سے سرشار مجاہدین کی زندگی کے آخری لمحات کو پیش کیا گیا ہے۔ بموں کی برسات میں سر بریدہ لاشے اور کٹے پٹے جسم نہایت خوف ناک منظر کو پیش کرتے ہیں۔ زاہدہ حنا قلعہ جنگی پر تبصرہ کرتے ہوے لکھتی ہیں

"قلعہ جنگی کی وسعت میں سر برویدہ لاشیں رہ گئیں، کٹے ہوئے بازو اور ٹکڑے ہو جانے والی ٹانگیں رہ گئیں، بس وہ سات ساتھی بچے تھے جو قلعے کے تہ خانے میں جا چھپے تھے۔ڈیزی کٹر اور کلسٹر بموں کے فولادی ٹکڑوں کو اپنے بدن میں سمیٹتے ہوئے، اذیت کے جھولوں میں جھولتے ہوئے، بھوک اور پیاس کو اپنے معدے میں، حلق میں سمیٹتے ہوئے ہر خستہ تن دوسرے ستم رسیدہ کو تسلی دیتا ہوا۔ یہ ان لوگوں کی داستانِ درد ہے جن سے اکثریت نفرت کرتی ہے دہشت گرد کہتی ہے لیکن معاملے کو ان کی نگاہوں سے بھی دیکھنا چاہیے اور یہ کام مستنصر صاحب نے بہت درد مندی سے کیا ہے"[50] روزنامہ ایکسپرس، اردو، 8مارچ،2014

یہ وہ الم ناک منظر ہے جو قاری کو بھی ٹرومیٹک اسٹریس میں مبتلا کر دیتا ہے۔ انسانی جذبات اتھل پتھل ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور ایک بے کسی کی کیفیت دماغ میں پیدا ہو جاتی ہے۔ مستنصر کا بیاں اس قدر جان دار اور پُر تاثیر ہے کی پڑھنے والے کی نفسیاتی دنیا کو زیر وزبر کر کے چھوڑ دیتا ہے۔ ناول کا ایک اقتباس اس کی عکاسی کرتا ہے۔

"قیدیوں پر بی 52 بمبار جہاز کا عتاب نازل ہو گیا، قلعے کی دیواروں میں نصب مشین گنوں نے جو کچھ ان کے بس میں تھا سب کا سب اگل دیا۔ ڈیزی کٹر اور بنکر بسٹر آسمان سے نازل ہونے لگے اور کچے صحن میں مٹی کے اتش فشاں ابل کر انہیں زندہ دفن کرتے گئے۔ یہ قیامت تو نہیں تھی پر قیامت سے کم نہیں تھی، بلکہ زیادہ تھی وہ رزق خاک تھے سو خاک ہوئے یہ کھیل تماشہ صرف چند لمحوں کا تھا اور پھر ختم ہو گیا"[51]

یہ منظر بلاشبہ ایک نارمل اور نرم مزاج رکھنے والے کے لیے کسی صدمے یا ٹرومے سے کم نہیں مستنصر حسین تارڑ کی موثر ناول نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر طاہرہ اقبال لکھتی ہیں

"تارڑ کا ہر ناول کسی بڑے حادثے یا المیے کے گرد بُنا گیا ہے۔ اس زمانے کی ساری کیفیتِ فطری اور افراد یا اقوام کی پوری سازش، تفصیلات اور جزئیات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ وقت کی بساط پر پرورش پاتے حادثے اپنی ساری عمل داری اور عوامل و محرکات کے ساتھ کہ سچائیوں کے ہمراہ ایک متحرک تصور ہو جاتے ہیں۔ یہ

> المیات قومی، تہذیبی، تاریخی اور کہیں ذاتی بھی ہیں۔ خصوصاً یہ قومی و تاریخی حادثات والمیات ناول کے صفحات پر اپنے سبھی مضمرات اور سیاق و سباق کے ساتھ قاری سے اپنا اشتراک قائم کرتے ہیں"[52] روزنامہ دنیا، میگزین، مستنصر کے ناولوں میں المیے کا تسلسل، 2 ستمبر 2023

قلعہ جنگی ایک ایسی داستان ہے جو اپنے بیان اور مناظر کی پیش کش کے لحاظ سے ٹرومیٹک سٹریس کے عناصر رکھتا ہے۔ مگر اس میں کلی طور پر کسی انفرادی یا شخصی ٹرومے کے آثار نہیں ملتے۔

اردو ناول اس صدی کی ایک موثر آواز سمجھا جا سکتا ہے۔ آئے روز تخلیق ہونے والے ناول نت نیے مسائل کو اپنے مزاج کے مطابق پیش کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ اردو ناول اپنے آغاز سے اکیسویں صدی تک ایک طویل سفر طے کر چکا ہے۔اس سفر میں اس نے اپنے ہر دور کے نہ صرف حالات و واقعات کو محفوظ کیا ہے بل کہ ایک تاریخ بھی مرتب کی ہے۔

ڈاکٹر روبینہ سلطان اس حوالے سے لکھتی ہیں۔

> "اکیسویں صدی تک آتے آتے ناول نے بہت موڑ کاٹے، اس صدی میں رجحانات بہت حد تک بدل گئے ہیں اور فکشن میں ان بدلتے ہوئے رجحانات اور اکیسویں صدی کے انسان کو درپیش صورت حال کا برملا اظہار ملتا ہے۔ اگر موجودہ دور کے فکشن پر نظر دوڑائی جائے تو اس بات کا بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ فکشن میں آج کے آدمی کو درپیش صورت حال کا ذکر بڑے واشگاف الفاظ میں ملتا ہے، چاہے وہ جنس کا بیان ہو یا کوئی معاشی مسئلہ وغیرہ "[53]

آج کا ناول بھی آج کے تمام تر بیانیوں کی ایک مکمل ڈائریکٹری معلوم ہوتا ہے۔

حوالہ جات

1. . https://helpguide.org/articals/PTSD
2. . Volkan Chosen Trauma resolved mourning: from ethnic Pride to Ethnic Terrorism, New York, 1997, P, 3
3. . Ayatollah, Dr, War Trauma History and Narrative: Analysis of selected Afghan Fiction in Unguiltier University Islamabad,21, P 3
4. . Domenik Lacapra, Writing History Writing Trauma, Baltimore, Johns Hopkins University Press 2001, P 21
5. ایضاً ص 21
6. Erikson, A new species of Trouble: Exploration in Disaster, Trauma and Community, New York, Harper Publisher ,2022 P 129
7. نازیہ پروین، ڈاکٹر، اکیسویں صدی کے ناول میں نفسیاتی بیانیہ، یونیورسٹی آف ایجوکیشن لاہور ص 3
8. نجیبہ عارف، ڈاکٹر، 11/9 اور پاکستانی اردو افسانہ منتخب افسانے، پورب اکادمی اسلام آباد، 2011، ص 8،7
9. محسنہ جیلانی، میں دہشت گرد ہوں، شہزاد پبلی کیشنز، کراچی، 2008، ص 8،7
10. ایضا ص 49
11. ایضا ص 31
12. ایضا ص 43
13. ایضا ص 71
14. ایضا ص 13

15. ایضا ص13
16. ایضا ص14
17. ایضا ص48
18. ایضا ص48
19. نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ، سنگِ میل پبلیشرز، لاہور، 2017ص47
20. ایضا ص51
21. ایضا ص23
22. ایضا ص9،8
23. ایضا ص119
24. ایضا ص125
25. ایضا ص294
26. ایضا ص159
27. ایضا ص70،29
28. ایضا ص205
29. ایم اختر، ایک لوسٹوری ایک ایٹمی قیامت، فکشن ہاوس، لاہور، 201، ص148
30. ایضا ص204
31. نگہت حسن، جاگنگ پارک، شہزاد پبلیشرز، کراچی، 2010، ص
32. ایضا ص53
33. ایضا ص9
34. ایضا ص5
35. ایضا ص53
36. ایم اختر، ایک لوسٹوری ایک ایٹمی قیامت، فکشن ہاوس، لاہور، 201
37. ایضا ص147
38. ایضا ص14
39. ایضا ص15

40. شفق (شفیق حسین)، بادل، کرونسٹ آفس، پٹنہ، انڈیا، 2002، ص42

41. ایم۔ اے قریشی، فرائیڈ اور لاشعور، مجلس ترقی ادب، لاہور، 2007 ص29

42. آمنہ مفتی، آخری زمانہ، الفیصل پبلیشرز، لاہور،، 2015، ص173

43. محمد الیاس، برف، سنگِ میل پبلیشرز، لاہور، 2010، ص155

44. ایضا ص157

45. ایضا ص15

46. ایضا ص148

47. ایضا ص149

48. ایضا ص180

49. ایضا ص180

50. مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، سنگِ میل پبلیشرز، لاہور، 2008 ص3

51. زاہدہ حنا، تارڑ کا قلعہ جنگی، روزنامہ ایکسپریس نیوز، 8مارچ، 2014

52. مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی ص44

53. طاہرہ اقبال، ڈاکٹر، مستنصر کے ناولوں میں المیوں کا تسلسل، روزنامہ دنیا، 2، ستمبر، 2023

54. روبینہ سلطان، تین نئے ناول نگار، دستاویز پبلیشرز، لاہور، 2012

باب پنجم

مجموعی جائزہ، نتائج، سفارشات

الف۔ مجموعی جائزہ

فکر و نظر جہاں انسان کے ذاتی تدبر، سوچ اور داخلی دنیا سے متصل ہے وہیں خارجی دنیا بھی انسان کی اس صفت پر پوری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ فی زمانہ انسان اپنے موجودہ دور اس کے حالات اور ماحول سے اثرات وصول کرتے ہوئے ان کو اپنے پیچیدہ ترین ذہنی اور شعوری سرمائے سے ہم آہنگ کر کے فکری اور انقلابی سطح پر عیاں کرتا رہا ہے۔ ہر دور میں انسان وہی کچھ سن اور سنا سکتا ہے جو اس دور کے ساتھ مخصوص ہو ۔وقت، حالات اور زمانہ کروٹ بہ کروٹ قدیم سے جدید اور جدید سے مابعد جدید ہوتا چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی انسان بھی اپنے ہر ہر تہذیبی و ثقافتی پہلو سے ارتقا کرتے کرتے دور رواں میں داخل ہو چکا ہے۔ اس ارتقائی اور شعوری سفر میں مختلف عناصرِ زندگی نے انسان کے ضمیر، زبان و بیاں، عمل یا ردِ عمل میں تبدیلی کا سفر جاری رکھا۔ ہم زمانہ قدیم میں مرتب شدہ کتب کا مطالعہ کریں تو ہم اس دور کے تہذیبی اور ثقافتی مذہبی اور معاشرتی اور سیاسی و سماجی رویوں کو پڑھ کر اس دور کے حالات و واقعات کو سمجھ سکتے ہیں۔ یعنی دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر دور کا لکھاری اپنے دور کا ترجمان اور مبلغ کا مبلغ ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ہر دور کا زبان و ادب انسان کا اہم ترین سرمایہ حیات رہا ہے۔ یعنی ادب اور عصریت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عصری منظر نامہ بہ صورت تحریر ادب میں تخلیق ہو کر اپنے وجود کو محفوظ بناتا چلا آیا ہے ۔انسان نے جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی میں انقلاب برپا کیے ہیں وہی ادبی تخلیقات کے بیان اور تفہیم کے حوالے سے بھی نت نیے رجحانات اور تیکنیکس کو فروغ ملتا رہا ہے۔ انھی رجحانات اوت تیکنیکس کو بروئے کار لا کر ادیب اپنے ادبی فن پارے کو مرصع کر کے پیش کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کسی بھی قوم کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی نظریات بھی بھرپور طریقے سے ادب میں جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے فلسفے اور نظریے ادب کے ڈھانچے کو متاثر کرتے ہوئے اس پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ نو آبادیات اور مابعد نو آبادیات، جدیدیت اور مابعد از جدیدیت وغیرہ جیسی تمام فکری مباحث ادب کے اندر بہ خوبی دیکھی اور پڑھی

جا سکتی ہیں۔ یہ مباحث ہر دور اور زمانے سے ہوتی ہوئی موجودہ زمانے میں داخل ہوئیں ہیں۔ موجودہ زمانہ تو اپنے نوعیت کا ایک منفرد اور ارفع ترین زمانہ ہے جس میں انسانی تہذیب و تمدن کو وہ عروج حاصل ہوا ہے کہ جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سارا عالم سمٹ چکا ہے، مشرق و مغرب کی تمام حد بندیاں محض علامتی رہ گئی ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آج ساری دنیا ایک وحدت میں ڈھل کر کل کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ قوموں کے اندر میل جول بڑھنے اور مختلف معاشی اور تجارتی ضروریات و مفادات نے انسان کو مجبور کیا ہے کہ وہ اپنے علاقوں، خطوں اور منطقوں سے نکل کر ایک عالم گیر معاشرہ تشکیل دیں۔ اس پُر آشوب دور میں ادب بھی مخصوص قومی، سیاسی اور مذہبی حد بندیوں میں مقید نہیں رہا بل کہ اس نے بھی آفاقی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس لیے آج کا ادب اور ادیب ایک وسیع کینوس پر اپنے مشاہدات، تجربات اور نتائج کو بیان کر رہے ہیں۔ عالمی سطح پر رونما ہونے والے واقعات اب کسی ایک قوم کا مسئلہ نہیں رہے بل کہ ہر قوم کا درد اور آواز اس میں شامل ہے۔ معاشی نظاموں کا ٹکراؤ ہو یا سپر پاور بننے کی جنگ، زلزلوں کی تباہ کاریاں ہوں یا سیلابوں کا طوفان ،سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ہو یا خلاؤں کو چھان مارنے کا جنون یہ سب ادبی افق پر طلوع ہو کر تخلیقیت کی رو میں بہہ کر وجود حاصل کر رہا ہے۔ اس عالم گیر اور ہمہ گیر معاشرتی تنوع کو تقریباً ہر صنف ادب میں بیان کیا گیا ہے مگر اس کا سب سے اہم اور معتبر اظہار ناول کی صورت ہی میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام دنیا میں ایسے ہزاروں ناول لکھے گئے جن میں گلوبلائزیشن کے رجحان کے تحت موضوعات کو جگہ دی گئی ہے۔ اردو زبان میں بھی بہت سارے ایسے ناول تخلیق ہوئے ہیں جن میں ملکی سطح سے لے کر عالمی سطح تک کے تمام اہم عصری حالات و واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ ناول اپنی ترکیب میں ایسی صنف ادب ہے کہ اس میں قصوں کو کہانیوں کو اور ماجروں کو بہتر طریقے سے پیش کیا جا سکتا ہے ، کرداروں کی خصوصیات سمیت کہانی کی تمام جزیات کو ناول میں ایک ربط اور ترتیب سے پیش کیا جا سکتا ہے ۔ ایک اہم بات جو ناول کے حوالے سے مخصوص ہے وہ یہ کہ ناول ایک طرف تو عصری شعور کے تحت لکھا جاتا ہے تو دوسری طرف یہ خود انسانوں کی تاریخ سے بھی متعلق رہا ہے۔ ہر دور کا ناول اپنے دور کی تاریخ کا پیامبر ہوتا ہے اگرچہ یہ تاریخ ناول کے تھیم میں غیر محسوساتی طریقے سے کار فرما ہوتی ہے اور تھیم کو متاثر نہیں کرتی۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول کا خمیر موجود تاریخ عناصر سے حاصل کیا جاتا ہے اور پھر اس کو ناول کی روح میں ایک کہانی کی صورت میں ایسا جسم عطا کیا جاتا ہے جو مختلف سطحوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ ایک سطح تو تاریخیت ہے اور دوسری سطح وہ فلسفہ یا نظریہ جو اس ناول کے اندر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ تیسری سطح زبان و بیان میں رونما ہونے والی تبدیلیاں اور

لسانی تشکیلات، چوتھی یہ کہ ذوق سلیم کی تشنگی دور کرنے کے لیے اس ناول کا ادبی رنگ کیا ہے؟ دور جدید میں لکھے گئے اردو ناول بھی انھی سطحوں پر گامزن نظر آتے ہیں۔ مختلف ناولوں میں کہانی کے پیش کرنے کا اسلوب ، تخلیق کا طریق اور ہیت ممکن ہے جدا جدا ہوں مگر ان میں ایک مماثلت ضرور ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ان میں عصری حالات و واقعات کو شعوری اور لاشعوری طور پر جگہ دی گئی ہوتی ہے۔ اکیسویں صدی کے آغاز ہی میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس کے اثرات ابھی تک دنیائے عالم میں کارفرما ہیں۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی نے بڑی سرعت سے سارے عالم کو اپنی لپیٹ میں لیا۔ اس تباہ کاری کا محرک کون تھا؟ اس پر تو تحفظات ہو سکتے ہیں مگر اس تباہی کے جو اثرات پوری دنیا میں رونما ہوئے ان سے انکار ممکن نہیں۔ اس واقعے سے پھوٹنے والے دیگر مضر حالات و واقعات بھی ایک سیریز کی طرح ابھی تک رواں دواں ہیں۔ پورا عالمی منظر نامہ یکسر تبدیل ہو کر رہ گیا اور ساری دنیا میں افراتفری پھیل گئی۔ کہنے کو تو یہ امریکہ میں دو عمارتوں کا انہدام تھا مگر اس کی لہریں زلزلے کی صورت میں برصغیر پاک و ہند تک آ پہنچیں۔

نائن الیون کے بعد اردو ناول نے اکیسویں صدی کے بدلتے اور تغیر پذیر حالات میں بھی ثابت کیا ہے کہ یہ صنفِ ادب ابھی تک نہ صرف زندہ ہے بل کہ جدت کے ساتھ رواں دواں بھی ہے۔ یہ کہنا بھی درست ہے کہ اردو ناول اپنے آغاز ہی سے اہم اور یادگار ناولوں سے مالا مال رہا ہے۔ اسلوب کا بیان ہو یا موضوعات کی رنگا رنگی، سماجی رویوں کا اظہار ہو یا سیاسی کشمکش کی داستان، تیکنیک اور موضوعات کے حوالے سے ہمیشہ اردو ناول میں بھی اعلا اور دلچسپ ناول وجود میں آتے رہے ہیں۔ اردو ناول کے حوالے سے بیسویں صدی اپنے اندر ایک طویل داستانِ بیان رکھتی ہے جو ناولوں کے وقار اور اہمیت کے حوالے سے ایک مستند حوالہ ہے۔ لیکن اکیسویں صدی کی ان دہائیوں ہی میں جدید رجحانات اور جدید معاشرتی، سیاسی، معاشی رویوں کے تناظر میں بہت سارے اہم اور قابل قدر ناول لکھے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ناول بہت کم عرصے میں بچپنے سے ہوتا ہوا لڑکپن اور پھر اب ایک پختہ عمر میں داخل ہو چکا ہے۔ بیسویں صدی سائنسی اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی صدی قرار دی جاتی ہے۔ اس صدی نے جتنی تیزی سے ساری دنیا کو ایک وحدت کی صورت عطا کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ پرانے یا پہلے دور کے ناول نگاروں کی نسبت آج کے ناول نگار کا نقطہ نظر زیادہ وسیع اور جامع ہے۔ اس کی نظر ساری دنیا میں رونما ہونے والے سیاسی، سماجی، عقلی اور سائنسی حالات پر ہے۔ اس لیے آج کے ناول نگار کے پاس تخلیقیت کا وسیع کینوس موجود ہے۔ اظہارِ بیاں کے بھی نئے نئے طریقے آج کے ناول نگار کے اظہار میں شامل ہیں۔ ہر دور کا مصنف اپنے دور میں وقوع پذیر حالات و واقعات سے متاثر ہوتا ہے

اور پھر وہ ان حالات و واقعات اور رونما ہونے والے ماحولیاتی منظر سے اپنی تخلیق کے مسالے کو حاصل کرتا ہے اور بیان کرتا ہے۔ ہر دور اپنے سے پہلے دور سے ہر ہر حوالے سے بہتر سوچ، فکر، اسلوب اور طرز بیان رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے اکیسویں صدی کا مصنف یا ناول نگار تو ہمہ گیر اور پیچیدہ ترین ماحولیاتی ترکیب سے اپنے مزاجِ تخلیق آشنا کرتے ہوئے قلم فرسائی کرتا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا، سوشل میڈیا اور دیگر برق رفتار مواصلات نے واقعات کی ترسیل کو وہ رفتار عطا کی ہے کہ چند لمحوں میں ایک خبر دنیا کے ہر کونے میں پہنچ جاتی ہے۔ اتنے تیز ہمی گیر اور جدید ماحول میں ناول نگاری کے بنیادی ڈھانچوں میں بھی جدت نمودار ہوئی ہے۔

اکیسویں صدی میں جس تیزی سے حالات و واقعات ایک تسلسل کے ساتھ وقوع پذیر ہو رہے ہیں وہ ہر سطح پر انسانی مزاج، معیار، سوچ، فکر اور تخلیقیتِ ادبی پر اثر انداز ہو کر ایک نئے ادبی افق کو فروغ دے رہے ہیں۔ انسانی زندگی میں عام سطح سے لے کر مخصوص نفسیاتی زاویوں تک تبدیلی اور جدت کا جن اپنی حشر سامانیوں سے پرانے تمام سماجی اور اخلاقی ڈھانچوں کو اپنی ہیت اور روایت کو چھوڑ کر ایک نئے اندازِ فن کو اپنانے پر مجبور کر رہا ہے۔ اسی تبدیلی اور جدت کے بہاؤ میں اردو ناول نے بھی اپنے اندازِ نظر میں ایک مخصوص تبدیلی پیدا کی ہے۔ ناول کی ترکیب تو وہی ہے مگر اس کے بیان کے لیے جو ٹول استعمال ہونے لگے ہیں ان کا تصور پہلے زمانے کا ناول نگار نہیں کر سکتا۔ بیانیہ اندازِ بیاں، مکالماتی اندازِ بیاں ڈرامائی اندازِ بیاں، ڈائری طرز کا بیان، خطوط طرز کا بیان تو اردو ناول میں فی زمانہ مروج رہا ہے مگر اب کے ناول میں مواصلاتی نظام کی جدت نے بھی اپنا رنگ عطا کیا ہے۔ مثلاً آج کے ناول نگار کے پاس ناول کے بیان کے لیے جو ٹول ہو سکتے ہیں وہ یہ ہے میسنجر کا طرزِ بیان، واٹس ایپ کی ترکیب، فیس بک کا ترکیبی بیان، ای میلز کی ترکیب میں ناول کا بیان اور تمام ویڈیو ٹولز جو باہم رابطے کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں۔ ان سب ذرائع کا استعمال جس قدر ہماری زندگی میں بڑھ گیا ہے تو وہ وقت دور نہیں جب اردو ناول کی دنیا ان بیان کردہ ٹول سے مکمل طور مزین ہو جائے گا۔ قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم اور کائناتی تسخیر کا جنون بھی ایک ترکیبی استعارہ بن کر اردو ناول کے اندر اپنا وجود مستحکم کر چکا ہے۔ ایک اور اہم پہلو جو اردو ناول کے اندر وسیع اور جدید اسلوب کو فروغ دے رہا ہے وہ بین الاقوامی ادبی ذخیروں کا اردو زبان میں ترجمہ ہے۔ اردو ناول کی ہیت، اسلوب، موضوعات وغیرہ پر مرتب ہونے والے اثرات نے ناول کے افق پر ایک نئے منظر نامے کو ترتیب دیا ہے۔ ایک تخلیق کار جو اپنے اندر حساس طبیعت کو لیے اپنے ماحول کو کشید کر کے لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ ان جدید پہلوؤں کو زیر قلم لا کر انہیں ابدیت بخشتا ہے یعنی ایک لحاظ سے اس کے تخلیقی سفر کا ارتقا ماحول کے ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے۔ عصرِ رواں

میں نئے اسلوب اور معیارات کے تحت لکھنے والوں میں خالدہ حسین، آمنہ مفتی، مستنصر حسین تارڑ نکہت حسن ،مرزا اطہر بیگ، احسن فاروقی مشرف ذوقی، نیلم احمد بشیر، محمد الیاس، شفق حسین، ایم اختر عبد الصمد وغیرہ شامل ہیں۔

اکیسویں صدی کی شروعات پر عمومی خیال یہ تھا کہ اردو ناول تنزل کا شکار رہے گا مگر اردو ناول نگاروں نے اعلا معیار کے ناول لکھ کر اس خیال کی تردید کر دی ہے۔ اکیسویں صدی کے لیل ونہار نے ساری دنیا کو جس ایک مشترکہ مسئلے سے دوچار کیا ہے وہ دہشت گردی ہے، دہشت گردی نے جہاں پوری دنیا میں انسانوں کو اپنے ستم کا نشانہ بنایا وہی مجموعی طور پر انسانوں کو اس مشترکہ سوچ پر متحد اور متفق کیا کہ دہشت گردی مذہب، نسل اور علاقے سے متصل نہیں اور یہ کہ یہ ساری دنیا کا مسئلہ ہے نہ کہ کسی ایک ملک یا قوم کا ۔معاشی طور پر اقوام عالم واضح طور پر دو طبقوں میں تقسیم ہے۔ کسی بھی لکھاری کا نقطہ نظر اب محض اپنی قوم کی حالت اور طبقاتی تقسیم ہی پر مذکور نہیں بل کہ یہ اب آفاقی سطح پر بھی حالات وواقعات کی نزاکت کا ادارک کر رہا ہے۔ عالمی استعماری طاقتیں تیسری دنیا کے ممالک کا استحصال کر کے اپنی معیشت اور طاقت میں اضافہ کر رہی ہیں۔ معاشی نظام کی جنگ جو سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کے مابین جاری ہے، نے بھی ایک عجیب کش مکش پیدا کر رکھی ہے۔ نائن الیون کا واقعہ ہو یا افغانستان اور عراق پر امریکہ کا حملہ، چین کی بڑھتی ہوئی دفاعی اور معاشی طاقت ہو یا امریکہ اور روس کی سرد جنگ، پاکستان کے اندر دہشت گردی کا وجود ہو یا کشمیر کا سلگتا ہو مسلہ، یہ وہ حالات ہیں جو آج کے لکھاری کے فکر و نظر میں سما کر ادبی سطح پر نمودار ہو رہے ہیں۔ اسی جدید منظر نامے میں نئی اصطلاحات بھی جنم لے رہی ہیں اور ناول نگار کے مزاج میں رچ بس کر ایک نئے اندازِ فن میں جلوہ فگن ہو رہی ہیں۔ یاد رہے کہ جدید طرزِ تکلم کے ساتھ ساتھ ضروریات ناول کا وہی پرانا اصول ابھی تک مستعمل ہے۔ یعنی آج کا ناول بھی کسی نہ کسی تہذیبی، نفسیاتی، سیاسی، سماجی اور اخلاقی پس منظر میں لکھا جاتا ہے اگر چہ اس کا انداز پہلے سے مختلف ہے۔ گلوبلائزیشن کی وجہ سے اس پس منظر میں ساری دنیا شامل ہو گئی ہے یوں آج کا ناول اور اس کا موضوع آفاقی سطح کا پیغام رسان بن رہا ہے۔ ماضی کے قصے ہوں یا حال کی منظر کشی، مستقبل کی صورت گری ہو یا اسلوب کی رنگا رنگی، آج کا ناول نگار ایک بڑے معاشرے کو اپنے فن سے متاثر کر رہا ہے۔

کسی بھی تحریک، رجحان یا واقعے کا جہاں مثبت اثر ہوتا ہے وہیں اس کے منفی اثرات بھی ہر صورت بالائی سطح یا زیر سطح محسوس کیے جاتے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے جہاں انسانی زندگی کو آسان اور پر سکون

بنایا ہے وہیں اس کے بنیادی تہذیبی، ثقافتی، اخلاقی اور معاشرتی ڈھانچے کو بھی بری طرح متاثر کیا ہے۔ مشینوں کی حکومت اور ٹیکنالوجی کے استعمال نے انسان کے اندر بے کیفی، بے سکونی، منتشر فکری، منافقت، ڈپریشن ،صدمات، انا پرستی اور خیالات کا انتشار پیدا کیا ہے۔

مابعد نائن الیون کے منطقے کو ایک عالم گیر سانحے کے طور پر جانا جاتا ہے اور اس منطقے کی خصوصیات کے اندر تیزی سے بدلتے عالمی حالات کو بخوبی دیکھا اور سنا جا سکتا ہے۔ زیرِ تحقیق موضوع کے اندر اس بات کا تجزیہ کیا گیا ہے کہ کس طرح اردو ناول نے ہمہ گیر موضوعات اور علامتوں کو اپنے اندر شامل کر کے انہیں بیان کیا ہے۔ دہشت گردی، انتہا پسندی، مذہبی جنونیت، گلوبلائزیشن، ٹیکنالوجی کی جدت وغیرہ جیسے معاملات اردو ناول کی بنت میں شامل ہو کر بیان ہو رہے ہیں۔ پاکستان اور بھارت میں ایسے بے شمار ناول لکھے گئے ہیں جن میں اس سارے منظر نامے کو بہت باریکی اور مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے

ان دو دہائیوں میں شائع ہونے والے ناولوں میں طرح طرح کے موضوعات، نظریات اور فلسفہ ہائے زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ ان ناولوں میں موضوعات کی وسعت اور تنوع نے اپنی مستحکم جگہ بنائی ہے۔ اس سارے دورانیے میں جو غیر معمولی تہذیبی، سماجی، سیاسی، مذہبی اور اخلاقی تغیر رونما ہوا ہے اسے آج کے ناول نگار نے بہت مہارت سے اردو ناول کا حصہ بنا کر پیش کیا ہے۔ انسانی روابط میں قربت کی بات ہو یا سائنس اور ٹیکنالوجی کی معراج کی داستان، عالمی استعماری طاقتوں کی رسہ کشی ہو یا تیسری دنیا کے ممالک کی زبوں حالی ،اردو ناول کے بیان میں تہ بہ تہ ان سارے مسائل کو فلاسفرانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ دراصل دورِ حاضر کے ہمہ جہت تجربات اور مشاہدات آئے روز انسانوں کو ورطہ حیرت میں ڈال رہے ہیں۔ انسان کے دماغ کی تفہیمی صلاحیت ان تجربات اور مشاہدات کے تحیر کو تشریح اور توضیح کے ساتھ جدید اسلوب میں پیش کرنے کے لیے نئی اور جدید فنی مہارتیں حاصل کر کے بطور فن ان کو پیش کرنے میں مصروفِ عمل ہے۔ آج کے فن کار یا ادیب کو اپنی بقا کے لیے جدید ترین تراکیب کو نہ صرف سمجھنا پڑھ رہا ہے بل کہ ان کو برتنے کا ہنر بھی حاصل کرنا اس کے لیے ضروری ہو چکا ہے۔ اردو ناول کے تناظر میں دیکھا جائے تو دور حاضر کے تمام جدید مسائل اور حالات کو یقیناً جدید پیرائے میں پیش کرنے کی ایک مکمل کوشش نظر آتی ہے۔ اردو ناول ایک ہی وقت میں مختلف جہتوں کے ابلاغ کو کی کوشش کر رہا ہے یہ ناول ایک طرف تو دور حاضر کی ایک تصویر کہلا سکتا ہے تو دوسری طرف عالمی طاقتوں کی جابرانہ مزاج کی داستان بھی، اس میں انقلاب کی لہریں بھی محسوس کی جا

سکتی ہیں اور مزاحمت کے اشارے بھی، جدیدیت کے غبار میں آلود نظریہ ہائے حیات کو بھی دیکھا جا سکتا ہے اور مستقبل کے خاکے بھی ۔

رواں صدی کا منظر نامہ عجیب طرح سے نمودار ہوا ہے، یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ دور حاضر پوری طرح مادیت کی زد میں ہے، مادہ اور اس کا حصول اس دور کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ یہاں تک کہ روحانی کیف اور سرور کی تلاش کی بجائے آج کا انسان مادیت کے حصار میں اس قدر گم ہے کہ اسے خود اپنی ذات کی بھی خبر نہیں، صدیوں سے مستحکم مرکزیت کے بڑے بڑے برج الٹ چکے ہیں، طاقت کی مرکزیت بھی تقسیم ہو کر کثرت میں گم ہو رہی ہے۔ نئے اندازِ زندگی کو فروغ مل رہا ہے، عالمی طاقتوں کو جہاں اپنی طاقت کو برقرار رکھنے کے لیے جتن کرنے پڑ رہے ہیں وہیں انہیں مادی وسائل کے حصول کے لیے دیگر دنیا سے اچھے تعلقات بھی استوار کرنے پڑ رہے ہیں۔ کاروبار کے انداز بدل چکے ہیں، مقامی سیاست اب عالمی سیاسی چالوں کی مرہون منت ہے، کوئی ملک اپنے داخلی معاملات کو بیرونی دنیا سے کٹ کٹا کر ترتیب نہیں دے سکتا۔ یعنی ہر قوم اور فرد مادی فائدوں کے لیے مجبور ہے کہ وہ ایک طرف دیگر دنیا سے نبرد آزما رہے تو دوسری طرف اسی مادی فائدے کے لیے دنیا سے دوستی کا ہاتھ بھی بڑھاتا رہے۔ عجیب کشمکش زیرِ کار ہے، ساری دنیا حالتِ جنگ میں بھی ہے اور اسے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے حالت امن کو بھی اختیار کرنا پڑ رہا ہے۔ اس ساری صورت حال کا بغائر مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ آج ساری دنیا کا ایک ہی نظریہ ہے اور وہ یہ کہ کس طرح عالمی سطح کے مادی وسائل کو اپنے اختیار میں کر لیا جائے اور یہ نظریہ اپنی ذات میں ایسا ہے کہ ممکن ہی نہیں کہ دنیا میں امن قائم رہ سکے۔ اس عالمی سطح کی افراتفری کا براہ راست اثر دنیا کے مختلف ادبوں پر ہو رہا ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ناول اپنی ترکیب میں واقعات، فکریات اور حالات کو بیان کرنے کا بہترین ذریعہ ہے لہذا اس پر بھی اس سارے منظر نامے کے وسیع اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ناولوں میں موضوعاتی تنوع پہلے کی نسبت زیادہ بڑھ چکا ہے، روح کی بے قراری مایوسی، نا امیدی، موت کی ارزانیاں ،زندگی کی دشواریاں، غربت، معاشرتی ناانصافیاں، عدم مساوات، دہشت گردی، جنگوں کا شور، ایٹمی جنگوں کے خطرات، ماحولیاتی تبدیلیاں اور دیگر بے شمار مقامی اور عالمی مسائل انسانی اذہان اور فکر کو بری طرح متاثر کر رہے ہیں اور اسی لیے یہ سب مسائل آج کے ناول کے اندر پیش بھی کیے جا رہے ہیں۔ اردو ناول نے بھی اس الجھتے، سنبھلتے اور تیزی سے بدلتے منظر نامے کو اپنے مزاج کا حصہ بنایا ہے اور پیش کیا ہے۔

مابعد نائن الیون اردو ناول نے عالمی ادب کے ناولوں کی طرح اپنے دامن کو تمام تر حالات کو جگہ دی ہے اور بیان کیا ہے۔ اردو ناول بدلتے حالات کے پیش نظر اظہار اور اسلوب بیان کے نئے تجربات کر چکا ہے۔ نئی تکنیکس اور اسالیب کو اردو ناول کے اندر آزمایا جا چکا ہے۔ گلوبلائزیشن کے زیرِ اثر ساری دنیا سکڑ چکی ہے اس سکڑاؤ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات و واقعات نئی جہت سے نمودار ہو رہے ہیں جن کو سمجھنے کے لیے نئے تصورات ، نئے مزاج اور فکری رویوں کی ضرورت ہے لہذا ناول نگار کو اس پیچیدہ ترین عہد کو سمجھنے کے لیے پہلے سے زیادہ فکری بالیدگی کی ضرورت پیش آرہی ہے تاکہ وہ موجودہ دور کی آواز کو موثر انداز میں بیان کر سکے۔

منتخب اردو ناولوں کے تجزیے اور مطالعے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اردو ناول نے مابعد نائن الیون عالمی حالات جو کروٹ لی ہے اسے اپنے وجود کا حصہ بنایا ہے۔ ایسے بے شمار ناول لکھے گئے ہیں جن میں مابعد نائن الیون پیدا شدہ حالات و واقعات کو موثر انداز میں پیش کر کے دور حاضر کے عالمی منظر نامے کو محفوظ کیا گیا ہے۔ نائن الیون کے بعد جس طرح کے معاشی، معاشرتی، سیاسی اور بین الاقوامی حالات نے جنم لیا، اردو ناول کے بیان میں ان حالات و واقعات کو بھی بہ کثرت پیش کیا گیا ہے۔ امریکہ کی کھلی دہشت گردی کا بیان ہو یا اس کے مسلمان ملکوں افغانستان اور عراق پر حملے، دہشت گردی کی لہر کا ذکر ہو یا انتہا پسندی کی شدت، مغرب میں اسلاموفوبیائی فکر کے نتائج ہوں یا عالمی معاشی نظاموں کے چپقل، ش فوجی آپریشنز کی آواز ہو یا انسانوں پر بموں کی برسات، اسامہ بن لادن کی تلاش اور ایبٹ آباد آپریشن کا قضیہ ہو یا پاکستان پر ڈرون حملے، امریکہ کے جدید اسلحے کے استعمال کا بیان ہو یا ڈیزی کٹر بموں کی برسات، بی 52 طیارے کے حملے ہوں یا تورا بورا کے پہاڑی سلسلوں پر قیامت خیز بمباری، پاکستان میں یونیورسٹیوں، کالجوں، مدرسوں اور پارکوں میں خود کش حملوں کی داستان ہو یا بدلتے سیاسی رجحان، اندرونی بدامنی ہو یا عالمی اضطراری کیفیت، اردو ناول نے ان تمام موضوعات کو بہ خوبی اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ ایسے ناول بھی موجود ہیں جن میں عالمی استعماری نظام کے خلاف مزاحمت کے اشارے بھی ملتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کا "قلعہ جنگی"، ایم اختر کا ناول "ایک لفظ سٹوری ایک ایٹمی قیامت" اور آمنہ مفتی کے ناول" آخری زمانہ "میں مزاحمتی فکر کو بھی بیان کیا گیا ہے ۔ تہذیبی تفاوت اور دوری کا اظہار بھی اردو ناولوں میں پیش کیا گیا ہے، ترقی یافتہ ممالک اور پاکستان جیسے تیسری دنیا کے ممالک کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی ابتری کا مقابلہ اور موازنہ بھی مابعد نائن الیون کے اردو ناول میں موجود ہے۔ شیراز دستی کا ناول "ساسا" اپنی نوعیت میں ایک ہمہ فکر ناول ہے اس ناول میں دورِ جدید کے ایک

اہم اور موثر ابلاغی ذریعے یعنی میڈیا کے کردار کو پیش کیا گیا ہے۔ عالمی میڈیا کس طرح ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت مسلمانوں اور اسلام کے خلاف اپنا زہر اُگل رہا ہے، اس کا ذکر بھی ناول "ساسا" کے اندر موجود ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ سارا میڈیا کوئی خاص طاقت کنٹرول کر رہی ہے اور وہ صرف یہ چاہتی ہے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو بہ طور دہشت گرد ثابت کر کے اسلام کو ٹارگٹ کیا جائے۔ غلط قسم کی رپورٹنگ سے مغربی اقوام کو مسلمانوں کے خلاف کرنے کی شعوری فکر کا ابلاغ بھی "ساسا" ناول کے اندر موجود ہے۔ اس کے علاوہ تہذیبوں کے فرق کو بھی اس ناول کے اندر پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول کا کردار سلیم جب اپنی دوست کے مر جانے والے پرندے کو دفنا رہا ہوتا ہے تو اس موقعے پر اسے اپنے ملک پاکستان اور امریکہ کا تہذیبی، معاشی اور ثقافتی فرق شدت سے زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ پرندے کو دفناتے وقت اسے اپنے ملک میں ہزاروں بچوں کے لاشیں یاد آتی ہیں جو بے گور و کفن پڑی گل سڑ رہی ہوتی ہیں ۔ سلیم کو بری طرح اس چیز کا احساس ہوتا ہے کہ دنیا اتنی بڑی منافقت کا شکار کیوں ہے کہ ایک طرف تو پرندے کو پورے اہتمام سے دفنایا جا رہا ہے اور دوسری طرف انسانوں پر بموں کی بارش کر کے ان کے چیتھڑے اڑائے جا رہے ہیں۔ ناول "ساسا" میں نائن الیون کے بعد کے حالات و واقعات کو محبت کی علامت میں تلاش کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ امریکہ کے ماحول اور پاکستان کے ماحول کا موازنہ بھی اس ناول کے اندر موجود ہے افغانستان پر امریکہ کے حملے کے بعد پاکستان کو جو قیمت چکانا پڑی اس کی بازگشت بھی ناول کے اندر موجود ہے۔ اس کے علاوہ نائن الیون کے بعد معروف ہونے والی ایک عالمی اصطلاح "اسلام و فوبیا" کا بیان بھی ناول کے متن میں موجود ہے، یہ ناول گلوبلائزیشن کے وسیع اثرات کا حامل ایسا ناول ہے جس میں کہانی کی وسعت پاکستان کی سرزمین سے شروع ہو کر امریکہ تک پہنچ جاتی ہے۔ یعنی امریکہ اور پاکستان کے فاصلے سمٹ کر ایک کہانی میں زمان و مکان کی وسعتوں کو کم کرتے ہوئے ایک ہی جگہ مرکوز نظر آتے ہیں۔ محبت جو ایک انفرادی جذبہ ہوتا ہے اس ناول میں اسے بھی ایک آفاقی تناظر میں پیش کر کے اسے ایک امن کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ عالمی تضادات اور معیارات کا فرق کس طرح تیسری دنیا کے لوگوں کو نفسیاتی لحاظ سے متاثر کر رہا ہے اس کا ذکر بھی سلیم کے کردار کے ذریعے ناول نگار نے پیش کیا ہے۔

ناول "طاؤس فقط رنگ" میں نیلم احمد بشیر نے نائن الیون سے کچھ قبل کے دور اور پھر بعد از نائن الیون مغربی اقوام کی مسلمانوں کے لیے نفرت انگیز فکر کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ناول ان ہزاروں اور لاکھوں مسلمانوں کے درد کی داستان ہے جو مغربی ممالک میں آباد ہیں اور جن کو وہاں شدید نسلی تعصب کا سامنا

کرنا پڑ رہا ہے۔ ناول میں ان خاندانوں کا ذکر ہے جن کو ایشیائی مسلمان یا پاکستانی ہونے کی وجہ سے آئے روز زدوکوب کیا جاتا رہا۔ مراد کے کردار کے ذریعے نیلم احمد بشیر نے مغرب کے خود ساختہ مہذب اور انصاف کے علمبردار معاشرے کی منافقت کو واضح کیا ہے۔ امریکن شہری ہونے کے باوجود بے شمار مسلمانوں کو مسلم ٹیررسٹ کہہ کر پکارا جاتا رہا اور انہیں شدید ذہنی اذیت میں مبتلا کیا گیا۔ وہ نسل جو پیدائشی لحاظ سے بھی امریکن شہری تھی اسے بھی سخت تنقید اور تعصب کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول میں مسلمانوں کے مابعد نائن الیون معاشی اور معاشرتی مسائل کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ ملازمتوں کے حصول میں دشواری اپنی شناخت کے مسائل اور مسلمان ہونے کی وجہ سے نفرت کا سامنا کرنا وہ عمومی مسائل ہیں جن کو "طاوس فقط رنگ" میں پیش کر کے امریکہ کی چکاچوند اور اس کی منافقت کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ امریکہ کی تہذیب اندر سے کس قدر کھوکھلی اور منافقت کا شکار ہے۔ محسنہ جیلانی نے اپنے ناولٹ میں خاص طور پر دو پہلوؤں کو پیش کیا ہے، ایک مغرب کا اسلاموفوبیا اور دوسرا مسلمان خاندانوں کو بعد از نائن الیون یورپ یا مغرب میں پیش آنے والے مسائل کا ذکر۔ "میں دہشت گرد ہوں" دراصل مغرب کی شدید نسلی تعصب میں مبتلا ہونے کی اس بیمار ی کی داستان ہے جس میں وہ اسلام اور مسلمانوں کو مکمل طور پر ختم کر دینے پر تیار نظر آتے ہیں ۔ مسلمان خاندانوں کو جس طرح ذہنی اذیتوں میں مبتلا کیا گیا اس کا ذکر بھی اس ناول کے اندر موجود ہے۔ اسی طرح نکہت حسن کا "جاگنگ پارک" ہو یا محمد الیاس کا ناول "برف" انڈیا کے ناول نگار شفیق حسین کا ناول "بادل "ہو یا مستنصر حسین تارڑ کا "قلعہ جنگی "عبدالصمد کا "جہاں تیرا ہے یا میرا" وغیرہ میں ان تمام مسائل اور موضوعات کو پیش کیا گیا ہے جن کا تعلق مابعد نائن الیون دہشت گردی سے ہو یا اسلاموفوبیائی فکر سے، عالمی معاشی نظاموں کی ٹکر ہو یا اندرونی سیاسی نظاموں کی خرابیاں یہ سب بیانیے میں اردو ناول میں تواتر کے ساتھ پیش کیے جا رہے ہیں۔ پاکستان میں دہشت گردی اور سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کے حوالے سے آمنہ مفتی کا ناول" آخری زمانہ "بہترین مثال ہے۔ اس میں دیہاتی زندگی کے مناظر کے ساتھ ساتھ پاکستان میں سیاسی عدم استحکام کا ذکر بھی ملتا ہے، دہشت گردی کے حوالے سے پاکستان کے مدرسوں اور سکولوں میں موجود دہشت گردی کے نیٹ ورک کے حوالے سے بھی ذکر اس ناول کا حصہ ہے۔ دہشت گرد کس طرح سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اساتذہ کو اپنا آلہ کار بنا کر نوجوان نسل کو دہشت گردی کے لیے استعمال کر رہے ہیں اس کا نقشہ بھی اس ناول میں مختلف کرداروں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ خالد جو دہشت گرد نیٹ ورک کا حصہ بن جاتا ہے دراصل ان ہزاروں معصوم نوجوانوں کا نمائندہ ہے جو کسی معاشی تنگ دستی کی وجہ سے یا اسلامی شدت

پسندی کی وجہ سے ملک دشمن عناصر کے ہتھے چڑ کر ملک دشمن سرگرمیوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ محمد الیاس کا ناول "برف "اسلامی تعلیمات پر شدت اور جہالت کی حد تک عمل کرنے والے کم علم مسلمان لوگوں کی ذہنیت کی عکاسی ہے۔ دین اسلام جو بہت آسان اور انسان دوست مذہب ہے، اسے تنگ نظر ملاؤں نے اتنا سخت کر کے پیش کیا ہے کہ بات بات پر جنت اور جہنم کے فتوے صادر کر دیے جاتے ہیں۔ حاجی نور الاسلام اپنی اسلام پر شدت سے پیروی کی وجہ سے اپنی خوب صورت اور ہونہار قابل بیٹی کی زندگی کو برباد کر دیتا ہے۔ ناول میں اس خاص فکر سے پردہ اٹھا کر پاکستان کے کم علم مسلمان شدت پسندوں کی ذہنی تشریح کی گئی ہے اور ان مضر اثرات کو بھی پیش کیا گیا ہے جو اسلام کے فطری نظام کو نہ سمجھنے والوں کو پیش آسکتے ہیں۔ ناول "برف " میں دیگر اہم موضوعات کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ ناول "بادل" میں شفیق حسین نے انڈیا کے مسلمانوں کے استحصال کو موضوع بنایا ہے۔ یہ ناول ہندوں کے مسلمانوں کے حوالے سے خاص متعصبانہ نقطہ نظر کو بیان کرتا ہے اور نائن الیون کے بعد انڈیا میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے مشترکہ معاشرے کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ امریکہ کے افغانستان پر حملے اور پاکستان میں افراتفری پر ہندوؤں کی مسرت کے اظہار اور انڈین مسلمانوں کی خاموشی اور بے بسی کو بھی استعارتا پیش کیا گیا ہے۔ ایم اختر کا ناول "ایک لوسٹوری ایک ایٹمی قیامت "اپنی نوعیت کا واحد ناول ہے جس میں نائن الیون کے بعد انڈیا پاکستان اور امریکہ کے باسیوں کی فکر کو پیش کیا گیا ہے۔ مابعد نائن الیون جس طرح دنیا پر جنگی جنون سوار ہے اور دنیا جس طرح پاکستان اور انڈیا کو کشمیر کے مسئلے پر اپنے اپنے مفاد کی خاطر الگ الگ پشت پناہی کر رہی ہے اس کا ذکر اس ناول کا حصہ ہے۔ نائن الیون کے اثرات کے بعد ناول نگار نے دنیا کو جنگوں کے نہایت مضر اثرات کا ادراک کرانے کے لیے پاکستان اور انڈیا کی ممکنہ ایٹمی جنگ کا نقشہ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ جنگ کس طرح ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے یہ وہ موضوعات ہیں جو آج اردو ناول میں بہ کثرت دیکھے جاسکتے ہیں۔

دوران تحقیق اردو ناولوں میں ٹراما تھیوری کے تحت ایسے عناصر یا کرداروں کی تلاش بھی مطلوب تھی جن سے معلوم ہو سکے کہ آیا نائن الیون یا اس کے بعد وقوع پذیر حالات نے انسانی ذہنوں پر بھی کوئی اثرات مرتب کیے ہیں یا نہیں؟ منتخب اردو ناولوں کے ذریعے کوشش کی گئی ہے کہ ان کرداروں کا مطالعہ یا تجزیہ کیا جائے جو کسی نہ کسی نفسیاتی صدمے کا شکار ہوئے ہوں۔ زیرِ تحقیق اردو ناولوں میں ٹرومیٹک عناصر کی تلاش سے قبل ٹراما کی وضاحت کی گئی ہے اور اس کی ممکنہ اقسام کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ انھی اقسام کی روشنی میں پھر منتخب اردو ناول کے اندر کی ٹرومیٹک پیش کش اور صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مختلف ماہرینِ نفسیات کے ٹرومے

کی پیمائش کے حوالے سے پیش کردہ ماڈلوں کو بھی بیان کر کے ان کی روشنی میں اردو منتخب ناولوں میں ٹروبیٹک عناصر کی تلاش کی گئی ہے۔ ٹراما کے حوالے سے اگرچہ منتخب ناولوں کے اندر کم ہی ذکر ملتا ہے مگر اتنا ذکر ضرور موجود ہے کہ ایسے کردار مل جاتے ہیں جن کے اوپر ٹراما کی کوئی نہ کوئی قسم یا کوئی نہ کوئی ماڈل صادق آجاتا ہے۔ محسنہ جیلانی کا ناولٹ "میں دہشت گرد ہوں" میں زرینہ کا کردار ایسا ہے جو نائن الیون کے بعد مغرب کی مسلمانوں کے خلاف نفرت کا شکار نظر آتا ہے۔ زرینہ جو شہریت کے لحاظ سے برطانوی ہے لیکن اسے مسلمان ہونے کی وجہ سے برطانیہ میں اس قدر ذہنی اذیت میں مبتلا کیا جاتا ہے کہ وہ ٹروبیٹک سٹریس سے متاثر ہو کر ڈر اور خوف میں اس طرح مبتلا ہو جاتی ہے کی زندگی کے حوالے سے عدم تحفظ محسوس کرتی ہے۔ اسے اپنی شناخت کی وجہ سے بھی سخت ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ پیدائشی طور پر تو برطانوی تھی مگر اسے مسلمان ہونے کی وجہ سے ہزاروں مسلمانوں کی طرح صدموں کا سامنا کرنا پڑا جو یورپ میں آباد تھے۔ یہ صورت حال اسے ذہنی، نفسیاتی اور جذباتی لحاظ سے اتنا دباؤ میں لے لیتی ہے کہ وہ خوابوں میں بھی ڈرنا شروع ہو جاتی ہے اور اس پر دہشت اور خوف کے دورے پڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔ نیلم احمد بشیر کے ناول "طاؤس فقط رنگ" میں جزوی طور پر کچھ ایسے کردار پائے گئے ہیں جو ٹروبیٹک سٹریس میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اس ناول کا کردار مراد تو اسلاموفوبیا اور مغرب کے نسلی تعصب کا شکار ہو کر ذہنی صدمات کو سہتا ہے۔ اسے بھی مسلم ٹیررسٹ کہہ کر مارا پیٹا جاتا ہے اور اس پر ملازمتوں کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ نائن الیون کے بعد مراد ان ہزاروں لاکھوں مسلمان لوگوں کے نمائندے کے طور پر سامنے آتا ہے جو امریکہ میں مقیم ہیں اور جن کو اپنی شناخت کے مسائل کا سامان ہوتا ہے۔ مراد کو شک کی بنیاد پر جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جس سے وہ شدید خوفزدہ ہو جاتا ہے اس کے لیے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا کہ باوجود امریکہ شہری اسے کیوں ٹیررسٹ کہا جارہا ہے، اسے کیوں ملازمتوں میں حصہ نہیں مل رہا؟ اس پر مستزاد یہ کہ اسے دہشت گرد کہہ کر جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہاں ناول نگار نے اس کی جو ذہنی حالت بیان کی ہے وہ ٹراما کی ابتدائی قسم ایکویٹ ٹروما کے مطابق نظر آتی ہے یا اسے لاکیپرہ کے ورکنگ تھرو ٹراما ماڈل کے مطابق بھی لیا جاسکتا ہے جس میں ٹراما میں مبتلا انسان خوف اور ڈر میں مبتلا تو ہو جاتا ہے مگر وہ اپنے روزمرہ کے معاملات کی پہچان بھی کر سکتا ہے۔ اس ناول میں ڈیلائیلا کا کردار ایک مکمل نفسیاتی صدمے میں مبتلا کردار ہے۔ ناول کے شروع میں ہی اس کی ابنارمل حرکات کا ذکر ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی خاص نفسیاتی یا جذباتی دباؤ کا شکار ہے۔ دراصل وہ اپنے ماں باپ سے بچھڑ جانے کی وجہ سے شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے مزاج میں فتنہ فساد اور نفرت شدت

سے نظر آتی ہے۔ اس کا کردار نفسیاتی اور جذباتی لحاظ سے شکست وریخت کا شکار نظر آتا ہے وہ اپنے جذبے میں شدت رکھتی ہے بھلے وہ محبت ہو یا نفرت، مراد سے محبت کرتی ہے مگر جب مراد نہیں ملتا تو اسے جیل میں ڈلوا دیتی ہے۔ ماں کو اپنے ستم کا نشانہ بناتی ہے۔ ڈی کے کردار ارلی چائلڈ ہڈ ٹروما کا شکار تھی۔ ماں باپ سے بچھڑ جانے سے اس کی شخصیت میں عدم استحکام پیدا ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ایک نارمل کردار کی طرح نہیں نظر آتی۔ اس ناول میں مسز چین بھی مکمل صحت مند نفسیاتی نظام نہیں رکھتی بل کہ وہ اپنی شادی کے ابتدائی دنوں میں ہونے والے ریپ اور اپنے وطن سے بچھڑ جانے کی وجہ سے ماضی پرستی میں مبتلا ہوتی ہے۔ وہ کئی مرتبہ حال سے ماضی میں چلی جاتی ہے اور گھنٹوں اسی حالت میں رہتی ہے۔ ٹرومیٹک سٹریس کی وجہ سے وہ فلیش بیک کا شکار رہتی ہے۔ انڈیا کے ناول نگار شفق کے ناول "بادل" میں سلما کا کردار ایک مخلوط معاشرے کا آئینہ دار ہے جس میں ہندو، مسلمان، سکھ اور دیگر مذاہب کے لوگ اکٹھے رہتے ہیں، سلما کا کردار اپنی بہن کی اذیت ناک موت اور والد کی موت کی وجہ سے ذہنی دباؤ کا شکار نظر آتا ہے۔ بہن کے ساتھ اس کے خاوند کے ظالمانہ سلوک نے اسے مردوں سے متنفر کر دیا تھا اور وہ کسی مرد پر اعتماد کرنے کے یقین سے محروم ہو چکی ہوتی ہے۔ دفتر میں راجیش نامی کولیگ کی ہراسانی اسے اس قدر ذہنی دباؤ میں مبتلا کر دیتی ہے کہ وہ ڈراونے خواب دیکھنا شروع ہو جاتی ہے اور بہت سے مردوں کو اپنے آپ پامال کرتے دیکھتی ہے۔ اس وجہ سے اس کی نیند متاثر ہوتی ہے اور وہ شدید خوف اور ڈر میں مبتلا رہتی ہے۔ اس ناول کا یہ واحد کردار ہے جو کسی حد تک ٹرومیٹک سٹریس کا شکار نظر آتا ہے۔ ناول "برف" میں فخر النساء کا کردار مکمل پیچیدہ ترین ٹروما کا اظہار ہے۔ فخر النسا جسے اس کی مرضی کے خلاف ایک مولوی سے بیاہ دیا جاتا ہے، اس پہلے شوہر کی وفات کے بعد اس کی شادی ایک بدکردار زبیر نامی شخص سے کر دی جاتی ہے۔ اس وجہ سے فخر النسا اپنی پامالی اور اپنی پڑھائی کے چھوٹ جانے کی وجہ سے بری طرح ذہنی صدمے کا شکار ہوتی ہے۔ اس کا باپ اس کی مشکل سمجھنے کی بجائے اس کی تیسری شادی کرا دیتا ہے جس کی وجہ سے فخر النساء مکمل طور پر جذباتی اور نفسیاتی ٹروما کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کے ٹروما کا تجزیہ کرنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ وہ ٹروما کے پیچیدہ ترین حصے میں پہنچ چکی ہوتی ہے جہاں ایک انسان سے اس یقین کو کھو دیتا ہے کہ وہ ایک محفوظ جگہ پر ہے یا اپنی شناخت کو ہی مکمل کھو دیتا ہے۔ فخر النساء ایکٹ آؤٹ ٹروما کا شکار بھی نظر آتی ہے جس میں مریض بار بار ایک ہی تجربے کی وجہ سے شدید ذہنی صدمے کا شکار ہو جاتا ہے۔ "برف" ناول کا کردار فخر النسا واحد کردار ہے جو مکمل طور پر ٹروما کے اندر مبتلا پایا گیا ہے۔ دیگر اور ناولوں میں جزوی طور پر ٹروما کے عناصر پائے گے ہیں۔ ان ناولوں میں ایم اختر کے ناول

کا کردار "اسامہ" مبتلا نظر آتا ہے۔ کہانی میں اسامہ اس وقت ذہنی صدمے کا شکار ہو جاتا ہے جب وہ لاہور میں جنگی حملے کے بعد اپنے گھر والوں کی کوئی خبر نہیں پاتا، ممکنہ ایٹمی میں جنگ میں جب پاکستان اور بھارت کو مکمل تباہ دکھایا گیا ہے تو یہ صورت حال اسامہ کے لیے نہایت خوف ناک ہوتی ہے، اسامہ ایک ماہرِ نفسیات کائی ایریکسن کے ثانوی درجے کے ٹرومے کے ماڈل کے مطابق نظر آتا ہے۔ نکہت حسن کے ناول "جاگنگ پارک" میں اجتماعی اور سماجی ٹرومے کی ایک کیفیت نظر آتی ہے جس میں بعد از نائن الیون تباہ شدہ معاشرے کی تصویر دکھائی گئی ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں ہر فرد کسی نہ کسی ذہنی عارضے میں مبتلا ہے۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ مابعد نائن الیون اردو ناول نے فکری اور فنی لحاظ سے بہت سارے اثرات قبول کیے ہیں اور ان کو اپنے بیانے کا حصہ بھی بنایا ہے نائن الیون نے عالمی سطح پر بھی مختلف زبانوں اور ادبوں پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔ امریکہ، برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک میں انگریزی میں بھی ایسے بیسیوں ناول لکھے گئے ہیں جن میں نائن الیون کے حادثے اور اس کے بعد کے وقوع پذیر حالات اور واقعات کو بیانیے کا حصہ بنایا گیا ہے۔ سیاسی سماجی ،معاشی اور معاشرتی لحاظ سے ان مسائل کا ذکر کیا گیا ہے جو عالمی سطح پر لوگوں کو دیکھنا پڑے۔ ان انگریزی ناولوں میں انفرادی زندگی کو ایک عالمی منظر نامے کے ساتھ ملا کر ان حالات اور واقعات کو پیش کیا گیا ہے جنھوں نے ہر سطح کی زندگی کو تہ بالا کر کے رکھ دیا۔ عالمی سطح پر بھی دہشت گردی، جنگ، دہشت، وحشت گلوبلائزیشن، سماجی اقدار کی شکست وریخت، میڈیا کا کردار وغیرہ موضوعاتی صورت میں فکشن کا حصہ بنے ہیں۔

تحقیقی مقالے کے لیے جن سوالات کو بنیاد بنایا گیا تھا ان کے مطابق منتخب اردو ناولوں کا جائزہ لیا گیا تو درج ذیل نتائج سامنے آئے ہیں۔

ب۔ نتائج

1 ۔ مابعد نائن الیون دنیا نیے عالمی منطقے میں اس طرح داخل ہو چکی ہے کہ ساری دنیا کو ایک گاؤں کی مانند قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سانحے نے دنیا کو رفاقت اور رقابت کے نئے تصورات سے آشنا کیا ہے ۔کہنے کو یہ سانحہ دو بلند و بالا عمارتوں کا انہدام ہے مگر اس کے اثرات نے ساری دنیا کو اور اس کے نظام ہائے زندگی کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ ایک ایسا منظر نامہ وجود میں آچکا ہے جس سے یک قطبی کہا جا سکتا ہے۔ ایک مخلوط معاشرت کا آغاز بھی اس سانحے کے بعد وقوع پذیر ہوا۔ دنیا بھر کی اقوام میں جہاں مفادات کی خاطر اتحاد نظر آتا ہے وہیں اختلافات بھی پوری شدت کے ساتھ عمل پذیر ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف دنیا ایک

طرف ایک ہی موقف پر نظر آتی ہے تو دوسری طرف یہی دنیا حقائق سے نظریں چراتے ہوئے محض اسلام اور مسلمانوں کو ہی تختِ مشق بنانے کے لیے تیار نظر آتی ہے۔ ایک عجیب دنیا اس سانحے کے بعد پیدا ہوئی ہے جو کسی خاص نظریے یا فلسفے کی حامل تو نہیں مگر پھر بھی ایک بالکل نئی اور الگ بکھری ہوئی صورت حال کو جنم دے چکی ہے۔ یہی کش مکش اور افر تفری انسانی تحقیقی مادے میں شامل ہو کر عالمی سطح کے ادبوں میں ظاہر ہو رہی ہے۔ نائن الیون کے کثیر جہتی اثرات ساری دنیا میں زندگی کے ہر شعبے میں بھی مرتب ہوئے ہیں۔

2۔ اردو ناول نے بھی فنی اور فکری لحاظ سے نائن الیون کے اثرات کو قبول کیا ہے۔ اردو ناولوں نے جدید رجحانات اور ٹیکنیکس کے ساتھ ساتھ عصرِ رواں کے موضوعات کو اپنے بیانیے کا حصہ بنا کر نہ صرف پیش کیا ہے بل کہ اس سے تاریخی اعتبار سے بھی محفوظ کیا ہے۔ نائن الیون کے اثرات اس لیے بھی اردو ناول پر مرتب ہوئے کہ امریکہ نے اس سانحے کی ذمہ داری القاعدہ اور طالبان کے سر ڈال کر افغانستان اور پھر عراق پر حملہ کیا تو پاکستان جو جنگ زدہ ممالک کے پڑوس میں ہے، پر شدید ترین اثرات سامنے آئے۔ پاکستان براہ راست اس ان دیکھی اور ان چاہی جنگ کا حصہ بن کر خانہ جنگی، دہشت گردی اور معاشی عدم استحکام کا شکار ہوا۔ لہٰذا لازمی امر تھا کہ یہاں کا ناول نگار اس سارے منظر نامے کو اپنی تخلیق میں شامل کر کے پیش کرے۔ ہزاروں نظمیں، افسانے اور ناول مابعد الیون اردو زبان میں وجود میں آئے جن میں نائن الیون بہ طور علامت، دہشت اور وحشت کے بیان ہوا ہے۔ منتخب اردو ناولوں کے جائزے کے بعد اس خیال سے مکمل اتفاق ہے کہ مابعد نائن الیون اردو ناول میں موضوعاتی تنوع کے ساتھ ساتھ فنی جدت بھی پیدا ہوئی ہے۔ وہ ناول نگار جن کا تعلق پاکستان سے تھا اور وہ بہت عرصے سے مغربی ممالک میں قیام پذیر ہیں، نے بہترین انداز میں ساری صورت حال کا ذکر کیا ہے جو مابعد نائن الیون پیش آئی۔ مغرب میں رہائش پذیر مسلمانوں کے مسائل کا ذکر ہو یا مغرب کی اسلاموفوبیائی فکر کا بیان، دہشت گردی کی منظر کشی ہو یا معاشی عدم استحکام کا نقشہ ،عالمی طاقتوں کی سرد جنگ کا اظہار ہو یا افغانستان پر امریکہ کے حملے کے نتائج کا ذکر، مزاحمت کاروں کی کارروایوں کا معاملہ ہو یا دیگر ہنگامی حالات، اردو ناول نگار نے بہت باریکی سے اس ان حادثات، مضمرات اور نتائج کو بیان کیا ہے۔ ڈیجیٹل دہشت گردی، سائبر حملے، الیکٹرانک میڈیا کا کردار، جدید سوشل میڈیا کا کردار وغیرہ آج کے ناول کے نہ صرف موضوعات کا حصہ ہیں بل کہ یہ ناول کے اسلوب اور فن پر بھی اثر انداز ہوے ہیں۔ یعنی آج کے ناول کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ ساری دنیا اور اس کے مسائل ایک ولج کی مانند اس کے بیانیے کا حصہ بن۔ چکے ہیں۔

3۔ منتخب ناولوں کا جائزہ لیتے ہوئے ناولوں میں موجود ان کرداروں اور علامات کا پتہ لگانا بھی تھا جن کا تعلق ٹروما، ٹرامیٹک سٹریس، وار ٹروما، نفسیاتی، جذباتی ٹروما یا سماجی ٹروما کی کسی بھی صورت حال سے مماثل ہو۔ دورانِ مطالعہ منتخب اردو ناولوں میں سے چند ناولوں میں ٹروما کے اثرات کا باقاعدہ اظہار ملتا ہے۔ ان ناولوں میں ایسے کردار بھی موجود ہیں جو نفسیاتی یا جذباتی لحاظ سے کسی نہ کسی ٹروما کا شکار ہیں۔ ایک چیز جو میں نے محسوس کی ہے کہ ٹروما کا یہ ابلاغ مصنفین کی شعوری کوشش کا نتیجا نہیں بل کہ کہانی کے زیر اثر یا نائن الیون کے سنگین اثرات کے زیر اثر ایسے کردار تراشے گئے ہیں جن پر ٹروما کی کیفیات کی پیمائش کی جاسکتی ہے۔ لہذا یہ کہنا کہ اردو میں دیگر موضوعات کے ساتھ شعوری طور پر ان کرداروں کو پیش کیا گیا ہے جو ٹروما میں مبتلا ہیں غلط ہو گا۔ ٹراما تھیوری کا اطلاق دراصل اس لیے کیا جاتا ہے کہ ادب میں ٹروما کے آثار کا نہ صرف پتہ لگایا جالگایا جائے بل کہ مصنفین کو ایک ماڈل دیا جائے تا کہ وہ معاشرے میں ایسے کرداروں کو اس موثر انداز میں پیش کریں کہ انسانی المیہ بھرپور انداز میں سامنے لایا کیا جاسکے۔ یعنی ٹراما تھیوری کا ادبی اطلاق اس لیے کیا جاتا ہے کہ ادب یا فکشن میں ٹرومیٹک کرداروں کا جائزہ لیا جائے اور ٹراما تھیوری کے ماڈل کے تحت کسی بھی ادب پارے کا جائزہ اس لیے بھی لیا جائے کہ اس ادب کا پارے کے بارے میں پتا لگایا جائے کہ اس میں کس قسم کے ٹروما کو پیش کیا گیا ہے۔

فکشن میں ٹراما کے حوالے سے مطالعہ دراصل مصنفین کو ایک گائیڈ لائن دینا بھی ہوتا ہے اور نقاد ایسے جنگی حالات وواقعات اور ان کے مضر اثرات کو اس لیے دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے کہ وہ انسانیت سوز ہوتے ہیں۔ ٹراما تھیوری کے تحت ممکنہ انسانی جذبات کا تجزیہ اور مطالعہ کر کے انسانی ہمدردی پیدا کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔

ان نکات کی روشنی میں اگر میں زیرِ تحقیق ناولوں کے بارے میں جائزہ پیش کروں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اگرچہ ان اردو ناول کے بیان میں ٹرومیٹک عناصر کا وجود موجود ہے مگر یہ اس شعوری مقصد کے تحت نہیں جس کا ابلاغ ٹراما تھیوری کرتی ہے۔ یعنی اردو ناول نگاروں نے جان بوجھ کر ٹرومیٹک کرداروں کو نہیں لکھا نہ ہی وہ یہ چاہتے تھے کہ وہ ان کرداروں کے ذریعے وہ مقصد حاصل کریں جو ٹراما تھیوری کے اطلاق سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ میری رائے کے مطابق ان ناولوں کی کہانی میں ٹرومیٹک کردار کہیں نہ کہیں موجود ہیں مگر یہ اس لیے نہیں کہ ان کا مقصد ٹروما جیسے مہلک اثرات کو بیان کرنا ہے بل کہ یہ حادثاتاً ان کا حصہ بنے ہیں۔

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ مابعد نائن الیون اردو ناول نے شعوری طور پر نئے اور معاصر موضوعات کو نہ صرف جگہ دی ہے بل کہ نئے رجحانات کے تحت کہانی، پلاٹ، کردار، قصہ پن وغیرہ پر بھی تصرف کیا ہے

ج۔ سفارشات :

اس تحقیقی جائزے کے بعد اردو ناول نگاروں کے لیے جو تجاوز دینا چاہوں گا وہ درج ذیل ہیں

1۔ اردو ناول نگاروں کو ایک خاص فلسفے اور نظریے کے تحت مربوط انداز میں عصرِ رواں کے حالات و واقعات کو ناول کا حصہ بنانا چاہیے۔

2۔ پاکستان کے ضمنی حالات کے تحت ضروری ہے کہ ایسے ناول لکھے جائیں جو مابعد نائن الیون پاکستان میں وقوع پذیر ہوئے۔ ان خاندانوں، بچوں اور علاقوں کا ذکر کیا جانا چاہیے جو جنگی حالات کے زیر اثر ابھی تک سلگ رہے ہیں۔

3۔ شعوری طور پر ایسی کہانیاں اور کردار پیش کیے جائیں جو پاکستان اور پاکستانیوں کے صحیح اور درست موقف کو پیش کر سکیں اور دنیا کو بتا سکیں کہ پاکستان کی اکثریت کس کی سوچ اور فکر کی حامل ہے۔

4۔ ان تمام حالات کو کہانی کا حصہ بنایا جانا چاہیے جو بعد از دہشت گردی پاکستانیوں کو برداشت کرنے پڑ رہے ہیں۔ بے گھر جانے والوں کے مسائل، ہجرت کرنے والوں کے دکھ، وغیرہ اردو ناولوں کے بیان بھرپور انداز میں شامل ہونے چاہیے تاکہ پاکستانی لوگوں کی آواز کو سنا جا سکے۔

5۔ اسلامی شدت پسندی کے حوالے سے بھی ناول نگاروں کو ایک صحت مند معاشرے کی تصویر کشی کرنی چاہیے میرا مشورہ ہے کہ پاکستان میں بڑھتی ہوئی مذہبی انتہا پسندی اور فرقہ واریت جیسے معاملات کو بھی ایک مکمل نظریاتی انداز میں پیش کر کے ناول نگاروں کو اصلاحِ معاشرہ میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ ان مضمرات کے نتائج کو پیش کرنے والی کہانیاں جلدی انسانی مزاج اور سوچ کو بدل سکتی ہیں۔

۔ دنیا بھر کے فکشن میں ٹراما اور اس کے اثرات کو اس لیے پیش کیا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے انسانوں کے ساتھ ہمدردی پیدا کی جائے اور ان مسائل کا ذکر کیا جائے جو ٹروما میں مبتلا فرد کو پیش آتے ہیں تاکہ عالمی سطح پر اس سوچ کو فروغ دیا جا سکے کہ ہنگامے، جنگیں یا طوفان انسانوں کے لیے کس قدر مضر اثرات رکھتے ہیں۔ پاکستان میں تو ایسے ہزاروں کردار موجود ہیں جن کی زندگیاں مکمل بربادی کا نقشہ پیش کرتی ہیں لہذا میں چاہوں گا کہ ایسے ناول وجود میں آئیں جن میں پاکستانی معاشرے کے تباہ شدہ طبقے کی ذہنیت، فکر اور زندگی

کوٹرا ما تھیوری کے ماڈل میں پیش کیا جائے اور بتایا جائے کہ پاکستان میں عام سطح کا انسان کس قدر المیاتی سانحوں سے گزر رہا ہے اور ایک بے بسی کی زندگی جی رہا ہے۔ جس طرح ترقی پسند ادب نے ایک مخصوص طبقے کے لیے شعوری طور پر ادب تخلیق کیا تھا آج بھی ضرورت ہے کہ پاکستانی قوم کی پسماندگی اور تباہ حالی کا ذکر شعوری طور پر ناولوں کی دنیا میں پیش کیا جانا چاہیے۔ہاں اس میں خیال رہے کہ ناول میں دلچسپی کے جو عناصر ہوتے ہیں وہ متاثر نہ ہوں۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

آمنہ مفتی، "آخری زمانہ" الفیصل پبلیشرز، 2011

ایم اختر، "ایک لوسٹوری ایک قیامت"، فکشن ہاوس، لاہور، 2016

سرفراز بیگ، پسِ آئینہ مثال پبلیشرز، فیصل آباد، 2013

شفق، "بادل" کرون آفسٹ پریس، پٹنہ، انڈیا، 2002

عبدالصمد، "جہاں تیرا ہے یا میرا" ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی انڈیا، 2018

محسنہ جیلانی، "میں ایک دہشت گرد" شہزاد پبلیشرز، کراچی، 2008

مستنصر حسین تارڑ، "قلعہ جنگی" سنگِ میل پبلیشرز، لاہور، 2002ء

محمد الیاس، "برف" سنگِ میل پبلیشرز، لاہور، 2010ء

محمد شیراز، ڈاکٹر، " ساسا" عکس پبلیشرز، لاہور، 2019ء

نکہت حسن، "جاگنگ پارک" شہزاد پبلیشرز، کراچی، 2010ء

نیلم بشیر احمد، "طاوس فقط رنگ" سنگِ میل پبلیشرز، لاہور، 2018

ثانوی ماخذ:

احمد صغیر، "اردو ناول کا تنقیدی جائزہ" دہلی ایجوکیشنل پبلیشر ہاوس، 2015ء

ایم۔ اے قریشی، فرائیڈ اور لاشعور، مجلس ترقی ادب، لاہور، 2007

انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کتابی دنیا، دہلی، 2004

انور پاشا، ترقی پسند اردو ناول، پیش رو پبلیشرز، دہلی، 1990

اکسفورڈ ڈکشنری اکسفورڈ، پرنٹینگ پریس، 2008

اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱

جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ اردو ادب، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1995

حمیرہ اشفاق، "جدید اردو فکشن۔ عصری تقاضے اور بدلتے رجحانات" سانجھ پبلیشرز، لاہور، 2010

خالد اشرف، ڈاکٹر، "برِ صغیر میں اردو ناول" فکشن ہاوس، لاہور، 2005ء

رحمان عباس "اکیسویں صدی میں اردو ناول" عرشیہ پبلیشرز، دہلی، 2016ء

روبینہ سلطان، "تین نئے ناول نگار" دستاویز پبلیشرز، لاہور، 2012ء

سید فضل اللہ، جنگِ عظیم اول، دارالشعور پبلیشرز، لاہور، 2008

سائرہ ارشاد، داکٹر، نائن الیون دنیا اور اردو افسانے کے تخلیقی رجحانات، فکشن ہاؤس، لاہور، 2023،

شاہد نواز، ڈاکٹر، پاکستانی اردو ناول میں عصری تاریخ، سرگودھا یونی ورسٹی، شعبہ اردو، 2018

شاعر علی شاعر، "جدید اردو ناول" عکس پبلیشرز، لاہور، 2019ء

شید امحمد، ہماری نفسیات، ای اے سینٹرز، انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی، 1939

شمیم حنفی، تاریخ، تہذیب اور تخلیقی تجربہ، ایجوکیشن پبلیشرز، دہلی، 2006ء

ظہور الدین، ڈاکٹر، کہانی کا ارتقا، انٹر نیشنل پبلیشرز، دریا گنج، دہلی، 1999ء

شہاب ظفر اعظمی، اردو ناول کے اسالیب، تخلیق کار پبلیشرز، دہلی، 2006ء

علی جاوید، ڈاکٹر، (مرتبہ) اردو کا داستانوی ادب، اردو اکادمی، دہلی، 2011ء

علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 1987ء

عظیم الشان صدیقی، اردو ناول آغاز و ارتقا، ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی، 2008ء

علامہ اقبال،ڈاکٹر،بالِ جبریل،ص310

غفور احمد،"نئی صدی،نئے ناول"،،کتاب سرائے،لاہور،2014ء

فوزیہ اسلم،ڈاکٹر،"اردو افسانے میں اسلوب اور،تکنیک کے تجربات،پورب اکیڈمی،اسلام آباد،2007ء

فاروق عثمان،ڈاکٹر،"اردو ناول میں مسلم ثقافت"بیکن بکس ملتان،2002ء

فتح محمد ملک،اپنی آگ کی تلاش،سنگِ میل پبلیکیشنز،لاہور،1999

فضل قادر، ڈاکٹر،نائن الیون اور اسلام،اشریعہ اکادمی،لاہور،پین گرافکس،اسلام آباد،2005

قاسم یعقوب،ڈاکٹر،اردو شاعری پر جنگوں کے ثرات،سٹی بک پوائنٹ،کراچی،2015

قاسم یعقوب،تاریخ،تہذیب،سماج،سٹی بک پوائنٹ،کراچی،2015

محمد احسن قاروقی،ادبی تخلیق اور ناول،مکتبہ اسلوب،کراچی،1963ء

ممتاز خان،ڈاکٹر،"اردو ناول میں کرداروں کا حیرت کدہ"فضلی پبلیشرز،کراچی،2005

ممتاز احمد خان،"اردو ناول کے بدلتے تناظر"اردو اکادمی،لاہور،2007

ممتاز، خان، ڈاکٹر،"آزادی کے بعد اردو ناول،1947 سے 2007 تک،انجمن ترقی اردو،کراچی، بار سوم،2016ء

ممتاز احمد خان،ڈاکٹر،"اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار"فکشن ہاوس پبلیشرز،لاہور،2014ء

محمد الیاس،"پروہ،سنگِ میل پبلیشرز،لاہور،2013ء

محمد الیاس،"حبس"سنگِ میل پبلیشرز،لاہور،2014ء

محمد ساجد،"ناین الیون حقیقت سے اردو افسانے تک"ادارہ نویدِ سحر،لاہور،2015ء
ممتاز احمد خان،ڈاکٹر،اردو ناول کے چند اہم زاویے،انجمن ترقی اردو کراچی،2014

محمد ساجد،"ناین الیون حقیقت سے اردو افسانے تک"ادارہ نویدِ سحر،لاہور،2015ء

مستنصر حسین تارڑ، "منطق الطیر، جدید" سنگِ میل پبلیشرز، لاہور، 2018ء،

محمد حمید شاہد، "مٹی آدم کھاتی ہے" اکادمی بازیافت، کراچی، 2008ء

محمد عاصم بٹ، "بھید، سنگِ میل پبلیشرز، لاہور، 2018ء،

مجنوں گورکھپوری، ادب اور زندگی، اردو گھر، علی گڑھ، 1984

منصور خوشتر، ڈاکٹر، اردو ناول کی پیش رفت، بک ٹال، لاہور، 2019

نعیم مظہر، فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو ناول: تفہیم و تنقید، فروغِ قومی زبان، اسلام آباد، 2012

نعیم انیس، ڈاکٹر، اکیسویں صدی میں اردو ناول، وکٹوریہ پرنٹر اینڈ اسوسی ایٹ، کولکتہ، 2016ء

نعیم احمد، ڈاکٹر، "معاصر فکری تحریکیں" مجلسِ ترقی ادب، لاہور، 2016

نجیبہ عارف، ڈاکٹر، "11/9 اور پاکستانی اردو افسانہ" پورب اکیڈمی اسلام آباد، 2001ء

وحید احمد، "مندری والا" مثال پبلیشرز، فیصل آباد، 2012ء

اخبارات:

روزنامہ نوائے وقت، فروری ۲، ۲۰۲۳

روزنامہ ایکسپریس نیوز، 8 مارچ، 2014

روزنامہ دنیا، 2، ستمبر، 2023

تحقیقی مقالے:

ارشاد بیگم، اردو ناول کے باغی کردار، نمل، اسلام آباد، 2015

انیلا سعید، "اردو انول پر مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات، نمل، 2015ء

بلال احمد، اردو ناول پر فرائیڈ کے افکار و نظریات کے اثرات، نمل، 2017

روبینہ سلطان، "تین نئے ناول نگار" دستاویز پبلیشرز، لاہور، 2012ء
صوبیہ سلیم، اردو ناول کے کلیدی نسوانی کردار، نمل، اسلام آباد، 2009
صنوبر الطاف، اردو ناول کی تنقید کے رجحانات، نمل، 2018
غفور احمد، "نئی صدی، نئے ناول"، کتاب سرائے، لاہور، 2014ء
ماجد ممتاز، اردو ناول میں مذہبی عناصر، نمل، اسلام آباد، 201
محمد افضال بٹ، اردو ناول میں سماجی شعور، نمل، اسلام آباد، 2007
محمد بشارت، تحقیقی مقالہ "اردو نظم پر دہشت گردی کے اثرات۔ نمل، اسلام آباد
مشتاق احمد، پاکستانی اردو ناول میں پس ماندہ طبقے کے مسائل، نمل، 2017
نعیم مظہر، ڈاکٹر، پاکستانی اردو ناولوں میں اسلامی فکر کی عکاسی، نمل، 2007

تحقیقی مجلے:

الماس (سالانہ)، شاہ عبد الطیف یونی ورسٹی، خیر پور، سندھ

معیار (سہ ماہی) جنوری تا جون، 2014، اسلامک یونی ورسٹی، اسلام آباد

مجلہ، خیابان، جامعہ پشاور، 2010

ماہنامہ فنون، لاہور، 1991

اردو، (شش ماہی)، انجمن ترقی اردو پاکستان

ماہنامہ قومی زبان، دسمبر 2010، مقتدرہ، اسلام آباد

سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد جولائی تا دسمبر 2019، اکادمی ادبیات، اسلام آباد

مباحثہ، پٹنہ، دسمبر ۲۰۰۲ء تا، جنوری ۲۰۰۳ء ج:۳-۲ ش:۹

Kashmir journal of language Research, volume,19, 2013

Journal of Postcolonial Writing, volum 49, 2013.

English Books:

. Van der kolk ,Psychological Trauma , Washington ,DC: American Psychiatric Press.1987

Michale Balaev ,Trends in literary theory ,University of Manitoba ,2018

Mohsin Hamid "The Reluctant Fundamentalist "Houghton Mifflin Harcourt, 2007, UK

Kamila Shamsie, Offence: The Muslim Case, University of Chicago Press, 2009

Anne Whitehead, Trauma Fiction, Edinburgh University press, 2004.

Ashlee Joyce, The Gothic in contemporary British Trauma Fiction. University of New Brunswick Redaction, Canada, 2019

Michelle Baldev, Trends in Literary Trauma Theory. University of Manitoba, 2018.

Amir Rabiya, "Post Nine Eleven Pakistan's Diasporic Fiction: Redefining South Asian Literature" Kashmir journal of language Research, volume,19, 2013.

Ahmad Gamal, "The global and the postcolonial in post-migratory literature" Journal of Postcolonial Writing, volume 49, 2013

.Volkan V,Chosen Trauma:un resolved mourning:from ethnic Pride to Ethnic Terrorism,Newyork, 1997,

Inyatullah,Dr,War Trauma History and Narrative:Analysis of selected Afghan Fiction in Enghilsh,Air University Islamabad,

.Domenik Lacapra, Writing History Writing Trauma,Baltimore,Johns Hopkins University Press 2001

Erikson,K, A new species of Trouble :Exploration in Disastar, Trauma and Community,Newyork,Harper Publisher ,2022

. Ford DG, Posttraumatic stress disorder scientific and professional dimensions, Elsvier,USA,

Britannica, T. Editors of Encyclopedia. " Persian Gulf War " Encyclopedia Britannica, January 9, 2021 .

Muhammad Samiullah , " Contemporary Western Approaches towards Redical Islamic Movements: the case of Bernard Lewis and J L Esposito,"

Gilles Kepel and jean-pierre Milelli, eds., Al-Qaeda in its Own Words" Cambridge: Harvard university press, 2008

Massimiliano Bratti,Hard to forget, The long lasting impact or war on mental health, Discussion,paper,Germany,2015

Nigan Haidry zad,"The significant Role of Trauma in literature and Psychoanalysis"Islamic Azad University Solman, Iran,2014

Nasurllah Membrol,Trauma Studies, Blogstats, 2018

Richard Gross,Psychology ,The science of mind and behaviour,Hodder Education ,UK.

J.Roger Kurtz, Trauma and Literature" Cambridge University Press Uk,200 p1

Oklahoma Department of mental Health,Categories of Trauma,Oklahoma city USA,

Judith Herman,Trauma and recovery,Basic Books Publisher New York,1992

Methew Kalithems ,Complex Trauma,Department of Phychology,University of Missouri USA 2014

Zindziuviene Lnrida Elements of Trauma Fiction in the Nine Eleven Novel,University of Timisoara,

Kleber ,PI ,Trauma and public mental Health:A Focused review,Front Phychiatry,2019

Sandra L Bloom ,A guide to Trauma informed Approaches, Humanising mental Health Care center, Australia,2018

Priti Bala Sharma, Trauma studies: an Echo of Ignored Screams, Karishna Offset Shahdara, India 2020

Charles R FIglay Amy Bryan, The study of Trauma: A Historical Over view.APA Handbook of Trauma Phyxhology USA, Volume 1, 2017

Michelle Balave, Trauma studies, John Wiley Son, s Let, 2018

Caruth, Trauma: Exploration in memory ,Johns Hopkins University Press,1995

Vander Kolk, Phychological Trauma, American Phychitrie press, Washington, 1987

International Society of Traumatic stress studies, Mass Disasters, Trauma and loss, One park view Plaza, USA 201

Websites:

https://www.dictionary.combridge.org. Trauma

https://ur.m.wikipedia.org/wiki

https://www.woar.prg/ur/what-is-sexual-violence.

http//www.enviorsagainstwar.org.Envioronment lists against war

https://www.helpguide.org/articals/PTSD

https://www.ur.m.wikipedia.org/wiki

Https://www.britannica.com/event/Persian-Gulf-War

https://www.dictionary.combridge.org. Trauma